

سرگودھا کا دبستان شاعری

(جلد اول)

شا کر کنڈان

سرگودھا کا دبستانِ شاعری

(جلد اول)

رفتگاں

شا کر کنڈان

اکادمیات

لاہور

جملہ حقوق بنام عبداللہ فہیم شاکر محفوظ ہیں

۲۰۱۲ء

طلوع اول:

سرگودھا کا دبستان شاعری

کتاب:

جلد اول (رفتگان)

شاکر کنڈان

مؤلف:

اکادمیات (رجسٹرڈ) لاہور

اہتمام:

حذیفہ خاں

سرورق:

۴۳۲

صفحات:

حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور

مطبع:

۶۰۰ روپے

قیمت:

اکادمیات

ناشر:

۳۹۱- این سمن آباد، لاہور

عقیدت، ۱۳۲- پی استقلال آباد سرگودھا

ملنے کے پتے:

ظفر بک ڈپو، اردو بازار، سرگودھا

شینڈر ڈنیوز ایجنسی، گول چوک سرگودھا

مدینہ بک ڈپو مین بازار خوشاب

پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری

کے نام

جن کی حب الوطنی، انسان دوستی، شریف النفسی، غریب پروری، اردو زبان سے محبت اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں انہماک نے نجانے کیوں مجھے اُن کے سامنے آنے سے روکے رکھا جب کہ اُن کی خاموش عنایات نے ہمیشہ مجھے اپنے حصار میں رکھا۔

شا کر کنڈان

تاروپود

صفحہ	صفحہ	صفحہ
۶۱	۱۸۔ ریاض جالندھری	۲۱۔ مولانا غلام قادر چشتی بھیروی
۶۲	۱۹۔ چودھری بشیر احمد تارڑ	۲۲۔ پیر حیدر علی شاہ
۶۵	۲۰۔ اعجاز کرنا لوی	۲۵۔ ایم بی خلیق
۶۷	۲۱۔ محمد حسین شوق	۲۶۔ حکیم عبدالرسول بکھروی
۶۹	۲۲۔ عبدالغنی ناز	۲۸۔ مولوی دلپذیر
۷۲	۲۳۔ عطا بلوچ	۳۲۔ مولوی محمد امین
۷۳	۲۴۔ فراق کنگروی	۳۵۔ مولانا محمد سعید زین پوری
۷۶	۲۵۔ سید صوفی نقوی	۳۸۔ مولوی عبدالمجید
۷۹	۲۶۔ حقیر آستانی	۴۰۔ مولوی نور الدین
۸۱	۲۷۔ راجا علی گوہر	۴۴۔ دل خوشابی
۸۳	۲۸۔ سیدوزیر شیرازی	۴۶۔ شیدا انبالوی
۸۵	۲۹۔ یونس حسین جھجھروی	۴۹۔ باوا محمد عمر رند خوشابی
۸۷	۳۰۔ حاجی سلطان احمد سالک	۵۱۔ مولانا مفتی محمد شفیع
۸۹	۳۱۔ سردار بشن سنگھ بیکل	۵۳۔ حافظ فضل کریم گوندل
۹۱	۳۲۔ ملک حبیب اللہ خان ٹوانہ	۵۵۔ مقصود وارثی
۹۲	۳۳۔ حافظ یوسف آزاد	۵۶۔ اختر واصفی
۹۷	۳۴۔ میاں فضل الرحمان بسک	۵۹۔ مولانا ظہور احمد بگوی

۱۵۵	۵۶۔ مضطر دھر پوی	۹۹	۳۵۔ جوہر نظامی
۱۵۷	۵۷۔ شاکر حسین شاکر	۱۰۲	۳۶۔ غلام جیلانی باصر
۱۵۹	۵۸۔ علامہ یوسف جبریل	۱۰۴	۳۷۔ ناسک امرتسری
۱۶۷	۵۹۔ صادق سہنی	۱۰۵	۳۸۔ بدرالدین بدر
۱۶۹	۶۰۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر	۱۰۸	۳۹۔ قاضی عزیز احمد
۱۷۳	۶۱۔ صوفی فقیر محمد	۱۰۹	۴۰۔ ملک خادم حسین
۱۷۸	۶۲۔ عبدالغنی جوہر	۱۱۱	۴۱۔ ڈاکٹر محمد شریف قیصر
۱۹۷	۶۳۔ شبلی پانی پتی	۱۱۳	۴۲۔ مرزا مامول انور
۱۸۱	۶۴۔ خلیل بدایونی	۱۱۶	۴۳۔ خواجہ فخرالدین سیالوی
۱۸۴	۶۵۔ افضل ناز گنگوہی	۱۱۹	۴۴۔ حکیم حاجی نور محمد
۱۸۶	۶۶۔ دوست محمد محبت	۱۲۱	۴۵۔ حاتم علی حاتم
۱۸۸	۶۷۔ سیف زبیری	۱۲۳	۴۶۔ میر عبدالرشید اشک
۱۹۰	۶۸۔ نذیر چودھری	۱۲۶	۴۷۔ حکیم غلام سرور نعیمی
۱۹۳	۶۹۔ اقبال منظر	۱۳۰	۴۸۔ اختر حسین رنگین
۱۹۴	۷۰۔ سید واحد حسین نشاں	۱۳۱	۴۹۔ سلیم بھٹی
۱۹۶	۷۱۔ بشیر احمد بشیر	۱۳۳	۵۰۔ الطاف مشہدی
۱۹۹	۷۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا	۱۳۸	۵۱۔ شمیم بھیروی
۲۰۹	۷۳۔ محمد انور گوندی	۱۴۱	۵۲۔ اختر سرحدی
۲۱۲	۷۴۔ عزیز انبالوی	۱۴۵	۵۳۔ شیر محمد اسیر
۲۱۴	۷۵۔ مرزا محمد منور	۱۴۸	۵۴۔ عیش بخاری
۲۱۹	۷۶۔ سید محمد حسین نیلوی	۱۴۹	۵۵۔ احمد ندیم قاسمی

۲۷۵	۹۸۔ رشک ترابی	۲۲۳	۷۷۔ صاحبزادہ رفعت سلطان
۲۸۰	۹۹۔ صاحبزادہ گلزار حسین شاہ صابر	۲۲۶	۷۸۔ سید مہدی مدنی
۲۸۲	۱۰۰۔ شکیب جلالی	۲۲۹	۷۹۔ انور حیدری
۲۸۷	۱۰۱۔ مفتی بشارت احمد نیر	۲۳۰	۸۰۔ راجن ادیب
۲۸۹	۱۰۲۔ حسن اختر خلیل	۲۳۳	۸۱۔ میاں محمد اکرم بھٹی
۲۹۱	۱۰۳۔ سعید مرزا	۲۳۵	۸۲۔ عزیز علوی
۲۹۳	۱۰۴۔ قاضی خضر جمال	۲۳۷	۸۳۔ صابر ملک
۲۹۵	۱۰۵۔ اظہر جاوید	۲۴۰	۸۴۔ عصمت علیگ
۲۹۸	۱۰۶۔ سلیم حسن مرزا	۲۴۲	۸۵۔ علی حسنین شیفتہ
۳۰۰	۱۰۷۔ شفیع ضامن	۲۴۴	۸۶۔ مجید افضل پراچہ
۳۰۳	۱۰۸۔ ثاقب ملک	۲۴۶	۸۷۔ نذیر شیرزادہ
۳۰۵	۱۰۹۔ محمد صفدر خان	۲۴۹	۸۸۔ صفدر بخاری
۳۰۷	۱۱۰۔ آفتاب مفتی	۲۵۰	۸۹۔ واصف علی واصف
۳۰۹	۱۱۱۔ شوکت راز	۲۵۶	۹۰۔ نصرت چوہدری
۳۱۱	۱۱۲۔ حضرت غلام نظام الدین	۲۵۹	۹۱۔ نواب مخمور
۳۱۵	۱۱۳۔ مظہر جعفری	۲۶۱	۹۲۔ پروفیسر ساقی الحسینی
۳۱۷	۱۱۴۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد افضل ملک	۲۶۳	۹۳۔ ڈاکٹر جی ایم اکمل
۳۱۹	۱۱۵۔ پروانہ شاہ پوری	۲۶۶	۹۴۔ ظہیر الدین ظہیر
۳۲۱	۱۱۶۔ جاوید اختر سید	۲۶۸	۹۵۔ ضامن علی حیدری
۳۲۲	۱۱۷۔ محمد نواز نسیم	۲۷۱	۹۶۔ سید تاجدار دہلوی
۳۲۵	۱۱۸۔ اختر امان	۲۷۳	۹۷۔ ارشاد عظمت

۳۵۳	۱۳۱۔ عبدالستار آثم	۳۲۸	۱۱۹۔ عاشق حسین عاشق
۳۵۵	۱۳۲۔ مقصود احمد راہی	۳۳۱	۱۲۰۔ ندیم حیدر بلوچ
۳۸۷	۱۳۳۔ صلاح الدین ساجد	۳۳۲	۱۲۱۔ حسرت جعفری
۳۵۸	۱۳۴۔ منیر ایاز	۳۳۵	۱۲۲۔ تنویر ہاشمی
۳۶۱	۱۳۵۔ عمر دراز ساجد	۳۳۷	۱۲۳۔ طفیل ثاقب
۳۶۳	۱۳۶۔ یوسف خورشید	۳۴۰	۱۲۴۔ حذیف ساجد
۳۶۶	۱۳۷۔ سید معرفت ہمدانی	۳۴۲	۱۲۵۔ غلام شبیر شاہد
۳۷۰	۱۳۸۔ عامر انصاری	۳۴۴	۱۲۶۔ محمد حسین جامی
۳۷۱	۱۳۹۔ شاہد راہی	۳۴۶	۱۲۷۔ سید ذکی الحسنین
۳۷۳	۱۴۰۔ ساغر چشتی	۳۴۸	۱۲۸۔ جمال احسانی
۳۷۷	ماخذات	۳۵۱	۱۲۹۔ بلال اُمی
۴۰۶	کتابیات	۳۵۲	۱۳۰۔ اے ایچ انیس
۴۲۱	اشاریہ (شخصیات)		

بِسْمِ اللّٰهِ

سرگودھا ایک خاص مقام کا نام تو ہے ہی لیکن سرگودھا ایک ایسے خطے کا احاطہ کیے ہے جو اس سے پہلے ضلع شاہ پور کی حدود میں واقع تھا اور اب سمٹ کر شاہ پور کی جگہ لینے والے اس شہر کی ضلعی حدود میں واقع ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس خطے کو چچ دو آب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور یہ دریائے جہلم اور دریائے چناب کے درمیان کا علاقہ تھا۔ پھر چچ دو آب کو گجرات، سرگودھا اور جھنگ میں تقسیم کر دیا گیا تو ان اضلاع میں دوسرے پڑوسی ضلعوں کے کچھ شہر بھی شامل ہوئے۔ یوں ۱۹۴۹ء میں جب شاہ پور کو ضلع کی حیثیت دی گئی تو دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر آباد کچھ علاقے اس میں شامل کر دیے گئے جس میں خوشاب، نور پور تھل اور کوہستان نمک کا کچھ علاقہ اس کا حصہ بنا۔

اردو زبان سے پہلے یہاں دوزبانیں خاص طور پر بولی، پڑھی، لکھی اور سمجھی جاتی تھیں۔ ایک فارسی اور دوسری پنجابی۔ لیکن ان کے ساتھ ہی بہت سے لوگ عربی زبان سے بھی واقف تھے۔ عربی زبان کا پڑھنا اور سیکھنا عبادت سمجھا جاتا تھا لیکن اس کی حد بزرگان دین سے باہر بہت کم تھی۔ لہذا جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو وہ بھی ان تینوں زبانوں میں کی جاتی تھی۔

اردو ادب کی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اردو زبان میں سب سے پہلے اشعار جو کہے گئے وہ حضرت بابا فرید گنج شکر (۱۱۷۳ء-۱۲۶۵ء) کے تھے۔

وقتِ سحرِ وقتِ مناجات ہے خیز درآں وقت کہ برکات ہے
 نفسِ مبادا کہ بگوید ترا نَسپِ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
 اس مناجات کے پانچ اشعار اردو زبان و ادب کے مؤرخین نے نقل کئے ہیں۔

حضرت بابا فرید گنج شکر کا ذکر یہاں اس نسبت سے بھی آ گیا ہے کہ آپ نے زندگی کے تقریباً ۳۶ سال دشت نوردی میں گزارے۔ اسی دوران آپ کا گزر سرگودھا کے علاقے سے بھی ہوا۔ سیکسر سے کچھلی جانب پہاڑی میں ایک جگہ ”بابادی کھوہ“ ہے۔ جس کے بارے یہ مشہور ہے کہ بابا فرید نے اس غار میں چلہ کاٹا تھا اور اسی نسبت سے اس کا نام ”بابادی کھوہ“ پڑ گیا۔

خطہ سرگودھا کی قدیم تاریخ اس کے ادبی حوالے سے ہمارے پاس محفوظ نہیں ہے۔ جس طرح حضرت بابا فرید کی آمد کا ذکر ملتا ہے اسی طرح حاجی محمد نوشہ گنج جو حضرت سخی سلیمان نوری کے مرید تھے اُن کے بھلوال میں قیام کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ آپ ۲۱ اگست ۱۵۵۲ء کو موضع گھوگا نوالی ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ ۲۹ سال کی عمر میں حضرت سخی سلیمان نوری (۷ جولائی ۱۵۰۸ء - ۲۸ فروری ۱۶۰۴ء) کے مرید ہوئے۔ حضرت سخی سلیمان نوری فارسی کے شاعر تھے جبکہ آپ کے مرشد حضرت مخدوم شاہ معروف چشتی قادری (م: ۱۵۷۹ء خوشاب) بھی عربی اور فارسی کے شاعر تھے۔ حضرت نوشہ گنج بیعت کے بعد بھلوال میں اپنے مرشد کے پاس کچھ عرصہ قیام پذیر رہے اور جب خرقة خلافت سے نوازے گئے تو ضلع گجرات میں اپنے علاقے میں تشریف لے گئے۔ آپ اگرچہ اردو کے شاعر تھے لیکن آپ کا تعلق نہ تو جنم کے حوالے سے اور نہ ہی وفات کے حوالے سے سرگودھا کے خطے سے ہے۔ لیکن آپ چونکہ اُن شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے اردو زبان کو ابتداء میں اپنایا۔

فارسی کے تذکروں میں ایک نام رضالا ہوری کا آتا ہے۔ بھیرہ، خوشاب، شاہ پور وغیرہ کو ایک زمانے میں ”یکے از مضافات لاہور“ کے نام سے لکھا جاتا تھا۔ اور رضالا ہوری کے بارے میں خورشید احمد خان یوسفی، کچھی نرائن شفیق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ”آج کل راجہ شاہ پوری کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ راجہ شاہ پور سے اُن کی کیا مراد ہے کیونکہ رانی ابھرت کے سلسلے میں بھی راجہ شاہ پور کا ذکر آیا ہے۔ جبکہ رانی ابھرت کا تعلق کھوکھرانہ کے حکمران راجپوتوں سے تھا۔ کھوکھرانہ سرگودھا میں واقع کڑانہ بار کے نزدیک ایک آباد گاؤں تھا۔ یہ سب قیاسی باتیں ہیں۔ اور عجیب بھی ہیں۔ عجیب اس لیے کہ رضالا ہوری کا عہد سلطان محمود غزنوی کی آمد کے بعد کا ہے۔ سلطان محمود کے زمانے میں

کھوکھرانہ کے راجہ کاراجہ شاہ پوری کہلانا درست نہیں۔ کیونکہ شاہ پور کے بارے میں روایت ہے کہ اکبر اعظم کے دور میں حضرت شاہ شمس شیرازی کی یہاں آمد پر اس شہر کا نام شاہ پور رکھا گیا۔ سلطان محمود غزنوی اور شاہ شمس شیرازی کے درمیان پانچ سو سال سے زائد کا عصری بعد ہے۔ ممکن ہے مغلیہ دور میں انہیں راجہ شاہ پوری کہا جاتا ہو اور اگر اس مفروضے کو سچ مان لیا جائے تو خورشید احمد خان نے جو اشعار نقل کیے ہیں یہ اُس عہد کے نہیں۔ کیونکہ تب اردو زبان ابھی اس اسلوب اور سلاست میں سامنے نہیں آئی تھی۔ خورشید احمد خان نے یہ دونوں اشعار حاجی علی اکبر مال کی بیاض سے لیے ہیں۔

بازارِ محبت میں اے سیم تنو! تم سے زردار کا سودا ہے بے زر کا خدا حافظ

دیکھا جو جہاں فانی بولا یہ رضا مصرع دنیا تو گزرتی ہے محشر کا خدا حافظ

اس کے بعد انیسویں صدی عیسوی میں مولانا سلطان محمود نامی کا نام ملتا ہے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اردو، فارسی، عربی اور پنجابی کے شاعر تھے۔ آپ غالب کے ہم عصر تھے۔ موضع بندیاں تحصیل خوشاب سے تعلق تھا۔ انہوں نے اپنے چہار زبان شاعر ہونے کا ثبوت اپنے ایک شعر سے یوں دیا ہے۔

کان رجل، بود مردی، ایک جنواں، اک مرد تھا قال لی، گفتا مرا، آکھیوس مینوں، مجھ کو کہا

”سرگودھا کا دبستان شاعری“ میں اس عہد کے چند ایک شعراء کا ذکر موجود ہے۔ جس میں مولانا غلام قادر چشتی، بھیروی، پیر حیدر علی شاہ گیلانی، مولوی دلپذیر، ایم بی خلیق، مولانا محمد سعید زین پوری، حکیم عبدالرسول بکھروی، مولوی محمد امین، مولوی عبدالجمید، مولوی نور الدین، دل خوشابی، رند خوشابی، مولانا مفتی محمد شفیع، حافظ فضل کریم گوندل، مقصود وارثی اور اختر واصفی کے بارے میں نامکمل تعارف یا نامکمل کلام پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت سے نام ایسے بھی میرے ذہن میں موجود ہیں جن کے بارے میں اگرچہ مجھے علم ہے کہ انہوں نے اردو زبان میں شعر کہے تھے لیکن میری کوتاہی علم اور فقدان تحقیق کہ ان کے کلام یا تعارف تک رسائی میں ناکام رہا۔ مثلاً تذکرہ نوشاہیہ میں سید شریف احمد شرافت نے سلطان بچہ کے وہ شعر نقل کیے ہیں جو انہوں نے ۱۹۳۱ء میں حضرت شاہ

سلیمان بھلوالی کے روضہ کے اندر دیوار پر کندہ دیکھے تھے۔ شرافت نوشاہی نے پندرہ اشعار جو تحریر کیے ہیں یہ کسی منجھے ہوئے شاعر کے محسوس ہوتے ہیں۔ تین شعر ملاحظہ ہوں۔

سلاطینِ زماں ہیں سر جھکاتے آپ کے در پر مرادیں مانگتے ہیں آپ سے سب اصغر و اکبر
گداگر آپ کے در کا ہے رکھتا فخر شاہانہ حقیقی شان میں ہیں اس سے کم اسکندر و قیصر
تجسس ان کو ہے کیسا بھلا گلزارِ جنت کا کہ ان کے پیر کا روضہ بھی جنت سے نہیں کم تر

اسی طرح سخن آثار میں نعیم ساگر نے ظہور عالم ظہور کا تعارف تو دے دیا کہ ۱۸۹۰ء میں رہتک میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۰ء میں پھلروان میں وفات پائی لیکن کلام کے ضائع ہو جانے کے دکھ کے اظہار کے ساتھ صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔

بجھ گیا کونکہ دل کو جو سلگتا تھا مدام اب نہ آثارِ حرارت نہ دھواں باقی ہے
محسن عباس نے اپنے مقالے ”اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ“ میں ماہنامہ ”صوفی“ پنڈی بہاؤ الدین (موجودہ منڈی بہاؤ الدین) کے شمارے اپریل ۱۹۱۵ء سے ابوالوقار نامی نظامی شاہپوری کے اکبر کی مدح میں کہے گئے دو اشعار نقل کیے ہیں۔

لسان العصر ہیں وجدانِ ملت ہیں اکبر آجکل صورِ ہدایت
یہی خضرِ طریق و خضرِ ظلمت یہی آبِ بقا ہے ترشِ شربت

صاحبزادہ حافظ محمد عبداللہ ولد خواجہ محمد دین سیالوی عربی، فارسی، اردو اور پنجابی زبانوں کے شاعر تھے۔ ان کا پنجابی کلام تو کسی حد تک محفوظ ہے لیکن اردو کلام کی تلاش میں کا نامی رہی۔ آپ ۱۸۸۸ء میں سیال شریف میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۱ فروری ۱۹۶۳ء کو وہیں وفات پائی تھی۔

ڈاکٹر منظور احمد منظور ۱۸۹۳ء میں بھیرہ میں مولوی دلپذیر کے ہاں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں بھیرہ میں ہی فوت ہوئے۔ ان کا اردو کلام بھی میری پہنچ سے باہر رہا۔

۰ دوانا محمد زبیر نسیم (۱۸۹۸ء-۱۹۷۲ء) کا فارسی کلام تو رسائل اور کتب میں بکھرا ہوا ملا

لیکن اردو کلام کے حصول میں ناکامی رہی۔

حکیم سرون ناتھ آفتاب کے بارے راجا رشید محمود نے غیر مسلموں کی نعت گوئی میں اُن کی نعت نگاری کے حوالے سے جانکاری تو دی ہے جو انہیں محمد الدین فوق کی ”تاریخ اقوام پونچھ“ سے ملی لیکن مختصر تعارف پر اکتفا کیا۔ نمونہ کلام وہ بھی حاصل نہ کر سکے۔

مختلف قبرستانوں میں جب کتبے دیکھے تو کچھ کندہ نام ایسے بھی ملے جن کے اسماء سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعر تو تھے لیکن اُن کا کلام دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔ جس کے ساتھ ہی وہ اپنا تعارف بھی گنوا بیٹھے۔ جیسے ملازم حسین اصغر، سید ال احمد مانی علیگ، سعید صابری، محمد الدین سفر، نبی احمد ضیا، عبدالغفور حاتم وغیرہ۔

ایک قبر پر جو کتبہ دیکھا وہ کسی خلیق نامی شاعر کا لکھا ہوا ہے۔ یہ قبر چودھری دین محمد خان کی ہے جو داروغہ کمیٹی تھے۔ ان کی وفات ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۹۳۱ء کو ہوئی۔ اسی دور میں سرگودھا کے تین شاعر ایسے ملتے ہیں جن کے تخلص خلیق تھے۔

ایک مولانا محمد یار خلیق تھے جو لاہور میں مقیم تھے اور وہیں ۱۹۳۷ء میں وفات پائی۔ آپ کا تعلق ضلع سرگودھا کے گاؤں جوڑا کلاں سے تھا۔ آپ کے کلام تک بھی میری رسائی نہیں ہو پائی۔ دوسرے ایم بی خلیق تھے جن کا مختصر سا نمونہ کلام آئندہ کے صفحات میں شامل ہے۔ یہ اشعار ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئے تھے۔ آیا آپ ۱۹۳۱ء میں زندہ تھے یا نہیں۔ اور تیسرے خلیق لا ابالی جن کا صرف نام کی حد تک بشن سنگھ بیکل کے تعارف میں ذکر آیا ہے۔ انہیں استاد شاعر کہا گیا ہے لیکن اللہ بہتر جانتا ہے۔ وہ ۱۹۳۱ء میں حیات تھے یا نہیں۔ لہذا چودھری دین محمد خان کی قبر کے کتبے پر کندہ شعر کس خلیق کے ہیں اس کے بارے بھی میں مکمل طور پر لاعلم ہوں۔ البتہ شعر پختہ دکھائی دیتے ہیں اور کسی کہنہ مشق شاعر کے معلوم ہوتے ہیں۔

آہ یہ بے تاب دل میرا بہت رنجور ہے
چین پہلو میں نہیں دل کونہ کچھ حاصل سکوں
کیا بتاؤں قلب کے اندر کوئی ناسور ہے
غم کی وہ چھائی گھٹا تاریک دنیا ہو گئی
فوجِ غم نے اس کو گویا کر لیا محصور ہے
روزِ روشن میری آنکھوں سے شبِ دیجور ہے

چودھری دین محمد خان خاں یادش بخیر اس کے اوصاف حمیدہ کا بیان ممکن نہیں تھا شریف الطبع وہ جس کی نہیں ملتی نظیر اٹھ گیا وہ نیک خو جو انتخاب دہر تھا

اس کی الفت حلقہ احباب میں مشہور ہے
کیا لکھے تعریف خامہ، اس سے یہ معذور ہے
اس کے اخلاق حمیدہ کا ہر اک مشکور ہے
جس کے۔۔ وخلق کی ہر لب پہ اب مذکور ہے

اے خلیق زار تو بھی صبر سے اب کام لے

کر خدا کا شکر اس کا نام صبح و شام لے

کتبہ چونکہ بہت پرانا ہے۔ اس لیے کچھ الفاظ کے پڑھنے میں دقت محسوس ہوئی۔

اسی زمانے کے کئی اور شعراء کے نام اور کام میرے علم میں نہ آسکے۔ اگر مطالعہ میں آئے بھی تو فارسی یا پنجابی شاعر کی حیثیت سے آئے۔ اس تسلسل میں بیسویں صدی میں داخل ہوئے تو ذہن پر اترنے والے نام کچھ یہ بھی تھے۔ دلار اسنگھ، اشیر داس بسمل، ڈاکٹر محمد صادق، رب بخش کلیار، اصغر جالندھری، محمد افضل بکھروی، اصغر مشہدی، محمد افضل شاہ بخاری، رفیق بھیروی، خنجر بریلوی، مراد علی جوش، ممتاز بیگم، جانی پیاز، بہت سے نام جو اگر تحریر کیے جائیں تو طوالت کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔ ایک نام فاضل شاہ پوری بھی سامنے آ رہا ہے جس کے دو قطعے اکبر الہ آبادی کے حضور خراج عقیدت کے طور پر اختر انصاری کی کتاب ”لسان العرب“ میں موجود ہیں۔ ایک قطعہ دیکھیے۔

حقیقت میں لسان العصر اکبر تھے فاضل شاعری میں کامل و فرد

تم اس کے شعر چشم دل سے دیکھو ظرافت میں نہاں ہے قوم کا درد۔

اختر شاہ پوری (مرحوم) کی ۱۱۸ اشعار کی ایک نظم جو سو ماہی دستک بھاڑا میں شائع ہوئی اس

وقت میرے سامنے ہے۔ اس نظم کا عنوان ”مسلمان سے دو دو باتیں“ ہے۔ دو بند یعنی پہلا اور آخری حاضر

ہے۔

اڑ گیا اے وائے گلہائے چمن کا رنگ و بو

کس قدر ارزاں ہوا اے مسلمان تیرا لہو

گلشنِ اسلام پر چھائی سمومِ تندخو

بھر گئے ہیں اس سے بزمِ ہند میں جام و سبو

اب بھی تو سرشار لیکن بادۂ احمر میں ہے
 کیا بُرا جکڑا ہوا تقدیر کے چکر میں ہے
 اہل حق کی آبرو قائم ترے ہی دم سے ہے
 یہ وجودِ غنچہ و گل گریہ شبنم سے ہے
 رونقِ دشتِ زماں تجھ ایسے ہی ضیغم سے ہے
 بزمِ ہستی کا تسلسل اب ترے دمِ خم سے ہے
 توڑ زنجیر تغافلِ خونِ دل گرمائے جا
 گردوں رفعت کو ہساروں کے جگر برمائے جا

شاہ پور نام کے برصغیر میں اگرچہ کئی شہر ہیں لیکن ضلعی صدر مقام ہونے کے باعث موجودہ
 ضلع سرگودھا کے شہر شاہ پور کو خاص اہمیت رہی ہے۔ اور شعراء جو اسے نام کے ساتھ بطور لاحقہ
 استعمال کرتے ہیں وہ عام طور پر اسی شاہ پور کے حوالے سے ہوتا ہے۔ راز زیدی شاہ پوری کی ایک
 غزل جام نو کراچی کے جون ۱۹۶۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ راز زیدی کا تعلق ممکن ہے مذکورہ
 شاہ پور سے ہو۔ غزل کے اشعار ہیں۔

کوئی بھی منظر ہستی ہو بدل جاتا ہے
 بے وفا وقت دے پاؤں نکل جاتا ہے
 شب ہے تاریک تو کیا خوف کہ شہر دل میں
 آرزوؤں کا دیا شام سے جل جاتا ہے
 دل کی بے چیدیاں کہتی ہیں ضرور آئے گا
 وہ اجالا جو اندھیرے کو نکل جاتا ہے
 دل کے خوں ہونے سے تم اتنا تعجب نہ کرو
 آنچ دینے سے تو لوہا بھی پگھل جاتا ہے

نذر کر دیتے ہیں اربابِ وفا کو ہم راز

جذبہٴ دل اگر الفاظ میں ڈھل جاتا ہے

ماہنامہ ”ماہِ طیبہ“ کوٹلی لوہاراں کے ستمبر ۱۹۶۳ء کے شمارے میں سرگودھا کے ایک شاعر معراج
 الدین خان معراج کی نعت شائع ہوئی تھی۔ معراج صاحب کا ذکر کسی اور رسالے میں پڑھنے میں نہیں
 آیا۔ میری کوتاہی علم یا اُن کا خود چھپے رہنا شاید اس کی وجہ ہو۔ اُن کا ذکر اربابِ ادب سے بھی سننے میں
 نہیں آیا۔ کچھ پرانے لوگوں سے استفسار پر بھی لاعلمی آڑے آئی۔ نعت کے اشعار مطالعہ فرمائیے۔

ہے دھوم عرش تک ترے جاہ و جلال کی
مل جائے تیرے در کی گدائی زہے نصیب
جاں دے دی حق پہ، نام ہے زندہ حسین کا
پانی تو خاک ہو، نہ رہی آبرو تری
ہے ہر جگہ ثنا ترے حسن و جمال کی
اور آرزو نہ ہو مجھے دنیا کے مال کی
کیا شان ہے جہان میں حضرت کی آل کی
کربل میں خاک قدر کی زہرا کے لال کی

ملت ملی رسولؐ کی، جنت میں گھر ملا

تقدیر کیس اچھی ہے حضرت بلاؑ کی

”سرگودھا کا دبستان شاعری“ جلد اول میں صرف مرحوم شعراء کا ذکر ہے۔ ایسے شعراء جو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ سرگودھا میں وفات پائی یا پھر ان کی تدفین سرگودھا میں ہوئی۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ بہت سے ایسے شعراء جن کا تعلق ان تینوں میں سے کسی حوالے سے بھی سرگودھا سے نہیں لیکن انہوں نے زندگی کا طویل عرصہ یہاں گزارا اور سرگودھا کو Own بھی کیا۔ وہ اس تذکرے میں شامل نہیں کیے گئے۔ انشاء اللہ ان شخصیات کا ذکر تیسری جلد میں آئے گا۔ دوسری جلد میں وہ شعراء ہوں گے جو حیات ہیں اور ان کی جنم بھومی سرگودھا ہے۔ خواہ وہ کہیں بھی مقیم ہیں۔

موجودہ تذکرے میں مندرجہ بالا پالیسی کے برعکس شاید کچھ نام آپ کو ایسے بھی ملیں جو نہ تو سرگودھا میں پیدا ہوئے، نہ اس مٹی کا حصہ بنے اور نہ ہی یہاں وفات پائی۔ ایسی شخصیات میں اظہر جاوید کا نام آتا ہے۔ ان کا آبائی تعلق سرگودھا سے تھا۔ لیکن جنم بھومی سرگودھا نہیں تھی۔ اس خطے کو Own کرتے ہوئے انہوں نے اپنے پاسپورٹ پر مقام پیدائش کے خانہ میں سرگودھا کا نام درج کروایا تھا۔ اسی باعث ان کا تذکرہ شامل کتاب کیا گیا۔

محمد حسین نیلوی کی وفات راولپنڈی میں ہوئی، پیدائش بھی سرگودھا کی نہیں۔ دفن بھی سرگودھا کی دھرتی میں نہیں ہوئے۔ لیکن انہیں کتاب میں اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ مستقل طور پر سرگودھا میں رہائش پذیر تھے۔ ایک کیس کے سلسلے میں انہیں بڑا ہوئی اور راولپنڈی جیل میں منتقل ہوئے۔ جہاں وفات پائی اور سنت کے مطابق کہ مسلمان جہاں وفات

پائے اُسے وہیں دفن کیا جائے، انہیں راولپنڈی میں ہی دفن کیا گیا۔

”سرگودھا کا دبستانِ شاعری“ اصل میں میرا ایم اے کا مقالہ ہے جو ۲۰۰۸ء میں جمع کروایا گیا اور ڈگری کا حق دار ٹھہرا۔ تعلیم کے اس مرحلے پر مجھے لوگوں کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کئی قانونی پھیس سامنے لانے کی کوشش ہوئی۔ جس بنا پر یہ مقالہ میں نے چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور مقررہ وقت میں جمع کروایا۔

مجھے ذاتی طور پر علم کی اہمیت کا احساس ہے اور میں اسے تعلیم سمجھ کر نہیں، علم جان کر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں یہی وجہ ہے کہ تعلیم میں مجھے کئی بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء ہی پڑھنے کے لفظ سے کی جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضورؐ نے بھی مہد سے لحد تک علم حاصل کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ سو! میں نے جب ریٹائرمنٹ کے بعد اس سلسلے کو پھر سے جاری کرنے کا سوچا تو مجھے عجیب قسم کی باتیں سننی پڑیں۔ مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا تو رکاوٹیں سامنے رکھی گئیں۔ بھلا ہو پروفیسر کثیر ساجد کا کہ انہوں نے ذمہ داری قبول کی۔ اور نہایت ممنون ہوں ڈپٹی کنٹرولر یونیورسٹی آف سرگودھا محمد اقبال قریشی صاحب کا جو مجھے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہے اور حوصلہ بھی دیتے رہے۔

بورڈ آف سٹڈیز کی میٹنگ کے دوران مقالے کا جب عنوان تجویز ہوا تو مجھے ایک مہربان ممبر نے اسی وقت فون پر اطلاع دی کہ مقالہ ”دبستانِ سرگودھا“ منظور ہوا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سرگودھا کو اگرچہ ڈاکٹر سلیم اختر، محمد شفیع صابر اور معین الدین عقیل جیسی کئی ادبی شخصیات نے دبستان تسلیم کیا ہے لیکن شاعروں میں اسے اگر دبستان کے حوالے سے لوں گا تو یہ محدود ہو جائے گا اور اس پر اعتراض بھی ہوں گے۔ پھر دبستان میں مرکز کسے بناؤں جس کے گرد اُس کے فکر و خیال کی وسعت کا اندازہ لگا کر اس کی پیروی کرنے والوں کو تلاش کروں۔ بہر حال میرے کہنے پر مقالے کا نام تھوڑی سی رد و بدل کے بعد ”سرگودھا کا دبستانِ شاعری“ تجویز ہوا۔

وقت کی کمی کے باعث یہ مقالہ تقریباً سات سو صفحات تک محدود رہا۔ اس سیشن میں چونکہ

تھیسز لکھنے والا میں واحد طالب علم تھا اور وہ بھی نجی حوالے سے۔ میرے خارجی ممتحن پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تھے۔ جب مقالہ جمع ہو گیا تو پتا چلا وہ ملک سے باہر ہیں۔ لہذا میں نے ان کی عدم موجودگی کو غنیمت سمجھا اور ضمیمہ لکھنا شروع کر دیا۔ یوں اس دوران تین سو کے لگ بھگ مزید صفحات تحریر کر لیے۔ ابتدا میں شعراء کی تعداد ۳۲۹ تھی جو ۹۸ شعراء کے اضافے سے ۴۲۷ ہو گئی۔ لیکن اس کام کے لیے ابھی وقت کی ضرورت تھی جو میرے پاس نہیں تھا۔ لہذا جو شعراء مقالہ کا حصہ نہ بن سکے۔ ان کے ناموں کی آخر میں ایک فہرست شامل کر دی۔ اس فہرست میں ۲۵۲ شعراء کے نام درج تھے۔ یہ نام ان ۹ شعراء سے الگ ہیں جن کی شعری تصانیف تو شائع ہو چکی ہیں لیکن فنی حوالے سے انہیں انتخاب کا حصہ نہیں بنایا جاسکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کو آگے بڑھانے کی ابھی بہت گنجائش ہے۔ کیونکہ تحقیق رک نہیں سکتی اس میں کمی بیشی کا امکان ہر لمحہ موجود رہتا ہے۔ یہ مقالہ تین ابواب پر مشتمل تھا۔

باب اول: سرگودھا کی وجہ تسمیہ اور جغرافیائی تبدیلیاں

باب دوم: سرگودھا میں اردو زبان کی ابتداء، دبستان اور دبستان شاعری، سرگودھا میں اردو شاعری کا پس منظر۔

باب سوم: ۱۹۰۳ء سے ۱۹۳۷ء، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے یکم جولائی ۱۹۸۲ء، ۲ جولائی ۱۹۸۲ء سے تاحال (۲۰۰۷ء تک)

سرگودھا کا دبستان شاعری، موجودہ جلدوں کی ترتیب میں پہلے دونوں ابواب شامل نہیں البتہ 'سرگودھا میں اردو شاعری کا پس منظر' نہایت مختصر کر کے بسم اللہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ 'دبستان اور دبستان شاعری' اس وقت کی تعلیم ضرورت تھی جسے فضول بحث سمجھتے ہوئے میں نے بالکل خارج کر دیا ہے۔ بقیہ عنوانات ایک الگ کتابی صورت میں انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آئیں گے۔

ایک اور وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ آخر میں ماخذات کو میں نے تعلیمی انداز سے

نہیں، فطری انداز سے تحریر کیا ہے۔ کیوں کہ جو طریقہ رائج ہے وہ انگریزی زبان کا تو ہو سکتا ہے اردو زبان کا نہیں اور شاید اسی باعث میرا ذہن اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ الگ بات کہ مقالہ جو جمع کروایا گیا تھا اس میں وہی کتابی ترتیب ملحوظ رکھی گئی تھی۔ سواب میں نے اس جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے سیدھے سبھاؤ ماخذات دے دیے ہیں۔ ماخذات میں حوالہ دیتے ہوئے کئی مقامات پر صفحے نمبر غائب ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔

۱۔ اس مقالے کو تحریر کرنے سے پہلے بہت سی کتب اور رسائل میرے مطالعے میں رہے جن میں سے اپنی پسند کے تحت اقتباسات میں نے اپنے پاس تحریر کیے ہوئے تھے لیکن کم علمی کے باعث پورے حوالے نقل نہیں کیے تھے۔ یوں اب مقالے میں جب ضرورت محسوس ہوئی تو خود کو عاجز پایا۔

۲۔ مقالہ جمع کرانے کی جلدی میں کمپوزر نے خاص طور پر ماخذات میں بہت غلطیاں کیں۔ صاف ظاہر ہے میں اس کے سر پر سوار تھا۔ جلدی میں ہند سے اور سطر میں ادھر ادھر ہو جانا کوئی بعید نہیں۔ ایسے ہی یہاں بھی کسی کی پگڑی کسی کے سروال معاملہ ہوا۔

آخر میں یہ تسلیم کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ اس مقالے کی تیاری میں محمود اسیر کی کتاب ”سخنوران سرگودھا“ اخلاق عاطف کا نعتیہ انتخاب ”جانِ رحمت“ مزید اس کے پاس موجود شعراء کے مختصر تعارف، پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی کتب ”اب انہیں ڈھونڈ چراغِ زرخِ زیبالے کر“، ”گلِ دیدہ ور“، ”جنھیں ہم بھول بیٹھے ہیں“۔ پہلے سے موجود نہ ہوتیں اور ڈاکٹر محمد منیر احمد سلج کی دو ضخیم کتابیں ”وفیات نامورانِ پاکستان“ اور ”وفیات اہل قلم پاکستان“ میرے پاس نہ ہوتیں تو شاید یہ مقالہ اتنا جلدی اور اس طریقے سے تیار نہ ہو پاتا۔ لہذا ان احباب کا شکر یہ مجھ پر واجب ہے۔

پروفیسر کثیر ساجد کی عنایت کو میں کسی صورت نہیں بھول سکتا۔ محمد اقبال قریشی صاحب کا بارڈر گذر مجھ پر لازم آتا ہے۔ محمد نعیم اختر اور محمد بلال جنہوں نے میری جلدی کو اپنی جلدی اور میرے کام کو اپنا کام سمجھ کر کمپوزنگ میں ایک بہت بڑی سردردی اپنے سر لی۔ اتنے ضخیم کام کی کمپوزنگ میں چند ایک غلطیوں کا ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ دونوں میرے شکر یہ کے مستحق ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر

رفیع الدین ہاشمی میرے لیے قابلِ احترام ہستی ہیں۔ انہوں نے زبانی امتحان کے دوران جس انداز سے مجھے آئندہ کے لیے مشورے دیے اس کے لیے میرے پاس شکریہ کے وہی روایتی الفاظ ہی ہیں۔ مجھے آج اپنی تہی دامنہ کا شدید احساس ہو رہا ہے۔ اُس موقع پر میرے لیے اُن کا صرف یہ کہہ دینا کہ ”میں تو اس طالب علم سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔“ بہت بڑا اعزاز ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

کتاب کی اشاعت کے بارے میں اس لیے کچھ نہیں کہوں گا اور ڈاکٹر ناصر رانا کا شکریہ ادا نہیں کروں گا کہ وہ میرے دوست بھی ہیں اور مہربان بھی۔ ہمارے درمیان دعاؤں کے تبادلے تقریباً گزشتہ تیس سال سے ہو رہے ہیں۔ نیز اتنی قربت میں شکریہ ادا نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اُن کی محبتیں ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہیں اور وہ ہمیشہ میری مدد کھلے دل سے کرتے رہے ہیں۔ آج بھی اتنے ضخیم مقالے کی اشاعت کے لیے میں سہا ہوا تھا تو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اسے آسان بنا دیا۔ اور یوں ایک بار پھر میری بہت سی دعاؤں کے حق دار ٹھہرے۔

بہت سی دعاؤں کا طالب

شا کر کنڈان

(سرگودھا)

مولانا غلام قادر چشتی بھیروی

مولانا غلام قادر چشتی بھیروی کا اصل نام عبدالقادر ہے۔ آپ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء لے بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد غلام حیدر ایک دیندار اور صاحب علم شخصیت تھے۔ مولانا غلام قادر نے علامہ غلام محی الدین، حافظ احمد الدین بگوی اور مفتی صدر الدین آزرہ سے کسب فیض کیا۔ آپ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد لاہور چلے آئے اور اونچی مسجد اندرون بھائی گیٹ میں فرائض، خطابت و وعظ انجام دینے لگے۔ بعد میں بیگم شاہی مسجد کی تولیت ان کے سپرد ہوئی۔ ۱۸۷۹ء میں اوری اینٹل کالج لاہور میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ لیکن دو سال بعد اس سے علیحدہ ہو گئے اور مدرسہ نعمانیہ لاہور میں درس دینے لگے۔ پروفیسر محمد اسلم کہتے ہیں کہ مزار کے دروازے پر جو کتبہ آویزاں ہے اس پر یہ عبارت مرقوم ہے:

”افتخار العلماء، شمس الفضلاء، عمدة المحققین، زبدة العارفين،

سراج السالکین، سید الرائحین، حامی سنن ماہی البدعة والفتن حضرت مولانا مولوی عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ المعروف بہ مولانا غلام قادر قریشی ہاشمی قادری، نظامی، سیالوی، بھیروی ثم لاہوری قدس سرہ العزیز وصال مبارک

۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۸ء“ ۲

اس میں دو مقام پر مجھے خامی دکھائی دے رہی ہے۔ پہلی تو یہ کہ ”ماہی البدعة“ نہیں ”ماہی البدعة“ لفظ ہوگا اور دوسرا یہ کہ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں آتا ہے اور ۱۰ اپریل اس دن تاریخ بنتی ہے۔ آپ کو بیگم شاہی مسجد کے جوار میں دفنایا گیا۔ آپ کی تصانیف جناب اختر راہی نے جو شمار کی ہیں درج ذیل ہیں:

۱۔ ماہی البدعة
۲۔ ماہی البدعة
۳۔ ماہی البدعة
۴۔ ماہی البدعة
۵۔ ماہی البدعة
۶۔ ماہی البدعة
۷۔ ماہی البدعة
۸۔ ماہی البدعة
۹۔ ماہی البدعة
۱۰۔ ماہی البدعة

۱۱۔ ماہی البدعة
۱۲۔ ماہی البدعة
۱۳۔ ماہی البدعة
۱۴۔ ماہی البدعة
۱۵۔ ماہی البدعة
۱۶۔ ماہی البدعة
۱۷۔ ماہی البدعة
۱۸۔ ماہی البدعة
۱۹۔ ماہی البدعة
۲۰۔ ماہی البدعة

۲۱۔ ماہی البدعة
۲۲۔ ماہی البدعة
۲۳۔ ماہی البدعة
۲۴۔ ماہی البدعة
۲۵۔ ماہی البدعة
۲۶۔ ماہی البدعة
۲۷۔ ماہی البدعة
۲۸۔ ماہی البدعة
۲۹۔ ماہی البدعة
۳۰۔ ماہی البدعة

” (۱) اسلام کی گیارہ کتابیں (۲) نماز حضوری (۳) نماز ضروری (۴) ختماتِ خواجگان (۵) حقیقت انوارِ محمدیہ (۶) شمس الحنفیہ بجواب نور الحنفیہ (۷) جوہر ایمانی (۸) نور ربانی فی مدح محبوب سبحانی (۹) عکازہ در صلوٰۃ الجنازہ (۱۰) فاتحہ خوانی (۱۱) شوارقِ صدیہ ترجمہ بوارقِ محمدیہ فی رجم الشیاطین النجدیہ (۱۲) شمس الضحیٰ فی مدح خیر الوریٰ“ ۳

ان کے علاوہ راقم کے پاس آپ کی ایک کتاب ”عقد الفرائد در بیان احسن القوائد“ ہے جو اس فہرست میں شامل نہیں۔ مولانا کا زیادہ تر کام نثر میں ہے جس میں عربی، فارسی اور اردو زبان کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔ لیکن آپ شعر بھی کہا کرتے تھے۔ افسوس کہ اشعار ڈھونڈنے میں مجھے ناکامی ہوئی۔ بہر حال دو شعر بطور نمونہ شامل کئے جاتے ہیں۔

سب آل پاک اُن کی ہے محبوبِ کبریا ہر اک غلام آپ کا شاہِ جہاں ہوا
مقبول بارگاہِ خداوند ہو گیا جب بندہ مدحِ پاک سے شیریں زباں ہوا ۳

پیر حیدر علی شاہ

حضرت سید حافظ پیر حیدر علی شاہ صاحب گیلانی چشتی قادری سلیمانی (رحمۃ اللہ علیہ) ابن سید امام علی شاہ ۶ ۱۲۷ ھ ۵ مطابق ۱۸۵۹ء ۶ محلہ گجیال جہی شریف ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جد مبارک کا اسم گرامی سید احمد علی شاہ تھا اور نسب شریف سید حسنی گیلانی۔ آپ کا سلسلہ نسب تیس واسطوں سے حضرت پیران پیر غوثِ اعظم سید عبدالقادر جیلانی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔

سید حیدر علی شاہ نے ابتداءً قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں قرآن پاک حفظ کر کے دینی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہوئے کچھ عرصہ جہی میں تعلیم حاصل کی بعدہ مدرسہ سلیمانیہ تونسہ شریف میں تعلیم کی تکمیل فرمائی۔ آپ وہیں خواجہ شاہ اللہ بخش تونسوی سے شرف بیعت ہوئے۔ اور مزید علم دین حاصل کرنے کی تلقین پر رخصت ہوئے۔ اور پھر حصول علم

ظاہری کے دوران ہی مرشد کا اشارہ پا کر شہر جہی کی استکانت ترک کر کے باہر جنگل میں رہنے کا ارادہ مصمم کر لیا۔ اور شہر کو چھوڑ کر مغربی جانب جنگل میں پہاڑی ندی کے کنارے قیام فرمایا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ کے والد ماجد سید پیر امام علی شاہ اپنے نور چشم کی جدائی برداشت نہ کرتے ہوئے اپنا مکان چھوڑ کر فرزند ارجمند کے پاس آ کر رہنے لگے۔ وہیں آپ نے مکان وغیرہ تعمیر کروائے اور مسجد کی تعمیر کروائی جس کا قطعہ تاریخ ہے۔

مسجد بے مثال درجی کرد تعمیر پیر حیدر شاہ
بہر تاریخ اس بنائے خلیل شد ندا ”خانہء جلالِ خدا“ کے

-۱۳۲۵ھ-

حضرت پیر حیدر علی شاہ عبادت الہی میں بے مثل تھے اور اس میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ آپ اپنے مرشد برحق کی دعا سے اپنے مجاہدات شاقہ کے طفیل فکر و سلوک میں مقامات علیا کے مالک تھے اور طہارت و پاکیزگی میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ آپ کی زندگی مبارک سرچشمہء اسلام و ایمان تھی جو بھی عقیدت مند آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اس کو محبت الہی میں رنگ دیا۔ آپ ذکر رب العالمین میں ہر لمحہ محو رہتے حتیٰ کہ اختلاج القلب کا دورہ شروع ہو گیا۔ حکیم اجمل کو جب چیک کرایا تو انہوں نے بتایا کہ یہ تکلیف آپ کو ذکر قلبی کی وجہ سے ہے۔ لہذا یہ کسی دنیاوی دوا سے ٹھیک نہیں ہوگی۔ اور یہی ہوا علاج وغیرہ کرایا جس سے کوئی افاقہ نہ ہوا کافی عرصہ تک یہ سلسلہ رہا حتیٰ کہ آخری وقت آ گیا اور یوں بیس صفر المظفر ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۳۷ء بروز یک شنبہ آپ نے رحلت فرمائی۔ آپ کے لخت جگر سید حافظ حسن علی شاہ گیانی نے آپ کی تاریخ وفات کہی۔

حمد ذات حق بگویم دائمانی کل حال پس درود سید محبوب رب ذی الجلال
بر تمامی آل و اصحاب رسول بے مثال رحمت حق بر روان اصفیاء اہل کمال
شاہ حیدر قطب اقطاب جہاں نور نبیؐ سید و سرور ولی مطلوب رب لایزال
از فیوض ظاہری و باطنی آن شاہ دیں عالمے سرشار گشت ہر زمان و اہل حال

شد وصالش روز یک شنبہ و عشریں از صفر سیزده مآت از ہجرت شش و پنجاہ سال

چوں بکستم مادہ تاریخ او کردہ ندا

مخزن انوار عرفان ہاتف از سن وصال

☆ ۱۳۵۲ھ ☆

آپ کا سالانہ عرس مبارک ہر سال بڑے تزک و احتشام سے آستانہ عالیہ پر منایا جاتا ہے یہ عرس شریف دو دن ۱۹ اور ۲۰ صفر المظفر کو منعقد ہوتا ہے۔

حضرت پیر حیدر علی شاہ صاحب "نثر اور نظم ہر دو اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اردو فارسی عربی اور پنجابی زبانیں اظہار کے لئے استعمال فرماتے۔ "نورِ خوارقِ حیدری" آپ کی زندگی کرامات اور حالات پر لکھی گئی کتاب ہے۔ جب کہ "مقناطیس الوحدت" آپ کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں ۸۰ صفحات ہیں۔ یہ حصہ عربی زبان میں ہے لیکن ساتھ اردو میں ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ اس حصے کے آخر میں شجرہ اردو اور فارسی ہر دو زبانوں میں منظوم دیا گیا ہے۔ "شجرہ خاندانِ چشتیہ" کے علاوہ باقی کتاب میں بھی فارسی اور اردو میں کہے گئے آپ کے اشعار کافی تعداد میں شامل ہیں۔ اردو زبان کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

پیر کامل کو سمجھ جب جاؤ گے	پیر کامل آپ خود بن جاؤ گے
جب تجلی آئینہ دکھلائے گی	تب سمجھ تم کو خدا کی آئے گی
اس تجلی میں جلاؤ آپ کو	اس تجلی میں مٹاؤ آپ کو
اس مٹانے سے خدا کو پاؤ گے	بے تشبہ مصطفیٰ کو پاؤ گے
تو ہے مرفوع الاجازت کا فقیر	فقر تیرا ہے صراطِ دلپذیر
جب الی اللہ سے فراغت ہو فنا	سیر فی اللہ کیوں نہ ہو پھر رونما
نسبتِ عرفان یہ کرتا ہوں بیاں	مست کرنا خلق کو دے دے کے جام
یہ رسالہ مختصر بسیار ہے	اس بیاں سے اس لئے انکار ہے

آپ کو یکسر بھلا دے اے فقیر
 گر تجھے منظور ہے وصلِ خدا
 جس نے اپنے آپ کو فانی کیا
 ہو نہ ہو ورد و وظائف کا اسیر
 زود تر ہو وہم ہستی سے جدا
 رومی و تبریز کا ثانی کیا ۹
 علاوہ ازیں ”نورِ خوارقِ حیدری“ میں آپ کا اردو پنجابی اور فارسی کلام بھی شامل ہے۔

اردو کی ایک غزل یہاں پیش کی جاتی ہے۔

وصف کوئی کیا کرے تحریر میرے پیر کی
 دل کے آئینہ میں ہے تصویر میرے پیر کی
 سالہا شب کو نہ سوئے اور عبادت میں رہے
 نور عرفاں کا ہو روشن دل میں تیرے بے گماں
 اک نظر سے کر دے تجھ کو مس سے زرِ خالص ابھی
 سلسلہ میں آپ کے مردانِ حق ہیں پائے بند
 جن و انساں زیرِ فرماں اُن کے تھے سب سر بسر
 آپ کے دل میں جو گزرا حق نے فوراً کر دیا
 ہے فزوں تقریر سے تو قیر میرے پیر کی
 ہے سند گویا بغل میں بخششِ تقصیر کی
 تھی عبادت اس قدر شب گیر میرے پیر کی
 دیکھ لو گر شکل پُر تنویر میرے پیر کی
 بے شبہ ہے نظر صاف اکسیر میرے پیر کی
 ہے کشاں سوئے خدا زنجیر میرے پیر کی
 تھی حکومت ایسی عالمگیر میرے پیر کی
 ہو گئی تقدیرِ حق تدبیر میرے پیر کی

حیدرآ تو نسہ کو گر مکہ کہوں کیا خوف ہے

ہر طرف ہے بانگ اور تکبیر میرے پیر کی ۱۰

ایم بی خلیق

قیام پاکستان سے پہلے سرگودھا کے شعراء میں خلیق تخلص کے حوالے سے تین نام ملتے ہیں۔ مولانا محمد یار خان خلیق جن کا تعلق موضع جوڑہ کلاں ضلع سرگودھا سے تھا۔ آپ اردو فارسی اور عربی میں شعر کہا کرتے تھے۔ ایک سو بارہ سال کی عمر پا کر ۱۹۳۷ء میں لاہور میں وفات پائی۔ میں جوڑہ آپ کے کلام کی تلاش میں گیا لیکن ناکامی ہوئی۔ دوسرے خلیق لاابالی تھے۔ استاد شاعر تھے۔

اغلب یہی ہے کہ قیام پاکستان کے نزدیک گمنامی کی زندگی میں وفات پا گئے اور تیسرے ایم بی خلیق۔
ایم بی خلیق کے بارے میں ماضی کے اوراق خاموش ہیں۔ پروفیسر محمد اقبال جاوید ایک
نعت کے حوالے سے صرف اتنی معلومات دیتے ہیں۔

”اخبار اتحاد“ امرت سر۔ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نمبر ۲۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۱۸ء

مدیر: مولانا بخش کشتہ۔۔۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔ تضمین۔ ایم۔ بی خلیق۔ سرگودھا

ہے سب حسینوں سے تجھے حاصل جہاں میں برتری دی ہے خدانے اس تجھے دونوں جہاں کی سروری
کیا منہ ہے میرا جو لکھوں تعریف تیری سرسری اے چہرہ زیبائے تو رشک بتان آذری
ہر چند و صفت می کنم در حسن زان بالا تری

دارین کا سلطان ہے تو اے شاہ دیں شاہ ام خورشید عالم تاب ہے مہر عرب، ماہ عجم
ہاں! اب علی الاعلان یہ کہتا ہوں میں کھا کر قسم آفاق ہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری“ ۱۱

حکیم عبدالرسول بکھروی

بکھر تحصیل شاہ پور ضلع سرگودھا کا ایک گاؤں ہے جسے بکھر بار بھی کہا جاتا ہے۔ اس گاؤں
کے جس شخص نے علم و ادب اور حکمت میں نام کی یا اور گاؤں کو باہر کی دنیا میں متعارف کروایا وہ حکیم
عبدالرسول بکھروی کے نام سے اپنی پہچان رکھتا تھا۔ آپ ایک عالم دین، مبلغ، حافظ قرآن، صوفی،
واعظ، شاعر، ادیب اور ایک معروف حکیم تھے۔ آپ کو اردو، فارسی، عربی اور پنجابی زبانوں پر عبور تھا
اور ان سب زبانوں میں آپ شعر کہا کرتے تھے اور اسی طرح نثر میں بھی آپ کا قلم رواں تھا۔

مولانا حکیم عبدالرسول کا کام تو مختلف کتب و رسائل میں بکھر پڑا ہے لیکن تعارف کے
حصول میں راقم واقعی ناکام رہا ہے۔ ہاں! البتہ اندازوں سے بات چلائی جاسکتی ہے۔ صاحبزادہ

عبدالرسول للہی نے حضرت حافظ غلام للہی (۱۸۱۳ء-۱۸۸۸ء) کے ضمن میں لکھا ہے:
 ”مرشد کی وفات کے بعد آپ نے اپنے طور پر بیعت کرنا
 شروع کیا۔ یعنی شاہد حکیم عبدالرسول صاحب (صاحب انوار مرتضوی) کے

الفاظ ہیں.....“ ۱۲

حضرت حافظ غلام نبی للہی کے مرشد حضرت خواجہ غلام محی الدین قصوری دائم الحضورؒ
 تھے۔ جن کی وفات ۱۸۵۵ء میں ہوئی۔ ۱۳

اس تحریر سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم عبدالرسولؒ نے ۱۰۰ سال سے زیادہ عمر پائی ہوگی۔
 کیونکہ آپ کی وفات جنوری ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ ۱۴

حکیم عبدالرسولؒ کی جن کتابوں کے نام مجھے مل سکے وہ ہیں ”تازیانہ نقشبندیہ“، ”انوار
 مرتضوی“ اور طب کے موضوع پر آپ کی کتاب ”خلاصۃ المطب“ آپ کی زیادہ تر تحریریں فارسی
 زبان میں ہیں اردو میں بہت کم ہیں۔ لیکن آپ کے بکھرے ہوئے کلام اور نگارشات کو اگر یک جا کیا
 جائے تو کئی مجموعے ترتیب دیے جاسکتے ہیں۔ آپ کو تاریخ گوئی پر ملکہ تھا اور تقریباً ہر موقعہ کی مناسبت
 سے قطعہ تاریخ کہہ دیتے تھے۔ اسی طرح موضوعاتی نظم پر بھی آپ کو گرفت تھی۔ ایک ایسی ہی نظم جو
 مولانا نصیر الدین بگومی کی روڈ ایکسیڈنٹ کے باعث وفات پر آپ نے ۱۹۳۴ء میں لکھی یہاں بطور
 نمونہ پیش کی جا رہی ہے۔

ماہتابِ شرع ملت

اے نصیر الدین گرامی وہ ترا علم و کمال	وہ تری ذاتِ منور وہ ترا حسن و جمال
ماہتابِ شرع ملت تھا ترا اطہر وجود	یہ وجود آفاق میں تھا چشمہ فیضان وجود
مال و جاں اپنا کیا قربان دین اسلام پر	زندگی اپنی گزاری سب کی سب اس کام پر
خاندان اپنے کو سارے جگ میں روشن کر دیا	گرچہ نوری خاندان تھا نور سے پھر بھر دیا

علم و حلم و معرفت نازاں تھے تیری ذات سے
 حیف دنیا سے تیاری جلد کردی ناگہاں
 عالم بالا کے جلدی ہو گئے شائق جناب
 سیر ہو کر گل کو بلبل نے نہ دیکھا تھا ابھی
 مردے شاید ہو گئے شائق زیارت کے کمال
 عالم فانی ہے گرچہ اہل حق کو ناپسند
 یا الہی ہو بزرگوں کی حیاتی نوح کی
 اب دعا کرتا ہوں حضرت قبلہ کے غفران کی
 روح علیین میں ہو یا عزت و فرح سرود
 غم کی کوئی حد نہیں پسماندگاں بے تاب ہیں
 صبر ترجیح اس مصیبت پر سمجھوں کا کام ہے
 آفریں آتی تھی انس و ملک اور جناب سے
 فیض یابوں کو کیا حیران و غم گیس ناتواں
 ہو گئے احباب حیراں دیکھ کر رحلت مآب
 شائق دیدار انور کا تو پیاسا تھا بھی
 حق نے دکھلانا تھا اُن کو آپ کا جلوہ جمال
 تیرہ ہے وہ گر نہ ہو اُن کا وجود ارجمند
 فیض خلقت کو ملے سب ان کے جسم و روح کی
 اُن کے مرقدیر ہو بارش رحمتِ رحمن کی
 جسم پر فردوس سے انواع رحمت کا ورود
 ایک چونکہ نعمتیں ایماں سے سب سیراب ہیں
 یہ مصیبت گرچہ سخت از صدمہ ایام ہے
 یا الہی کر عطا صبر و جمیل احباب کو
 کر غریق بحر رحمت خادمِ اقطاب کو ۱۵

مولوی دلپذیر

محمد امین نام اور کرم الہی آپ کے والد کا نام تھا۔ آپ ۱۸۶۵ء میں موضع بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا بخش کشتہ دلپذیر کا سن ولادت ۱۹۷۵ء لکھتے ہیں۔ جس کا حوالہ پروفیسر ریاض احمد شاد نے سخنوران سرگودھا میں دیا ہے اور شاید اسی سے عبدالغفور قریشی نے استفادہ کیا ہے۔ لیکن عبدالغفور قریشی نے ۱۸۷۵ء مطابق ۱۲۹۳ھ لکھا ہے تو یہاں پھر وہ غلطی کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ یکم محرم ۱۲۹۳ھ ۲۸ جنوری ۱۸۷۶ء کو پڑتا ہے یوں یہ سال برابر چل رہا ہے۔ ۱۸۷۵ء اس لحاظ سے بھی غلط ہے کیونکہ دلپذیر کے استاد مولوی محمد حسین اُس سے عمر میں چھوٹے تھے اور اُن کی ولادت ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ ابو

شاہین فاروقی نے جو سن لکھا ہے یہ اس لئے بھی قابل اعتبار ہے کہ ابو شاہین فاروقی اسی محلہ کے رہائشی تھے جس محلے میں دلپذیر کا گھر ہوا کرتا تھا اگرچہ یہ کوئی اتنا مدلل حوالہ نہیں لیکن ایک نسبت سے کہا تو جا سکتا ہے۔ بہر حال۔۔۔ محمد امین جو شاعری میں دلپذیر کے نام سے مشہور ہوئے نے عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے بزرگوں سے حاصل کی۔ جوان ہوئے اور شاعری کا شوق پیدا ہوا، تو محمد حسین احمد آبادی کی شاگردی اختیار کی۔ لیکن یہ پہلو بھی تحقیق طلب ہے اور اس کے رد میں کئی دلائل دیئے جا سکتے ہیں۔ البتہ مولوی محمد حسین کی مرزائیت کا اثر دلپذیر پر بھی ہوا اور وہ بھی اسلام سے خارج ہو کر مرزائی ہو گیا۔ ملک جاوید گھنجر اُس کے مرزائی ہونے کو اس کی آخری عمر سے جوڑتے ہیں۔

مولوی دلپذیر اک عالم اور اک ایسا شاعر تھا۔ جس کے خطوط اور گفتگو بھی شعر میں ہوتی تھی۔ پنجابی، اردو، عربی اور فارسی زبانوں میں طبع آزمائی بھی کرتے اور تبلیغ بھی۔ لیکن آپ کا زیادہ تر کام پنجابی شاعری میں ہے۔ عربی اور فارسی میں بھی بہت کچھ لکھا مگر اردو زبان میں اُن کی تصانیف محدود ہیں۔ اُن کی تمام تصانیف میں اسلامی رنگ ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے خطبات اب بھی کئی مساجد میں جمعہ اور عیدین کے موقع پر مولویانِ کرام پڑھتے ہیں۔ آپ کی کتابوں کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ اس تعداد کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے۔ کہ محمد حسین احمد آبادی کے جوانی تک پہنچنے سے پہلے آپ کے کچھ رسائل شائع ہوں گے۔ کیونکہ کئی کتابیں بہت ضخیم ہیں۔ ان تصانیف میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں۔

وعظ دلپذیر۔ مجموعہ خطب۔ باغ بہشت۔ سی حرفیاں۔ گلدستہ نعت۔ اخبار دلپذیر۔ چراغ دلپذیر۔ معجزات محمدی۔ معراج نامہ۔ گلدستہ دعوات۔ انشائے دلپذیر۔ احوال الآخرت۔ گلزار محمدی۔ پنج گنج۔ انواع دلپذیر۔ مجموعہ وظائف۔ زینت الاسلام۔ باغ و بہار۔ گلزار آدم۔ گلزار موسیٰ۔ گلزار مکہ۔ گلزار مدینہ۔ گلزار چہار یار۔ قصص الحسنین (قصہ یوسف زلیخا)۔ معراج نامہ۔ خوانِ یغما۔ ترجمہ دیوان حافظ۔ تفسیر قرآن مجید۔ اکرام محمدی۔ گلدستہ معجزات۔ دعوات دلپذیر۔ دعوت دلپذیر۔ مکتوبات۔ مجموعہ وظائف۔ مجموعہ اشعار۔ کاخن النساء۔ مناجات۔ تحریک خلافت۔ وغیرہ۔

مولوی دلپذیر کی تصانیف کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا۔ وہ اگر مرزائیت اختیار نہ کرتا تو اسلام کا ایک بہت بڑا عالم، فاضل اور مبلغ ہوتا۔ اس نے زندگی کے آخری لمحے مرزائی مرکز سے وظیفہ پر گزارے اور بالآخر ۱۹۴۵ء کو وفات پائی۔ انہیں بھیرہ کے ”مقبرے والے قبرستان“ میں دفن کا گیا۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر منظور احمد نے جو کہ خود بھی ایک عمدہ شاعر تھا کتبہ لکھا۔

جو تاجور مملکتِ شعر و سخن تھا اس وقت یہاں اس کا تہ خاک محل ہے
تھا جس کا قلم سحرِ زبان جادو بیاں تھی آج اس کی زباں بند ہے اور ہاتھ بھی شل ہے
مداحِ محمدؐ کا ہو منصب جسے حاصل منظور خنک بخت وہ مغفور ازل ہے
سن وفات پر تمام محققین متفق ہیں۔ اگرچہ تاریخ کا حوالہ کہیں بھی نہیں ملتا۔ لیکن سن بہر حال ۱۹۴۵ء متفقہ ہے۔

یہاں مولوی دلپذیر کی وہ نظم جو انہوں نے مولانا محمد نصیر الدین بگوی کی وفات پر لکھی تھی اور جس میں تاریخ بھی نکالی تھی شامل کی جا رہی ہے۔ مولانا محمد نصیر الدین بگوی کی وفات ایک بس کے حادثہ کے باعث ہوئی تھی۔ اس سے اُن کی اردو شعر گوئی کے بارے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

صدمہء ناگہانی

الہی کیا ہے یہ سر نہانی کہ دنیا کوچ پر ہے ناگہانی
ترزل پڑ گیا ہے اک جہاں میں ہوئی خاموش ہے جب زندگانی
پا ہے ہر طرف شورِ قیامت ہے مرجھایا ہوا باغِ جہانی
دلوں میں حسرت و سوزِ عالم ہے قواء پر چھا رہی ہے ناتوانی
زبانوں پر اگر آہ و بکا ہے تو آنکھیں کر رہی ہیں خوں فشانی
یہ کیا اندھیر ہے کیا ماجرا ہے سنا جاتا ہے لوگوں کی زبانی
کہ مولانا نصیر الدین بگوی بہ علم و فضل، عالم خاندانی

معلم ماہر بحرِ زمانی
 چلے جاتے تھے محبوبِ زمانی
 کہ آ پہنچے اجل کے کاروانی
 ادھر یہ آ گیا امرِ حقانی
 وہیں ختم ہو گئی ساری کہانی
 نہ اپنی کر سکے کچھ نگہبانی
 تڑپتی رہ گئی دنیائے فانی
 کہ لے پہنچی بہ ملکِ جادوانی
 نہیں مٹی قضائے آسمانی
 بدل دی سب بہارِ بوستانی
 نہ گلشن ہے نہ رونقِ گلستانی
 یہ بھی اک ہے خدا کی مہربانی
 کہ پیارے باپ کی ہے یہ نشانی
 بہار آجائے اس میں بارِ ثانی
 ہمہ قدرت ہمہ قدرت تو دانی
 کہاں تک یہ کریں گے نوحہ خوانی
 نہ دیکھیں حشر تک کچھ بھی گرانی
 یہ ہو تیری طرف سے مہمانی
 ملائک کر رہے ہوں میزبانی
 وادِ خلہم بجنات الامانی
 طفیلِ جلوہ ماہِ یمانی

شریف الطبع نیک اخلاق و خوشرو
 عیال و اہل لاری کے سفر میں
 نہ پہنچے تھے ابھی منزل پہ جا کر
 ادھر صدمہ تھا اپنی والدہ کا
 پڑی لاری یکا یک اک شجر پر
 نہ بچے بچ سکے اُن کے نہ بی بی
 اکٹھے چل بے چاروں کے چاروں
 لگایا دور دورہ وہ قضا نے
 مقدر میں لکھا یہ حادثہ تھا
 خزاں کے ایک ہی جھونکے نے آ کر
 نظر آتا نہیں کچھ بلبلوں کو
 چمن سے رہ گیا اک پھول باقی
 الٰہی عمرِ او صد سال بادا
 دکھا اک بار پھر یہ باغِ شگفاں
 تو ہے قادرِ تجھے ہے ساری قدرت
 عطا کر صبر سب پسماندگاں کو
 ردائے مغفرت ہو رفتگاں پر
 رہیں فردوس میں وہ سب اکٹھے
 رسولِ پاک کا ہو اُن پہ سایہ
 قربتِ اغفر لہم و الوالدیہم
 تقبل یا الٰہی ایں دعا را

پذیر بھیروی نے سال رحلت
کہا دو سخت صدمہ ناگہانی

۲۲ _____ ۱۳۵۲ھ _____ ۲۲

مولوی محمد امین

اعوان قوم کی ایک شاخ کنڈان کے چشم و چراغ مولوی محمد امین ۱۸۷۲ء، ۲۳ میں خوشاب شہر کے محلہ کنڈان والا میں حسن خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ جہاں آپ کے آباؤ اجداد آ کر مقیم ہوئے تھے۔ ملک حسن خان کے دوسرے بھائی ملک غوث محمد تھے جن کے پڑپوتے واصف علی واصف نے ادب اور تصوف میں بہت بڑا مقام پایا۔ واصف علی واصف کی والدہ سلمیٰ بی بی مولوی محمد امین کی صاحبزادی تھیں۔

ثروت طارق حبیب اپنے ایک مضمون ”واصف علی واصف کا سوانحی خاکہ“ میں مولوی محمد امین کے بارے میں تحریر کرتی ہیں:-

”حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی میں ایم اے بھی کیا ہوا تھا۔ خطیب اور معلم کی حیثیت کے حامل تھے۔ پہلے جھنگ پھر لاہور میں تعلیم و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔ نیلا گنبد مسجد (لاہور) میں بے لوث و عظ جمعہ بھی دیتے رہے۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ چھوٹا شملہ میں آمد پر منظوم سپانامہ بھی ان کی خدمت میں پیش کیا تھا“۔ ۲۳

مولوی محمد امین تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ تعلیم میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے اور مختلف سکولوں میں خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر میں آپ کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ میں ہوا جہاں آپ ایک عرصہ گزارنے کے بعد ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ بعد ازاں آپ خضر حیات ٹوانہ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ پروفیسر محمد ظہیر بدر قائد اعظم سے شملہ کی ملاقات کے

بارے لکھتے ہیں۔ ”جب ۲۸ اگست ۱۹۳۸ء کو قائد اعظم شملہ تشریف لائے تو مولوی صاحب نے منظوم سپانامہ قائد اعظم کے حضور پیش کیا۔“ ۲۵ راقم (شا کر کنڈان) نے اس سپانامہ کی کاپی آپ کے دوہتے پروفیسر شوکت محمود کنڈان کے پاس راولپنڈی میں ۲۰۰۰ء میں دیکھی تھی جس میں خام اندازے کے مطابق ۲۷ کے لگ بھگ اشعار ہوں گے۔ آپ کے بارے یہ علم نہیں ہو سکا کہ کب شعر کہنا شروع کیا اور آپ کا ذخیرہ کتنا تھا۔ لیکن آپ کی ایک شعری تصنیف ”آئینہ حق نما“ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ فنی اور فکری حوالے سے بہت مضبوط اور مثبت شعر کہتے تھے۔ اردو، فارسی اور عربی زبان کا اس کتاب سے پتہ چلتا ہے اور انگریزی چونکہ آپ نے ساری زندگی پڑھی اور پڑھائی اس لئے انگریزی دانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

”آئینہ حق نما“ اسماء الحسنیٰ کی منظوم شرح ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اسمائے مقدسہ کی تفسیر اشعار میں شاید اس سے پہلے اس خوبصورت پیرائے میں نہ لکھی گئی ہو۔ یہ کتاب جب آپ نے لکھی اس وقت آپ جامع مسجد مکھیا نہ کے خطیب تھے۔ اور ایم بی سکول جھنگ سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ چونکہ یہ کتاب رانا عبدالحمید ایم اے پرنسپل گورنمنٹ کالج شاہ پور کی فرمائش پر لکھی گئی تھی اس لئے اس کے زمانہ تحریر کا اندازہ باسانی لگایا جاسکتا ہے کیونکہ رانا عبدالحمید کیم مئی ۱۹۲۹ء سے ۲۸ نومبر ۱۹۳۷ء تک پرنسپل رہے۔ ۲۶ اور مولوی محمد امین صاحب کی ریٹائرمنٹ کا سن ۱۹۳۲ء بنتا ہے اس لئے یہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء کے درمیان لکھی گئی بلکہ ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء پر غالب قیاس کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس دوران آپ خطیب جامع مسجد مکھیا نہ رہے ہوں گے۔

مولوی محمد امین دینی، علمی، ادبی اور ملی خدمات کو بخوبی اور باحسن ادا کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ چونکہ آپ کا پورا کنبہ جھنگ میں آباد ہو چکا تھا اور آپ بھی لاہور سے واپس آ کر خاندان کے ساتھ رہنے لگے تھے سو آخری سانس یہیں لئے اور جھنگ میں ہی آپ کو دفن کیا گیا۔ ”آئینہ حق نما“ کے پس ورق پر درج ذیل تحریر موجود ہے۔

”اسماء الحسنیٰ کی اردو منظوم شرح۔ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ علم اسماء الحسنیٰ اور

معرفتِ الہی متحد المفہوم ہیں۔ اسماءِ الہی کا جاننا ہی خدا کا جاننا ہے چونکہ مقصدِ حیاتِ انسانی معرفتِ الہی ہے۔ جب آدمی نے خدا کو اس کی ذات اور صفات میں یگانہ سمجھ لیا تو اس نے خدا کو جان لیا۔ اس کتاب میں طریقِ خدا شناسی، ضرورتِ علمِ اوصافِ الہی، غرضِ نبوت، ضرورتِ دعا، محبتِ الہی، بعثِ بعد موت وغیرہ مسائل نہایت وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں لیکن مسئلہ تقدیر جس کے متعلق عام طور پر غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اور جس کو تعلیم یافتہ نوجوان بے اصل سمجھتے ہیں اور جس پر مخالف مذاق اڑاتے ہیں مدلل طور پر ثابت کیا گیا ہے کہ تقدیر سرِ ارحمت اور ضامنِ ترقی ہے۔“۔۔۔

اس تحریر سے اگرچہ مکمل وضاحت تو نہیں ہوتی لیکن۔۔۔ بہر حال مولوی صاحب کی سوچ سے کچھ کچھ آگاہی ہوتی ہے اس کتاب میں سے ہی اللہ، الحق، کی منظوم شرح ملاحظہ فرمائیے۔

اللہ۔ الحق

شرف ہر علم کا ہوتا ہے اتنا	شرف معلوم کا ہوتا ہے جتنا
نہیں اشرف کوئی شے کبریا سے	نہ کوئی علم توحیدِ خدا سے
خدا کی ذات ہے اعلیٰ و برتر	خدا کا علم سب علموں سے بہتر
شرف کو نین میں پاتا ہے عارف	جو اسرارِ الہی سے ہو واقف
نہیں ہے ذاتِ باری تک رسائی	بجز علمِ صفاتِ کبریائی
خدا کا فعل ہے مخلوق ساری	جہاں ہے مظہرِ افعالِ باری

یہ افعالِ الہی ہیں مظاہر	کہ جن سے ہیں صفاتِ اللہ ظاہر
صحیفہ جو کہ قدرت کا پڑھے گا	وہ اسماءِ الہی جان لے گا
مطابق کام کے ہیں نامِ رب کے	موافق نام کے ہیں کامِ رب کے

حقیقت معرفت توحید باری
 یا اے طالبِ مولا بدانی
 خدا کے نام سارے ہیں صفاتی
 کتاب اللہ میں جو نام آئے
 تو اسم اللہ ہے ان سب پہ حاوی
 یہ ہے اسمِ مبارک ذاتِ باری
 معائب سے منزہ ذات جس کی
 ازل سے تا ابد ہے آپ قائم
 سراپا نور ہے حسنِ ازل ہے
 وہی اول ہے آخر بھی وہی ہے
 وہی خلاق ہے خالق ہے سب کا
 قدیر و مقدر، ماجد وہی ہے
 حمید لائقِ حمد و ثنا ہے
 یہ اسمِ اعظمِ باری تعالیٰ
 نہیں بجز معرفت ہوتا تعلق
 سمجھ کر نامِ حق پڑھنے سے دائم

صفات اللہ میں ہے بات ساری
 مسمیٰ را چو اسما را بدانی
 فقط اللہ ہے اک اسمِ ذاتی
 نبیوں نے ہیں یا جو کہ بتائے
 معانی سب کے ہیں اس میں کماہی
 صفاتِ کاملہ جس میں ہیں ساری
 نقائص سے مبرا ذات جس کی
 وہ جیسا تھا رہے ویسا ہی دائم
 سراسر لایزال و لم یزل ہے
 وہی باطن ہے ظاہر بھی وہی ہے
 وہی رزاق ہے رازق ہے سب کا
 ولی، والی، صمد، واحد وہی ہے
 مجید مستحقِ کبریا ہے
 ذریعہ ہے حصولِ معرفت کا
 سو جتنی معرفت اتنا تعلق
 خدا سے رابطہ ہوتا ہے قائم

خاصیت

کرے اس نام کا گر تو وظیفہ
 خدا کر دے گا تیرا صاف سینہ ۲۸

مولانا محمد سعید زین پوری

زین پور، بھیرہ ضلع سرگودھا کے نواح میں ایک گاؤں ہے۔ محمد سعید اسی گاؤں میں مولوی

حکیم غلام محی الدین کے گھر پیدا ہوئے۔ تعلیمی سلسلہ کی ابتدا اپنے والد کے پاس گھر سے ہوئی۔ جہاں ان سے ابتدائی فارسی اور طب سیکھی۔ پھر مولانا عبدالعزیز بگوی سے صرف و نحو، منطق، فلسفہ، تفسیر، حدیث اور فقہ میں استفادہ کیا۔ ۱۸۹۴ء میں جب مولانا محمد ذاکر بگوی کی تقرری لاہور کے مدرسہ حمیدیہ میں بے جہدہ مدرس اعلیٰ ہوئی۔ آپ کو ان کے جانے کا نہایت رنج ہوا۔ جس کا اظہار درج ذیل اشعار میں کیا۔

چڑھا کر ریل الفت پر اتارا راہ میں ہم کو اٹھا مسکن سے پہنچایا نہ مقصد گاہ میں ہم کو
 نظیرِ خلد تھی وہ بزم، ہم تھے خاکِ راہ جس کے صبا! لے چل اسی سلطان کی درگاہ میں ہم کو
 شہابِ علم چمکا جب جہالت کے اندھیرے میں کہ دو جلدی رسائی، منزلِ دل خواہ میں ہم کو
 نہ چائیں ہونٹ کیسے، ہم کو لذت یاد آتی ہے جو تھی درس اور درس میں سے بسم اللہ میں ہم کو
 ہمارا آج ہے وہ حال جو بلبل کا بے گلشن خزانِ ہجر نے گھیرا دمِ ناگاہ میں ہم کو
 سعیداً، گر بہارِ اولیں بارِ دگر آئے

تو کیا ہے اور خواہشِ درگہ اللہ میں ہم کو ۱۹۰۹ء

مولانا محمد سعید زین پوری نے جب یہ اشعار کہے تو میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر بیس بائیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اور دوسرا یہ واضح ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی آپ شاعری کا شغف فرما رہے ہوں گے۔ لہذا جب مولانا محمد ذاکر کو اس فراق کا علم ہوا تو انہوں نے آپ کو لاہور بلوا کر اورری اینٹل کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ جہاں سے آپ پنجاب یونیورسٹی کی مولوی فاضل کی سند کے حصول کے ساتھ فارغ التحصیل ہوئے اور ۱۹۰۱ء میں عربی مدرس کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ تعطیلات کے دوران آپ مولانا محمد ذاکر کی خدمت میں حاضری دیتے اور پھر ان کے ہمراہ آستانہ عالیہ سیال شریف میں بھی حاضر ہوتے۔ آپ کی شاعری کا رنگ اب بدل چکا تھا اور اس میں حمد و نعت کی کثرت پائی جانے لگی تھی عربی، فارسی اور اردو ہر سہ زبان میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں آپ کا اسلوب کچھ ایسے تھا۔

الہی جتنی رحمت تیری کل ابرار پر ہووے وہ ساری میرے آقا احمد مختار پر ہووے
 حجابِ دوئی جب اٹھایا تو دیکھا احد جان و دل میں سمایا تو دیکھا
 اچھے ہیں یا بُرے ہیں اسی کے سعید ہیں جیسے بھی ہیں غلام تو خیرالوری کے ہیں
 ساتی و بادہ بھی تھے، محفلِ پاتھی، میں نہ تھا وائے قسمت ایسی بزمِ خوشِ فضا تھی، میں نہ تھا
 کس ادا سے جلوہ گر تو اے ستمگر ہو گیا ایک عالم بھر میں برپا شورِ محشر ہو گیا
 آج پھر ہم کوچہء دلدار میں جانے کو ہیں نشترِ الفت کے چر کے دل پہ پھر کھانے کو ہیں
 کس مہ جبیں کا دل میں مرے، خانہ بن گیا ویرانہ بھی نشیمنِ شاہانہ بن گیا
 لبِ شیریں کا مزا شیر و شکر نے نہ دیا چشمِ مے گوں کا نشہ آتشِ تر نے نہ دیا
 تدریس اور شعر و سخن کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران انہیں فریضہء حج کی ادائیگی کی
 سعادت بھی نصیب ہوئی۔ آپ کے سنِ ذلالت اور وفات کے بارے اور مزید حالات کے بارے
 معلومات نہیں مل سکیں۔ آپ نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی لکھا۔ اور ہر دو کو کسی حد تک آپ نے
 ”جذباتِ سعید“ میں اکٹھا کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد کی تحاریر گوشہ گننامی میں ہیں۔ آپ کو تاریخ
 گوئی کا بھی ملکہ حاصل تھا۔ اور آپ کی کئی نظمیں اس سلسلے میں ”تذکارِ بگویی“ میں شامل ہیں۔ ایک نظم
 جو ”تاریخِ وفاتِ مولانا غلام محمد بگویی“ کے بارے میں ہے ملاحظہ فرمائیے۔

یہ کیا غضب ہے یہ کیا ستم ہے کہ مارے مارے پھرے خدائی
 جدھر بھی دیکھیں ادھر ہی غم ہے ہر اک طرف بے کسی ہے چھائی
 ہوا ہے کیا بادشاہی مسجد ہری بھری ہو گئی ہے سنسان
 یہ کس کا ماتم ہے کس کا غم ہے کہ ہائے ہو سب نے ہے مچائی
 کہاں ہیں وہ خلقہائے ذکرِ خدا و یکِ شنبہ کی وہ راتیں
 وہ رقت انگیز ذکرِ اللہ کیوں نہیں دے رہا سنائی
 وہ حضرتِ بگویی کہاں ہیں ہماری آنکھوں سے کیوں نہاں ہیں

وہ چاند سا چہرہ ریش روشن کہیں بھی دیتا نہیں دکھائی
 لگی ہوئی مستشار میں انجمن ہے پر میر مجلس اس کے
 کہاں ہیں تاریک پل میں ہو جائے مشکلوں کی گرہ کشائی
 ہوں روحِ اعلیٰ پہ ان کی شام و صبح، سبوح کی فتوحات
 رہیں سدا شاد آپ کے خویش، بیٹے، پوتے، بھتیجے بھائی
 شبِ جدائی کی ظلمتوں میں سعید سال اُن کا ڈھونڈتا تھا
 ”بجھا ہے پنجاب کا چراغ آہ، اب“ ندا غیب سے یہ آئی

— ۱۳۱۸ھ —

مولانا محمد سعید زین پوری کبھی کبھی مولانا محمد سعید میانوی بھی لکھا کرتے تھے۔ پاکستان
 کے معروف سائنس دان تسخیر احمد آپ کے بیٹے تھے جن کی پیدائش ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔ کیمبرج سے
 تعلیم حاصل کی اور زندگی باہرگزاری۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سیال شریف میں ان کی بارگاہ کی جانب
 سے انتظامی امور سونپے گئے۔ ماہنامہ شمس الاسلام کے ساتھ آپ ابتدا سے ہی منسلک رہے اور نثر و نظم
 میں اپنا تحریری فرض ادا کرتے رہے۔ آپ کی آخری تحریر غالباً ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ جس کے بعد
 مکمل خاموشی ہے۔

مولوی عبدالمجید

بھیرہ میں ایک ہی عہد میں ادبی حوالے عبدالمجید نامی دو شخصیات ہوئی ہیں۔ ایک مولوی
 عبدالمجید بھیروی اور دوسرے حکیم عبدالمجید سیفی۔ ان دونوں کے نام بھیرہ سے شائع ہونے والے
 رسالے ”شمس الاسلام“ میں تو اتر سے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور عبدالمجید نامی قلم کار کا نام بھی
 اسی رسالے میں کبھی کبھی دکھائی دے جاتا تھا لیکن مؤخر الذکر کا تعلق کراچی سے تھا۔
 مولوی عبدالمجید بھیروی کے بارے جیسے ادبی صفحات خاموش ہیں ایسے ہی بھیرہ کے لوگ

بھی بہت کم حالات سے واقف ہیں۔

ماہنامہ شمس الاسلام کی ابتدائی اشاعتوں میں مارچ ۱۹۳۰ء کے شمارے میں مولوی عبدالمجید کی پہلی نظم 'قطعہ تاریخ شمس الاسلام' شامل تھی۔ اسی طرح اسی سال کے اپریل کے شمارے میں آپ کی تحریر "ترکِ علوم اور مخالفِ باہمی" مئی کے شمارے میں "ساقی کے مے خانے میں، نومبر کے شمارے میں "قل اللہ تم ذرہم" ستمبر اکتوبر کے شمارے میں "تکبر نہ کرنا تکبر بُرا ہے" نظم شائع ہوئی اور پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔ اس سارے پس منظر میں اگرچہ آپ کے سن ولادت اور سن وفات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ جبکہ اس میں ایک اور مشکل شمس الاسلام میں ہی شائع ایک اور خبر سے پیدا ہو گئی جو ۱۹۹۱ء میں آپ کی اہلیہ کی وفات کی تھی۔ ۱۹۳۳ء اور ۱۹۹۱ء میں ستاون سال کا فرق ہے۔ بہر حال آپ کے کلام کی پختگی سے کہا جاسکتا ہے کہ آپ انیسویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ آپ کی جنم بھومی بھیرہ شہر میں واقع محلہ بھٹیاں والا تھا۔ آپ کے والد کا نام مولوی غلام محمد تھا جو خود بھی عالم دین تھے۔ لہذا بیٹے کی ابتدائی تعلیم بھی دینی علوم پر گھر میں ہی ہوئی۔ بعد ازاں آپ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے اور اسلامیہ ہائی سکول بھیرہ میں نائب مدرس رہے۔ آپ اردو، فارسی، عربی اور پنجابی زبان میں شعر کہتے تھے۔ آپ کی کتاب "سی حرفی مع غزل و کافی" میری نظر سے گزری ہے۔ اس کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ چھپی ہوگی۔ سی حرفی اور کافی پنجابی زبان میں جبکہ غزل زبان میں ہے۔

تیری ادا نے چھینا صبر و قرار پیارے	زلفوں نے کر لیا ہے دل کو شکار پیارے
ابرو کمان ظالم مژگان خدنگ قاتل	دل ہو گیا ہے زخمی سینہ فگار پیارے
شمع جمال تو ہے پروا نہ تجھ کو کوئی	ہم جل رہے ہیں اوپر پروا نہ وار پیارے
بلبل کی طرح تیرے ہم گیت گارہے ہیں	تجھ گل کر ترستے ہیں لیل و نہار پیارے
جور اور ناز تجھ سے، عجز و نیاز مجھ سے	تم سے عتاب ہم سے ہے انکسار پیارے
تم نے نہ بھول کر بھی پوچھا کہ حال کیا ہے	ہم نے یہ جان تم پر کردی نثار پیارے

خاطر تمہاری ساری بدنامیاں سہی ہیں
 پہلے بڑھا کے الفت پھر بولنا بھی چھوڑا
 دل چھین کر ہمارا پھر کر گئے کنار
 وعدے کہاں وفا کے جو مجھ سے آپ کے تھے
 جب روز وہ خوشی کے آتے ہیں یاد مجھ کو
 معلوم نہ تھی ہم کو تیری یہ بے وفائی
 بولو اگر نہ بولو جانو اگر نہ جانو
 پاؤں سے کچل ڈالو ہاتھوں سے قتل کر دو
 چھوڑا تمہارے پیچھے گھر اور بار پیارے
 اچھا کیا یہ ہم سے انجام کار پیارے
 کوچہ بہ کوچہ ہم کو کر کے خوار پیارے
 وہ وصل کے کہاں اب عیش و بہار پیارے
 ہوتے ہیں اشک جاری بے اختیار پیارے
 امید تھی کہ ہو گا تو غم گسار پیارے
 ہر وقت ہم تمہارے ہیں طلبگار پیارے
 راضی ہیں ہم جو تیری مرضی ہو یار پیارے

شیدا مجید تیرا محبوب ہے تو میرا

عالی مزاج تو ہے میں خاک سار پیارے ۲۲

مولوی عبدالمجید کو تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جو ”قطعہ تاریخ رسالہ

شمس الاسلام“ لکھا۔ یہ بھی اُن کے فن کی پختگی اور زبان پر اختیار کی دلیل ہے۔

جس دم کیا ہے شمس نے اسلام کے طلوع
 جیشِ محمدی کی جو دیکھی درخشِ تیغ
 شب پر کی طرح کور ہوئے دشمنانِ حق
 ڈر سے ہوا ہر ایک مخالف کا رنگِ نق
 کانوں میں آرہی ہے یہ آوازِ غیب سے
 الحق قد تظاہر و الکفر قد ذہق
 شکرِ خدا ہے ناصرِ اسلام آگیا
 اس کے لیے اسی کو کیا حق نے منتخب
 ہذا ظہورِ احمد وھذا ظہورِ حق
 جو ذات جس کے واسطے تھی اہل اور حق
 ملتے ہیں اس میں خبر و تفاسیر کے نکات
 تطہیرِ دل درستیِ اخلاق کے سبق

کیا ہے یہ شمس؟ دل سے جو پوچھا مجید نے

بولا جواب میں ہے ”چراغِ ہدائے حق“ ۲۳

مولوی نور الدین

مولوی نور الدین کی ولادت اور وفات کی بارے میرے زیر مطالعہ کتب بالکل خاموش ہیں۔ البتہ باب الاعوان میں اُن کے بارے بہت ہی مختصر حالات ملتے ہیں۔ مثلاً ”سبب تالیف کتاب ہذا“ میں وہ لکھتے ہیں:-

”عاصی فقیر نور الدین بن حضرت خواجہ مولانا حاجی نور محمد قوم سلیمانی افغان حنفی نقشبندی مجددی متوطن قصبہ غفری واقعہ کوہستان سون سکیسر تحصیل خوشاب ضلع شاہ پور ملک شمالی پنجاب یہ عرض کرتا ہے“۔ ۳۴

اسی مذکورہ کتاب کے آخر میں آپ اپنی تعلیم کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

”تعلیم کا حال یہ ہے کہ ابتدائی کتب فارسی، نظم و فقہ، عربی، درسی اور چند کتب سلوک وغیرہ اپنے والد ماجد حضرت مرشدنا خواجہ نور محمد کی خدمت میں رہتے ہوئے پڑھیں۔ پھر اہل سنت و جماعت کے طائفہ حنفیہ رضویہ میں داخل ہوا اور پھر اکثر کتب فقہ و صرف و نحو و حکمت وغیرہ مولانا نور محمد صاحب مفتی شہرلیہ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کی خدمت میں پڑھیں اور کتاب حدیث شریف و اصول، حدیث شریف و اسماء الرجال وغیرہ حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب محدث مرحوم لیہ شاگرد مولانا محمد نذیر حسین صاحب دہلوی سے حاصل کریں اور اُن کی سند شاہ عبدالعزیز، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ علماء کو پہنچتی ہے اور کچھ کتابیں متفرقات حضرات علماء الہند سے استفادہ پا کر پڑھیں“۔ ۳۵

ابتدائی تعلیم کے اس تذکرے کے بعد ہم مولوی نور الدین کی تاریخ ولادت کا اندازہ بھی اسی کتاب سے لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ اسی ذکر میں آگے چل کر وہ رقمطراز ہیں:-

”۱۳۱۵ھ میں اس عاجز نے دہلی جا کر اکثر کتب متفرقات علماء دہلی سے حاصل کیں۔ خصوصاً کتب حدیث کی حضرت مولانا محمد نذیر حسین محدث دہلوی کی خاص خدمت شریف میں سند حاصل کی اور پھر اکثر کتب تصوف و سلوک اہل اللہ کا پڑھنا حضرت والد ماجد کی خدمت سے اتفاق ہوا اور اب بوقتِ تجمیع کتاب ہذا کے ۱۳۱۹ھ ہے۔ پس اس حساب سے عمر اس عاجز کے صرف اٹھائیس سال ہوئی۔“ - ۲۶

یوں ۱۳۱۹ھ سے اٹھائیس سال جب منہا کریں تو ۱۲۹۱ھ مولانا نور الدین کی سن ولادت بنتی ہے۔ جو تقویم تاریخی کے مطابق ۱۸۷۴ء ۲۷ کا سن بنتا ہے۔ محمد سرور خان اعوان نے آپ کے مختصر حالات اپنی کتاب ”وادیء سون سیکسر“ میں تحریر کئے ہیں کہ

”اُن کے آباؤ اجداد کا تعلق میانوالی کے قصبہ موسیٰ خیل سے

تھا۔ مورث اعلیٰ کا نام عثمان خان عرف مانی خان تھا جو قصبہ مذکورہ سے ترک سکونت کر کے کفری میں آباد ہو گیا تھا۔“ - ۲۸

مولانا نور الدین نے کم عمری میں ہی لکھنا پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اردو، فارسی، عربی اور پنجابی زبانوں میں آپ اپنی بات قرطاس پر ”الیکتے“۔ شاعری، تنقید، تحقیق اور کئی علوم پر آپ کی بہت سی کتب منظر عام پر آئیں جن میں سے ”باب الاعوان، زاد الاعوان، تاریخ سلیمانی، النصح المجدی فی سلاسل نقشبندی، نور الاسناد اور حلیہ نوری“ کو بہت پذیرائی ملی۔ آپ نے کئی کتابوں کے تراجم بھی کئے۔ آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا جس کا پتہ ہمیں باب الاعوان کی ترتیب سے لگتا ہے جس میں سو سے زائد کتب کا حوالہ موجود ہے۔

مولانا ایک عالم دین تو تھے ہی۔ لیکن آپ ایک صوفی باصفا بھی تھے۔ آپ کے ارادت مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ محمد سرور خان اعوان کے مطابق۔

”سر محمد شفیع مرحوم کا سارا خاندان اُن کے ارادت مندوں میں

شامل تھا۔ ۱۹۳۱ء میں سابق فنانشل کمشنر جی معین الدین نے اپنے دورہ
 وادیء سون میں نوشہرہ سے کفری تک پا پیادہ اپنے شیخ طریقت مولانا
 نور الدین کے پاس حاضری دی۔“ - ۳۹

مولانا نور الدین کی وفات کے بارے بھی کوئی مستند حوالہ ہمارے پاس موجود نہیں سوائے
 اس کے کہ آپ اپنے عقیدت مندوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے آخری ایام میں لاہور منتقل ہو
 گئے اور وہیں وفات پائی۔ لاہور میں سکونت صاف ظاہر ہے کہ ۱۹۳۱ء کے بعد اختیار کی گئی ہو
 گی۔ وہاں کتنا عرصہ قیام کیا اور کب وفات پائی؟ اس بارے وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ آپ کی
 اردو شاعری کا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

حمد جلّ شانہ

حمد ہے سب صاحبِ افلاک کو جس نے پیدا ہے کیا اس خاک کو
 پاک ہے وہ بادشاہِ بے زوال اُس نے انساں کو کیا والا کمال
 پاک ہے وہ قادرِ ربِ جہاں لطف سے اس کے ہوا کون و مکان

پاک ہے وہ خالقِ ربِّ الجلیل

مصطفیٰ ہے اس کی قدرت کی دلیل

نعت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم

کیا کروں میں نعت ختم المرسلین ہے محمد مصطفیٰ رحمت یقین
 نور احمد کا ہے یہ سارا ظہور کوہ و صحرا آدم و حور و تصور
 سب سے برتر ہے ہوا خیر الانام پیشوا و انبیاء سب کا امام

کیا کروں میں وصف خیر الانبیاء

اس کی خاطر ہے یہ سب ارض و سما

مدح حضرات چہاریار کبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم

جانشین پیشوائے اولین نایب خیرالورا صدیق دیں
 مقتدائے خلق ہیں بازیب و فر نایب سرور جہاں حضرت عمرؓ
 شاہسوار جانشین محبوب رب حضرت عثمانؓ ذوالنوریں لقب
 کس سے ہو تحریر شان مرتضیٰ
 شاہ مرداں ابن غم مصطفیٰ

دل خوشابی

شریمان لوکنا تھ جی دل خوشاب ضلع سرگودھا کے رہنے والے تھے۔ اُن کے حالات زندگی پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ شریمان شاید ان کے خاندانی نام کا حصہ نہیں تھا۔ کیونکہ ہندی لفظ شریمان کے معنی دولت مند، اقبال مند، صاحب رونق اور خوبصورت کے ہیں جسے شری مت بھی کہا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں وہ دولت مند یا سینٹھ قسم کے شخص ہوں گے اس لئے انہیں شری مان کہا جاتا ہو گا۔ مزید یہ کہ آپ تقسیم ہند سے بہت پہلے آنجہانی ہو چکے تھے۔ دوسری وجہ اُن کے بحیثیت شاعر سامنے نہ آنے کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُن کی اکثر نگارشات مذہبی حوالے سے تھیں ہندوؤں کے مذہبی رسائل میں شائع ہوتی تھیں جو عام قاری کے مطالعے میں نہ آسکیں۔ تقسیم ہند کے وقت اُن کی اولاد خوشاب میں موجود تھی جو یہاں سے ہجرت کر گئے اور بھارت میں جا بے۔ اُن کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے البتہ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کی ولادت انیسویں صدی کے نصف میں ہوئی ہوگی۔

دل خوشابی کی درج ذیل نظم بھی اگرچہ ایک پھٹے پرانے رسالے سے لی گئی ہے۔ لیکن اس کاغذ کی حالت سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں یہ رسالہ کہیں شائع ہوا ہوگا۔ اور یہ رسالہ خالصاً ہندوؤں کے مذہبی پہلوؤں کو اجاگر کرتا تھا۔ اور ہندو دھرم کے لئے شائع ہوتا تھا۔

ہمالہ اور شاعر

ہوا ساکت تھی شب خاموش تھی تنہائی تھی ہر سو
 زمیں کا ذرہ ذرہ جلوہ مہتاب سے تاباں
 لب امواج پر روپہری کرنوں کا تبسم تھا
 شراب چاندنی اشعار کے ساغر میں بھرنے کو
 خیال افروز تھا دل، نوجواں تھی آرزو میری
 کہا میں نے ہمالہ سے ہمارا رازداں تو ہے
 قسم تجھ کو تری رفعت کی مجھ سے بات سچ کہنا
 تری ہر بات کو میں گوشہ دل میں چھپالوں گا

مجھے جذبات کے پھولوں کے تاگے میں پرونا ہے

تری ہر بات کو اس دل میں آ کر نظم ہونا ہے

بیاں کراے ہمالہ ! مجھ سے سب ماضی کا افسانہ
 فضا کیسی ہوا کیسی تھی، کیسا وہ زمانہ تھا
 پتا کے واسطے وہ رام کی ذی شان قربانی
 بڑے بھائی کی خاطر چھوٹے بھائی کی وفاداری
 جدا بھائی سے ہو کر بھرت کی الفت کا افسانہ
 کنہیا کی سریلی بانسری کی دلربا تانیں
 سدرشن چکر گردھاری کا اور اعجاز گیتا کے
 لرز اٹھتا گرج سے بھیم کی تھا آسماں کیسے
 گورو وہ درون جیسا اور وہ ہمیشہ سا برہمچاری
 بکرماجیت کے انصاف کی شہرت بھی یاد ہوگی
 تجھے گوتم کا وہ عہد مسرت بھی تو یاد ہوگا

وہ عہد حکمرانی، دبدبہ، وہ شانِ مردانہ
 جو اپنی شان و عظمت اور ہمت میں یگانہ تھا
 پتی کے واسطے سیتا کا وہ ایثارِ نسوانی
 وہ لگھشمن جس نے چودہ سال کی تھی ناز برداری
 ملی گوشانِ شاہانہ رکھی حالت فقیرانہ
 سحر انگیز و مستی خیز و دلکش جانفزا تانیں
 کھلے تھے سانورے ہونٹوں سے کیسے راز گیتا کے
 سر میدان گونج اٹھتی تھی ارجن کی کماں کیسے
 ید ہشتر سا وہ دھری اور کرشنا سی ستی ناری
 وہ چندرگپت کے اوصاف کی شہرت بھی یاد ہوگی
 تجھے اشوک کا دورِ حکومت بھی تو یاد ہوگا

وہ کالیداس کے دوہرے وہ راجہ بھوج کی شوکت
تجھے تو یاد ہوں گی آج تک جوہر کی وہ رسمیں
کہاں پتلے شرافت کے سخاوت کے حقیقت کے
کدھر ہیں وہ مجسمے پاک اور وہ پاک تصویریں

ہوا محسوس مجھ کو دور سے ٹھنڈی ہوا آئی

مرے کانوں میں درد انگیز ہمالہ سے صدا آئی

کہ اے ہندوستان کی شان اور شوکت کے شیدائی
سناتا ہوں تجھے کہ کس طرح سے ہو گیا غارت
تباہی کا ہوا آغاز باری پھوٹ کی آئی
گئی وہ شان ہر ہندی کی عظمت میں زوال آیا
وہ پرتھوی راج اور بے چند کی آپس میں ناچاقی
وہ یودھامان سنگھ کی قوم کے حامی سے غداری
جمایا لودھیوں، مغلوں نے تخت و تاج پر قبضہ
گورو گو بند سنگھ، پرتاب، سیوا، بیر بیراگی
عمیاں ہے روزِ روشن کی طرح جو بعد میں گزری

اسی سیلاب میں پھر بن کے تنکے بہ گئے ہندی

چلے وہ چال کہ آخر میں بالکل رہ گئے ہندی

شیدانبالوی

شیدانبالوی کے بارے مجھ تک جو معلومات پہنچی ہیں وہ ”سخنوران سرگودھا“ یا پھر اخلاق

عاطف کے پاس ایک پروفارم نامکمل پڑ ہے جس سے صرف نام اور سن ولادت کا پتہ چلتا ہے۔

”سخنوران سرگودھا“ کے مطابق ان کا نام ”منشی عبدالرزاق اور ولادت ۱۸۸۰ء انبالہ شہر ہے“ ۲۲ جبکہ اخلاق عاطف کے پاس موجود فارم میں نام خواجہ عبدالرزاق اور سن و مقام ولادت ۱۸۹۰ء انبالہ شہر (مشرقی پنجاب) ہے۔ ۲۳ میرے خیال کے مطابق موخر الذکر سن ولادت حقیقت کے قریب قریب ہوگا۔

شیدا انبالوی (مرحوم) ”سخنوران سرگودھا“ میں یوں متعارف کرائے گئے ہیں:

”آپ کے والد منشی رحیم بخش خود بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کا

تخلص ضیاء تھا۔ حضرت شیدا نے یہ ذوقِ سلیم وراثت میں پایا۔ لڑکپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ ابھی اس صدمے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ طاعون کی وبا

پھوٹ پڑی۔ آپ کے بہت سے عزیز واقارب بھی لقمہ اجل بن گئے۔

زندگی کا بیشتر حصہ کاروباری مصروفیات کی بدولت گھر سے باہر گزارا۔ شیدا

انبالوی نے شاعری میں محشر لکھنوی سے فیض حاصل کیا۔ تقسیم پاک و ہند کے

بعد آپ سرگودھا میں مستقل رہائش پذیر ہوئے۔ مطالعے کا بے حد شغف

تھا۔ انبالہ شہر میں اپنی ذاتی لائبریری تھی۔ گو تقسیم کے بعد یہ لائبریری تو نذر

آتش ہو گئی مگر شیدا کا مطالعہ جاری رہا۔ آپ نے سرگودھا میں بہت تنگدستی

کی حالت میں گزر بسر کی۔ لیکن فکر معاش ان کے شوقِ خدمتِ ادب کی راہ

میں رکاوٹ نہ بن سکی اور آپ نے آخری سانسوں تک علم و ادب کی شمع

تھامے رکھی۔“ ۲۳

منشی عبدالرزاق شیدا انبالوی کے دو مسودے بعنوان ”نگارستان شیدا موسوم بہ ”سخن زار“

اور ”ادبستان شیدا“ ان کی شعری زندگی کا اثاثہ انہوں نے ترتیب دے رکھے تھے۔ لیکن خدا جانے وہ

دونوں شعری مجموعے اب کس کے پاس ہیں اور کس حال میں ہیں۔ آپ کی وفات جب ۱۶ اگست

۱۹۷۰ء کو ہوئی تو ان مرتبہ دو مسودوں کے علاوہ مزید بھی آپ کا کلام غزلیات اور حمد و نعت کی شکل میں

موجود تھا۔ سرگودھا آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔ آپ سرگودھا میں شعر و ادب کی آبیاری کرنے والوں میں شامل تھے۔ اور پختہ فکر و فن کے حامل شاعر تھے۔

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

خدا نے بھی دعویٰ کیا عاشقی کا وہ تھا حسن زیبا مہ عاشقی کا
 بنا بیٹھا ہوں آئینہ بے خودی کا تصور میں نقشہ ہے روئے نبیؐ کا
 فدا ہوتے ہیں ہر گھڑی آ کے قدسی وہ رتبہ ہے طیبہ کی ہر اک گلی کا
 رہ شوق اور ناتوانی کا عالم کوئی حال دیکھے میری بے بسی کا
 مجھے کھینچ لے جائے شوق مدینہ نکل جائے اے کاش ارمان جی کا
 تیرے گم شدہ کے تجسس میں ہر دم بگولوں کو ہے شغل آوارگی کا

دعا ہے الہی کہ شیدا کے لب پر

دمِ واپس بھی ہو کلمہ نبیؐ کا

غزل

بجائے خود مطمئن تھی دنیا جدال دیر و حرم سے پہلے
 قرار تھا جاگزیں خاطر خوشی تھی غربت کے غم سے پہلے
 تری جفاؤں کا شکریہ بھی ادا ہی کرنا پڑے گا لیکن
 میں اپنے آنسو تو خشک کر لوں ستم زدہ چشمِ نم سے پہلے
 تمہارے پیمان دوستی کے فریب میں کوئی آ ہی جاتا
 اگر کہیں لڑکھڑانہ جاتی زبان قول و قسم سے پہلے
 قیود ظاہر سے بے خبر تھا بشر کا ذوق نیاز مندی
 خدا کی بے لوث بندگی تھی قیام دیر و حرم سے پہلے
 گروہ اہل طلب کی خواہش وہی فقط دل فروشوں تک

نہ ایک بھی سرفروش نکلا رہِ محبت میں ہم سے پہلے
 کہیں تری بدزبانیوں سے مزاج ساقی بدل نہ جائے
 حصولِ ساغر سے بہرہ ور ہو شکایتِ کیف و کم سے پہلے
 اگر سرِ راہ آ گیا ہے تو جرح کیا ہے رواروی میں
 صنم کدے کی بھی سیر کرتے چلیں طوافِ حرم سے پہلے ۴۶

باوا محمد عمر رند خوشابی

باوا محمد عمر المعروف باوا محمد عمر رند خوشابی کے والد کا نام شیر محمد اور والدہ کا نام ستاں بی بی تھا۔ آپ اعوان قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ خوشاب شہر میں پیدا ہوئے۔ وقتِ وفات آپ کی عمر اسی سال بتائی جاتی ہے یوں یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ۱۸۹۲ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ آپ کے والدین اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ آپ کی والدہ دعا کرانے کی غرض سے کسی فقیر کی تلاش میں گھر سے نکلیں راستے میں باوہ خواجہ عمر مست قلندر ملے جن کا مزار موسیٰ شریف نزد کلور کوٹ میں ہے۔ اُن کے ہاتھ میں کھجور کا ایک دانہ تھا وہ ستاں بی بی کو دے دیا اور فرمایا: ”اللہ عزوجل آپ کو ہمارا ہم نام، ہم خصلت بچہ دے گا“۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

باوا محمد عمر جب جوانی میں پہنچے تو ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ والدین نے باروزگار دیکھ کر شادی کر دی مگر انہوں نے جلد ہی بیوی کو آزاد کر دیا اور والدین کی وفات کے بعد ملازمت ترک کر کے گھر کا تمام اثاثہ راہِ خدا میں دے کر اپنی مرشد فتح بی بی کے پاس چلے گئے۔ فتح بی بی ملانہ شریف تحصیل و ضلع میانوالی میں رہتی تھیں اور خواجہ عمر مست قلندر صاحب کی مرید تھیں اور خواجہ عمر خواجہ حضرت پیر سیال کے مرید تھے۔

باوا محمد عمر نے کافی عرصہ مائی صاحبہ کے ہاں گزارا یہاں تک کہ سید شیر امیر شاہ اور سید غلام محمد شاہ موضع ستھ شہانی تحصیل خوشاب انہیں مائی صاحبہ سے مانگ کر اپنے پاس لے آئے۔ باواجی

زندگی کا کچھ حصہ سادات کے ساتھ ساتھ میں رہے۔

مائی فتح بی بی نے اپنی زندگی میں سلطان پور تحصیل شاہ پور کے مغرب کی جانب ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تین قبریں کھدوائی تھیں۔ قبر تیار ہونے کے چند دن بعد ہی مائی صاحبہ نے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئیں۔ مائی صاحبہ کے حکم کے مطابق باوا محمد عمر سلطان پور میں ۱۸ سال تک رہے اور ۱۹۷۲ء میں وفات پائی۔ انہیں بھی تیار شدہ ایک قبر میں دفن کیا گیا۔

حضرت باوا محمد عمر خوشابی کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے آپ کی زبان پنجابی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد ”اظہار حقیقت“ کے نام سے آپ کا پنجابی کلام شائع ہوا۔ اس پنجابی کلام میں ایک نظم پنجابی زبان کی ٹیپ چند مصرعوں کے ساتھ اردو زبان میں شامل ہے۔ دراصل ایک دفعہ کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ آپ نے اس کا بازو پکڑ کر بٹھالیا اور فرمایا:

میں وحدت ذات قدیم میری

وہ آدمی تو بہ تو بہ کر کے اٹھنے لگا۔ آپ نے اسے دوبارہ بٹھا کر کہا نہیں!

ہن صورت ہے بامیم مری

اور پھر پوری نظم اسے کہہ سنائی۔

یہ نظم حقیقت میں وحدت الوجودی بحث ہے۔ بہت سے قاری اسے پڑھ کر بُرا ماننے کا اپنا حق رکھتے ہیں کہ صوفی کی سوچ عام آدمی سے الگ ہوتی ہے۔ وہ کسی اور پہلو سے سوچتا ہے اور خود کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے جدا نہیں سمجھتا۔ نظم حاضر ہے۔

میں آدم، نوح، داؤد بھی ہوں	میں شاہد اور مشہود بھی ہوں
میں خلیل، کلیم، وجود بھی ہوں	ایہو فی اللہ ذات کریم مری
میں روح اللہ تنزیل بھی ہوں	توریت زبور انجیل بھی ہوں
میں پاک قرآن دلیل بھی ہوں	ایہو ذات غفور رحیم مری
جبار، ستار، غفار بھی ہوں	میں آل محمد خار بھی ہوں

میں اکثر ذات رحیم بھی ہوں ایہو صفت عذاب عظیم مری
 میں ابو جہل، سفیان بھی ہوں صدیق، عمر، عثمان بھی ہوں
 میں علیؓ جلی مردان بھی ہوں ہے اکبر ذات عظیم مری
 میں ارض و سما نشان بھی ہوں میں جلوہ گر جانان بھی ہوں
 میں رام چندر بھگوان بھی ہوں ہو اللہ ذات قدیم مری
 لبریز ہو یا آ پیانہ میں دوجا بن کے دیوانہ
 العمر خوشابی کما کان
 رنگ کثرت جھوک سقیم مری ہے

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع

مفتی محمد شفیع ۱۸۹۴ء میں موضع دوآبہ ضلع میانوالی ۱۸ء کے ایک علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد قاضی محمد امین ایک عالم دین تھے اور چچا مولانا احمد دین کیلوی بہت بڑے فقیہ اور علوم متداولہ پر گہری نظر رکھتے تھے وہ مولانا ابوالسعد احمد خان (کنڈیاں) کے خلفائے مجاز میں سے تھے۔ اختر راہی لکھتے ہیں کہ:

”مفتی محمد شفیع نے آغاز طالب علمی میں مولانا احمد خان سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مدرسہ رحیمیہ نیلا گنبد لاہور میں زیر تعلیم رہے۔ ذہین و ذکی طالب علم تھے۔ اسباق میں جرح اور اعتراضات سے بعض اوقات اساتذہ کو بے بس کر دیتے تھے۔ اسی ذہانت کے ہاتھوں مدرسہ سے ان کا کام خارج کر دیا گیا۔ لاہور سے امرتسر گئے اور مختلف اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ آخر میں دارالعلوم دیوبند جا کر سند فضیلت حاصل کی۔“ ۹۹

مفتی محمد شفیع تعلیم کے حصول کے بعد خوشاب آ گئے جہاں مرکزی جامع مسجد میں بازار میں ”مدرسہ سراج العلوم“ قائم کیا اور آنے والی نسلوں کو اسلام کی راہ پر چلنے کی تعلیم دینے لگے۔ اسی مسجد میں آپ خطیب بھی تھے۔ خوشاب میں وعظ و ارشاد اور درس و تدریس کے بعد آپ نے ۱۹۳۶ء میں سرگودھا کا رخ کیا۔ سرگودھا میں آمد کے بارے پر و فیسر ہارون الرشید تبسم رقمطراز ہیں:

”جامع مسجد بلاک نمبر ۱ سرگودھا کے لئے شہزادہ غلام محمد، حکیم

حافظ محمد سعید المعروف بابا ڈورا، حکیم سید عبدالرزاق شاہ گیلانی اور کئی احباب

آپ کے پاس خوشاب گئے اور آپ کو لے آئے۔ آپ کے شاگرد خاص

مولانا محمد صالح بھی ہمراہ تھے۔ یہاں بھی مدرسہ سراج العلوم قائم کیا۔“ ۵۰

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نے تحریک پاکستان میں یونینسٹ کے خلاف جمعیت علمائے ہند

اور مجلس احرار کا ساتھ دیا۔ سرگودھا میں رہتے ہوئے آپ نے تمام مکاتب فکر کے علماء کو ایک پلیٹ

فارم پر جمع کیا۔ اور تعصب کی فضا کو ختم کیا۔ جب پاکستان قائم ہو گیا تو مہاجرین کی آباد کاری کا مسئلہ

تھا۔ آپ نے اس سلسلے میں بھی حتی المقدور کوشش کی۔ جب تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوا تو آپ نے

اس میں بھرپور حصہ لیا۔ جس بنا پر آپ کو جیل کی سزا بھی کاٹنا پڑی۔ آپ نے سیاست میں بھی حصہ لیا

اور قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔

مفتی محمد شفیع ۱۵ جولائی ۱۹۶۶ء کو اللہ کو پیارے ہوئے اور اپنے بعد یادوں کا ایک سلسلہ چھوڑ

گئے۔ آپ مبلغ، عالم دین، خطیب، مقرر اور کئی خوبیوں کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی،

پنجابی اور عربی کے شاعر بھی تھے۔ آپ نے ”سلسلہ طیبہ نقشبندیہ مجددیہ“ چاروں زبانوں میں منظوم لکھا

جو آپ کی وفات کے بہت بعد شائع ہوا۔ اردو میں لکھے گئے اس سلسلہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے دلا پیش خدا ہو التجا کے واسطے کبریا بخشش نوا بے ابتداء کے واسطے

با ادب آہستہ لب سے یوں کہو اے میرے رب جرم سب دے بخش احمد مجتبیٰ کے واسطے

حضرت صدیق اکبرؓ جانشین مصطفیٰؐ پیشوائے رہروان ابتداء کے واسطے

دین و ایمان کی اماں ہو شیخ سلمان کے طفیل صاحب سر نبی الانبیاء کے واسطے
 کلمہ حق ہو رواں میری زباں سے اے خدا پیر قاسم بن محمد بے ریا کے واسطے
 شیخ کامل سید عالی نسب والا حسب جعفر صادق امام الاصفیاء کے واسطے
 ماسوا کی ہو نہ گنجائش میرے دل میں خدا بایزید پیر حق ذوالاجتبا کے واسطے
 یا الہی درد دل ہو ہر گھڑی مجھ کو نصیب بوالحسن خرقانی پیر ہدی کے واسطے

☆

منع فیض و عنایت مرجع ہر خاص و عام شیخ احمد خان قطب الہتداء کے واسطے
 مہبط نور ولایت حضرت پیر ہدی خواجہ عبداللہ ثانی مقتدی کے واسطے
 مرکز جود ولایت واقف اسرار دیں حضرت خان محمد مہتدی کے واسطے
 یا الہی کچھ نیاز بندگی سن لیجئے جملہ اپنے انبیاء و اولیا کے واسطے
 روز و شب ہوں غرق عصیاں میں بہت شرمندہ ہوں آنکھ نیچے کر کے بیٹھا ہوں حیا کے واسطے
 جب نظر کرتا ہوں اپنے حال پر صد الاماں ہاتھ اٹھتے ہی نہیں اٹھتے دعا کے واسطے
 محجب ہوں، منفعل ہوں، آپڑا در پر ترے وعدہ لاتقنطوا سن کر گدا کے واسطے

کون داتا ہے کہاں جاؤں اگر تورد کرے

یہ شقیع خستہ دل بس ہے خدا کے واسطے

حافظ فضل کریم گوندل

گوندل قبیلے کے چشم و چراغ فضل کریم ۲۱ اپریل ۱۸۹۸ء کو بھیرہ میں پیدا ہوئے لیکن
 ایک روایت ۲۳ جنوری ۱۸۹۸ء بھی تحریری طور پر ملتی ہے۔ آپ نے دین کی ابتدائی تعلیم اپنے والد
 محمد امین سے حاصل کی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور حافظ کہلوائے جبکہ شعر و سخن میں آنے پر حافظ بن
 پسند کیا۔ بعد ازاں دہلی چلے گئے اور وہاں کے ”مدرسہ امینیہ“ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے عربی

فاضل کا امتحان پاس کیا اور حدیث میں سند فراغت حاصل کی۔ جوانی کے انہیں ایام میں شاعری کا شوق پیدا ہوا شاید اس میں وطن سے دوری کا اثر شامل ہو۔ لہذا جب واپس بھیرا آئے تو مولوی فضل الہی قریشی بھیروی سے اصلاح لینے لگے۔ آپ نے کئی حج کئے اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دی۔ آپ کا شمار بھیرا کے معتبر علماء و فضلاء میں ہوتا ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور پنجابی ہر چہار زبان پر آپ کو عبور حاصل تھا۔ اور ان تمام زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ لیکن بنیادی طور پر آپ کو فارسی زبان کا شاعر کہا جاسکتا ہے۔ آپ تصوف کی طرف مائل تھے اور وحدت الوجودی عنصر آپ کی شاعر میں بھی ملتا ہے۔ آپ کی شاعری کے مطالعے سے حقیقت بالکل واضح دکھائی دیتی ہے کہ۔

ہر گل و غنچہ میں بو تیری ہے بلبل شیدا میں بھی خو تیری ہے
برسر شمع ہے جلوہ کس کا بال پروانہ میں بو تیری ہے

مولوی حافظ فضل کریم گوندل کے بلند پایہ عالم ہونے میں تو کسی کو شک نہیں۔ آپ کی شاعری بھی استقام و لغویات سے صاف ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آپ ایک بزم آرا انسان تھے۔ ہر روز ذکر اذکار کی محفل مسجد قصاباں میں منعقد ہوتی جو ظہر تک جاری رہتی تھی۔ علاوہ ذکر و اذکار کے صاحب علم حضرات، اہل دل، طالبان حق اور شعراء بھی آپ کی محافل میں حاضر ہوتے، ہر مکتبہ و فکر کے لوگ اپنے اپنے مقاصد اور اپنی اپنی الجھنیں لئے آتے اور دلی تسکین کے ساتھ رخصت ہوتے۔ یہ سلسلہ آخری دنوں تک جاری رہا اور بالآخر آپ اطمینان محسوس کرتے ہوئے ۱۵ جنوری ۱۹۸۰ء ۵۴ کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

حافظ فضل کریم نے اگرچہ حمد و نعت میں زیادہ تر شعر کہا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انہوں نے نظم اور غزل و رباعیات کی اصناف میں بھی دل کی بات لوگوں تک پہنچائی۔ آپ کی کئی یادگار کتابیں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جن میں ”غزلیات و رباعیات“ (اردو)۔ ”غزلیات و رباعیات“ فارسی۔ ”شاہ نامہ اسلام“ (منظوم فارسی)۔ ”داستان پاکستان“ (منظوم فارسی)۔ ”نماز مترجم“ پنجابی۔ ”شہد نامہ“ اور ”حضرت سفینہ سالار مدینہ“ شامل ہیں۔

آپ کی شاعری میں اسلامی رنگ بالکل نمایاں ہے۔ اخلاقی، اصلاحی نظمیں اور وطن سے محبت کے حوالے سے بھی نظمیں بہت سی موجود ہیں۔ لیکن اُن کا جو خاص رنگ ہے ملاحظہ ہو۔

سجدہ گاہِ عاشقاں

سجدہ گاہِ عاشقاں پر نقش پا ہوتا نہیں سجدہ جز محرابِ ابرو کے روا ہوتا نہیں
 دربا کو اس قدر ہے خود نمائی سے گریز آئینہ کے سامنے بھی رونما ہوتا نہیں
 سینکڑوں غنچے کھلے گلشن میں زیب تن ہوئے غنچہء دل تجھ سے وا، باد صبا ہوتا نہیں
 ایک ہی جلوہ ہے موسیٰ طور پر بے خود ہوئے تابِ نظارہ کا متحمل ہبا ہوتا نہیں
 گورِ مجنوں سے یہ آتی ہے صدائے دلنواز عشق میں جو مر مٹا ہر گز فنا ہوتا نہیں

اس بتِ کافر نے حافظ سے کہا یہ برملا

ہم پری روؤں سے کوئی با وفا ہوتا نہیں

رازِ مخفی

رازِ مخفی بیاں نہیں ہوتا ہر کوئی راز داں نہیں ہوتا
 دلستانی کا ڈھب نرالا ہے ہر کوئی دلستاں نہیں ہوتا
 کوئے الفت کے پابجولاں پر ہر کوئی مہرباں نہیں ہوتا
 بزمِ عشرت کے بادہ خواروں میں ہر کوئی شادماں نہیں ہوتا
 ملک و ملت کی پاسبانی کا ہر کوئی پاسباں نہیں ہوتا
 اہل علم و ادب کا اے حافظ
 ہر کوئی قدر داں نہیں ہوتا

مقصود وارثی

مقصود وارثی کا اصل نام مقصود احمد تھا۔ اہل سادات میں سے تھے اور سرزمین دیوہ شریف

ضلع بارہ بنکی (انڈیا) کے بزرگ حاجی وارث علی شاہ کے عقیدت مندوں میں سے ہونے کے باعث وارثی کو نام کا حصہ بنا لیا۔ آپ ۲۵ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ادب کی سرزمین لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ اور پھر طب و حکمت کی سند لینے کے بعد حکمت کو ہی پیشہ بنا لیا۔ شعر و ادب کی زمین سے ہی شاعری کا شغف پیدا ہوا اور تقسیم ہند کے بعد جب ہجرت کی تو اس شغف و شوق کو ساتھ لے آئے۔ پاکستان آنے کے بعد بھاگنوالہ کے نزدیکی گاؤں چک نمبر ۲۴ جنوبی ضلع سرگودھا میں رہائش پذیر ہوئے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے کچھ اراضی الاٹ ہوئی اور ساتھ ساتھ حکمت کو بھی وسیلہ رزق بنائے رکھا۔ کبھی کبھار نثر اور نظم دونوں سے جذبی و روحانی غذا کا حصول ممکن بنا لیتے۔ ایک تصنیف ”اظہار حق“ کے عنوان سے ترتیب دی لیکن اس کی اشاعت سے قبل ہی آپ ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ راہی ملک عدم ہوئے۔ فارسی اور اردو میں یکساں مہارت تھی۔ بلکہ فارسی میں شعر بہ نسبت اردو بہت اچھا کہتے تھے۔ اردو کی ایک نعت نمونے کے طور پر دیکھئے۔

نعت سرور کائنات

پڑھے جو نصف کلمہ وہ مسلمان ہو نہیں سکتا
بجز اسم محمد کامل ایماں ہو نہیں سکتا
محمد کے سوا تکمیل دیں ہرگز نہیں ممکن
محمد کے سوا بخشش کا ساماں ہو نہیں سکتا
گرفتار محبت جو نہیں شاہِ دو عالم کا
حقیقت ہے کہ وہ سچا مسلمان ہو نہیں سکتا
درود افضل وسیلہ ہے حصول قرب حضرت کا
بجز اس کے پہنچنا ان تک آساں ہو نہیں سکتا
وہ ہیں روشن چراغ ان سے ہوئے دونوں جہاں روشن
مجسم نور کوئی اور انساں ہو نہیں سکتا
صحیح جانا نہیں جس نے نبی کی ذاتِ اقدس کو
وہ ہے بوجہل ثانی، اہل عرفاں ہو نہیں سکتا
جسے مقصود نعت مل گئی حضرت سے الفت کی
خدا کا اس سے بڑھ کر اس پہ احساں ہو نہیں سکتا ۵

اختر واصفی

اختر واصفی کا پیدائشی نام عبدالحق اور تاریخی نام۔ ”قوی اختر“ ہے۔ قوی اختر سے آپ کا

سن پیدائش ۱۳۱۷ھ نکلتا ہے۔ جبکہ سن عیسوی ۱۸۹۹ء ہے جس کی ۱۱ اکتوبر کو آپ بھیرہ ضلع شاہ پور میں حضرت مولانا، مولوی مولا بخش واصف کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں کئی مقامات کا نام آتا ہے۔ مثلاً جھیور انوالی، دھارووالہ، کنجاہ، گجرات، وزیر آباد، بھکسوال، بیول سکھو، گوجرخان اور ڈیرہ اسماعیل خان۔ اگر ماہنامہ کامران ۵۸ میں دیئے گئے اس حوالے کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو عجیب سی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ میٹرک کا امتحان آپ نے اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی سے پاس کیا۔ ڈاکٹر محمد منیر سلیم میٹرک کا امتحان پاس کرنے کا سن ۱۹۱۹ء لکھتے ہیں۔ مزید وہ اختر واصفی کے اپنے بیان کے مطابق رقمطراز ہیں:

”۱۹۲۰ء میں فنانشل کمشنر بہادر پنجاب (حال بورڈ آف ریونیو

مغربی پاکستان) لاہور کے دفتر میں بطور امیدوار کلرک بھرتی ہو گیا۔ وہاں ہندو اور مسلم گریجویٹوں اور ڈبل گریجویٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ کی گزٹڈ اسامی تک پہنچ کر ۱۹۵۶ء میں ریٹائر ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں فیروز والا روڈ گوجرانوالہ کی ملحقہ آبادی کچی پمپ والی میں ایک چھوٹی بنا کر اپنے بقیہ ایام زندگی خدمتِ شعر و ادب میں گزار رہا ہوں“۔ ۵۹

اختر واصفی گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گئے اور وہاں سے ۱۹۵۹ء میں ایک علمی، ادبی اور اصلاحی ماہنامہ ”جدوجہد“ جاری کیا۔ چونکہ صحت خراب رہتی تھی اس لئے ایک سال بعد یعنی ۱۹۶۰ء میں اسے بند کر دیا۔

اختر واصفی کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ آپ کے والد واصف تخلص کے ساتھ شعر کہتے تھے۔ آپ کے بھائی عاصی واصفی بھی اردو اور پنجابی کے شاعر تھے۔ دراصل واصفی آپ والد کی نسبت سے یائے نسبتی کے اضافے سے لکھا کرتے تھے۔ ابھی پرائمری جماعت میں تھے کہ شعر کا شعور پیدا ہوا۔ آپ نے اردو، ہندی، پنجابی اور فارسی زبانوں میں بے شمار غزلیں، نظمیں، گیت، قطعات، تاریخیں اور سہرے لکھے۔ تنقید و اصلاح بھی آپ کا مشغلہ رہا۔ ماہنامہ کامران سرگودھا میں تنقیدی

سلسلہ ”ارمغانِ ادب“ کے عنوان سے باقاعدہ شائع ہوتا رہا۔ ۶۰

آپ نے عروض اور فارسی ادب کے ساتھ اصلاحِ شعرا اپنے والد سے سیکھا تھا۔ چنانچہ اسی لئے یہ کہا کرتے تھے کہ

واصفِ باکمال کی مجھ پہ نگاہِ لطف ہے ہنکشی کلام سے ٹپکے نہ کیوں کمال سا
تاریخ گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اور یہ بھی آپ کو ورثے میں ملی تھی۔ حضرت
قائد اعظم کی وفات پر آپ نے جو تاریخ نکالی ملاحظہ ہو۔

لازم ہے آسمان سے برسیں لہو کے اشک کہتے ہیں آج قوم کا سالار مر گیا
کتنا ستم ہے دیکھئے تعمیرِ مملکت پوری نہ ہو سکی تھی کہ معمار مر گیا
اختر بچھے نہ کیوں صفِ ماتم ہر اک طرف اسلامیانِ دہر کا غم خوار مر گیا
باچشمِ نم سروش سے دی غیب نے صدا
ملت کا آج قائدِ جرار مر گیا

اختر واصفی نے بہت لکھا لیکن شاید آپ کی کوئی کتاب منظرِ عام پر نہیں آسکی۔ آپ کا سارا
کلام مختلف رسائل میں بکھرا پڑا ہے۔ کافی عرصہ بیمار رہنے کے بعد آخر ۳۱ مئی ۱۹۷۱ء کو لاہور میں
وفات پائی چونکہ مستقل رہائش گوجرانولہ میں تھی۔ لہذا آپ کی میت کو وہاں لا کر دفن کیا گیا۔ ۱۱
نمونہء کلام۔

نظر کا فرق تھا کتنا؟ جسے ہم تیرگی سمجھے اسی کو سب کے سب اہلِ زمانہ روشنی سمجھے
ہماری ہر وفا تم کو ریاکاری نظر آئی تمہاری پر جفا کو ہم ادائے دلبری سمجھے
نظر آتا ہے آئینے میں اپنا عکس ہم سب کو تمہیں میں آشنا سمجھا، مجھے تم اجنبی سمجھے
جہاں نے چرخِ کج رفتار کو اس کا سبب جانا مگر ہم اپنی محرومی کو اپنی کجروی سمجھے
ابھی نام و نشانِ دشمنی مٹ جائے دنیا سے اگر دنیا کا ہر انسان رسومِ دوستی سمجھے
رموزِ آدمیت منکشف ہو جائیں سب اس پر اگر ہر آدمی کو آدمی سمجھے

وہی نکلا سب اے وائے اس کی بے قراری کا غلط فہمی سے ہم جس کو قرارِ زندگی سمجھے
 خدا کو مائلِ لطف و کرم کرنا نہیں مشکل مگر یہ شرط ہے بندہ مقامِ بندگی سمجھے
 ہمیں تو اپنی پُرکاری سے لوٹا عمر بھر تم نے ہم اپنی سادگی سے رہزنی کو رہبری سمجھے
 عجب کج فہم لوگوں سے مجھے پالا پڑا اختر
 میں اُن سے دوستی کرتا رہا وہ دشمنی سمجھے ۲۲

جشن بہار سرگودھا

- ج: جلال و عظمتِ ملت کا یہ نگہباں ہے
 ش: شعاعِ مشعلِ توحید و گنجِ عرفاں ہے
 ن: نہاں ہے سینے میں اس کے وہ نورِ ایمانی
 ب: بنا دیا ہے اسے جس نے شہرِ لافانی
 ہ: ہواؤں پر بھی اسے اقتدار حاصل ہے
 ا: اڑانِ اس کے عقابوں کی مرگِ باطل ہے
 ر: رچا ہے اس کی فضا میں مجاہدوں کا لہو
 س: سدا بہار پھر اس کے ہوں کیوں نہ کاخ و کو
 ر: رہے گا نامِ زمانے میں اس کا تابندہ
 گ: گئے نہ بچ کے عدو اس کے ہاتھ سے زندہ
 و: وغا میں ایک بھی خالی گیا نہ وار اس کا
 د: دلاورانِ جہاں میں ہوا شمار اس کا
 ہ: ہر ایک سال سجا کر دیا رِ سرگودھا
 ا: اُسے پکاریئے جشنِ بہارِ سرگودھا ۲۳

مولانا ظہور احمد بگوی

مولانا ظہور احمد بگوی بھیرہ کے مقام پر مولانا عبدالعزیز بگوی کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ ولادت ڈاکٹر انوار احمد بگوی ۱۹۰۰ء مطابق ۱۳۱۸ھ اور پھر اپنے ہی ترتیب دیئے گئے ایک کتابچے ”تذکرہ“ ۱۹۰۱ء میں لکھتے ہیں۔ یہاں اگر ہم ۱۳۱۸ء کو لیں تو اس میں یکم مئی ۱۹۰۰ء سے ۲۲ مارچ ۱۹۰۱ء تک کا عرصہ آتا ہے۔ اگر ہمیں مہینہ کا پتہ ہوتا تو سن ولادت معلوم کرنے میں آسانی ہوتی۔ آپ کی قبر پر حاضری دی تو وہاں کتبہ پر یکم مئی ۱۹۰۰ء کی تاریخ رقم ہے۔ لہذا یہ ۱۹۰۱ء غلطی سے لکھا گیا ہے۔

مولانا ظہور احمد نے تعلیم کا آغاز اپنے والد سے بھیرہ میں کیا۔ ۱۹۰۸ء میں ان کی وفات کے بعد بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ نے اس بار کو اٹھایا اور درسی تعلیم کا آغاز دوسرے بھائی مولانا محمد ذاکر سے کیا۔ جماعت نہم تک تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ میں حاصل کی اور میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے پاس کیا بعد ازاں۔ اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا لیکن تعلیم چھوڑ کر صحافت میں آگئے۔ ۱۹۲۰ء میں بھیرہ سے ”ضیاء حقیقت“ جاری کیا۔ ۱۹۲۰ء میں ہی حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔

مولانا ظہور احمد نے مجلس خلافت کی بنیاد رکھنے کے بعد تحریک خلافت کے دوران جیل بھی کائی۔ اور پھر اسلام کے فروغ اور تبلیغ کے مشن کو جاری رکھنے کے لئے ”شمس الاسلام“ کا اجراء بھی کیا۔ آپ نے ساری زندگی متحرک اور اسلام کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے میں بسر کی۔ اور اسی تحریک میں بالآخر گیارہ ربیع الآخر ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۵ء کو بروز دوشنبہ (سوموار) آپ نے وفات پائی اور ۱۲ ربیع الآخر بروز منگل اپنے خاندانی قبرستان بھیرہ میں سپرد خاک ہوئے۔ ۱۵۔

مولانا ظہور احمد بگوی اردو، فارسی اور عربی میں شعر کہتے تھے اور اختر تخلص کرتے تھے۔ آپ نے مولانا محمد نصیر الدین بگوی کی وفات پر جن خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سے چند اشعار

ملاحظہ ہوں۔

اے نصیر دین و ملت نخلِ اسلافِ کرام اے شہیدِ دشتِ غربت تیرا جنت ہو مقام
حادثے نے تیری کر دی تازہ یادِ کربلا جس میں تیرا سارا گلشن لٹ گیا مثلِ اماں

☆

موسم گرما گزارا کس جگہ ہے آپ نے کیوں بھلائے دل سے وعدے جو کئے تھے آپ نے
فاطمہ، حاجی، ذکیہ اور پیارے برک کو کیوں جدائی کا دیا ہے رنج و غم اب آپ نے

☆

آپ تو ہم ساغروں کے ساتھ جنت میں بے ہم غریبوں کے لئے اب رہ گئے ہیں دل جلے
حیف ہے اب کوئی دنیا میں نہیں ساتھی مرا جس کے آگے جا کہوں میں دل کا اپنے ماجرا

☆

اس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ سُنے اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانہ اپنا
اور جو طوفانِ حوادث میں ہے بیڑا آیا ڈھونڈتا پھرتا رہے کیا دلِ شیدا اپنا

☆

یوں تو معلوم ہے سب تجھ کو ہماری حالت لیک ! اب ہم سے بھلا ضبطِ فغان کیسے ہو

ریاض جالندھری

مؤلف ”سخنوارانِ سرگودھا“ ۶۸ نے آپ کی ولادت ۱۹۰۱ء اور محکمہ تعلیم سے وابستہ

ہونے کا سن ۱۹۱۹ء تحریر کیا ہے۔ جبکہ ریٹائرمنٹ کا سن ۱۹۵۶ء بیان کیا ہے۔

جناب ریاض جالندھری موضع پر جیاں کلاں تحصیل نکودر ضلع جالندھری میں پیدا ہوئے۔

احمد بخش آپ کا نام رکھا گیا۔ آپ کا تعلق اگرچہ ایک زمیندار گھرانے سے تھا لیکن حالات نے ہمیشہ

آپ کو بہت محنت کی دعوت دی۔ جیسے تیسے تعلیم مکمل کی۔ آزادیء ہند کے بعد جالندھر سے ہجرت کی اور پہلے چک نمبر ۲۶ جنوبی، بعد ازاں چک نمبر ۸۴ جنوبی اور پھر چک نمبر ۲۹ جنوبی میں تدریسی خدمات ادا کرتے رہے۔

جناب ریاض جالندھری کو اردو فارسی اور عربی پر خاص دسترس تھی۔ بچپن سے ہی طبع موزوں پائی تھی۔ اور طالب علمی کے زمانہ میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ ہجرت کے بعد آپ کسی حد تک منظم ہو گئے تو شاعری کی طرف بھی توجہ دی۔ اور پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف فرمایا تو اپنی سوچ بھی بدل لی اور حکمت عملی بھی اسلام کے مطابق کرنے لگے۔ اور صرف نعت اور حمد کے ہو کر رہ گئے۔ حتیٰ کہ نعتیہ مجموعہ بعنوان ”گلہائے عقیدت“ بنام ”دیوان ریاض“ منظر عام پر آیا۔ آپ کے بارے میں شیخ غلام حسین قیصر رقمطراز ہیں:

”ایم احمد بخش۔۔۔۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ متقی اور

متشرح بھی ہیں۔ بدن اور قد حدود اعتدال کے اندر۔ چہرہ کتابی، داڑھی سے مزین۔ شیریں گفتاری کے ساتھ بے تکلفی نمایاں اور مرنجاں مرنج کردار کے حامل ہیں۔ حدود حلال و حرام میں تمیز کرنے والے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھنے والے ان کے اس مجموعہ کلام میں کہیں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے ترانے اور کہیں اس کے احسانات کا شکر یہ، کہیں آقائے دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نعت و منقبت اور کہیں ان کی مقدس تعلیمات کا ذکر اس پیرائے میں کیا گیا ہے کہ پڑھنے اور لطف اندوز ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔“ ۱۹

ریاض جالندھری نے اپنی زندگی کے آخری ایام چک نمبر ۲۶ جنوبی میں گزارے اور

وہیں ۲۳ جون ۱۹۷۹ء کو وفات پائی۔

دعا

تعریف اور حمد ہے رب جہان کو جو پالتا ہے لطف سے کون و مکاں کو
وہ ہے رحیم اور نہایت ہی مہرباں روزِ حساب کا بھی وہ مالک ہے بے گماں
کرتے ہیں ہم تری ہی عبادت اے کبریا اور مانگتے ہیں تجھ سے ہی امداد اے خدا
ہر وقت سیدھی راہ پہ یا رب ہمیں چلا راہ ان کی جن پہ تیرا ہے لطف و کرم ہوا
راہ ان کی نہ دکھا کہ جو مغضوب ہو گئے بھٹکے جو شاہراہ سے معتبوب ہو گئے

ہم بے کسوں کی التجا یا رب قبول کر

سر سبز کر ریاض کو غنچے کو پھول کر ۷۰

درج بالا دعا دراصل سورۃ الفاتحہ کا منظوم ترجمہ ہے اور جس خوبصورتی سے کیا گیا ہے اور
جتنا سادہ لفاظی سے وہ نہ سمجھنے میں ادق ہے اور نہ مفہوم و معانی کی راہ سے کہیں الگ ہے۔ اسی طرح
ریاض جالندھری نے اپنے نعتیہ مجموعہ کلام کو ایک تو دیوان کی صورت یعنی الف سے ی (الفبائی) تک
ترتیب دیا ہے۔ دوسرا نعت میں ایک غلام کے اظہار اور اپنے آقا سے محبت کو جس اسلوب اور رنگ
میں پیش کیا ہے وہ قابل رشک ہے۔ ان کا عشق مصطفیٰ ہر شعر اور ہر لفظ سے ٹپکتا ہے۔ اور قاری کو محبت
رسول کے سبق کے ساتھ سیدھی راہ کو دکھانے میں رہنمائی بھی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو نمونہ کلام۔

پھولی جو باغ دہر میں دین نبی کی شاخ فی الفور خشک ہو گئی کفر اور بدی کی شاخ
آیا وہ روپ دین محمد کی شاخ پر دیکھی نہ اس طرح کی تھی پہلے کسی کی شاخ
ہوتی ہیں اس پہ رحمت خالق کی بارشیں سر سبز جس کے دل میں ہے حب نبی کی شاخ
شاخ نہال ہاشمی کیا پڑ بہار ہے نذر خزاں ہے ہو چکی جو تھی کجی کی شاخ
حق کا ہی نام کندہ ہے لوحِ عروج پر باطل کی جڑ سے کٹ گئی لیکن کبھی کی شاخ

یا رب تو اپنے فضل سے بیکس ریاض کو

اب تو دکھا دے گنبد سبز نبی کی شاخ ۷۰

اے رسول ذوالمنن، اے رہبر عالی مقام
 صدرِ عالی قدر ہے تو محفل کونین کا
 تھی شبِ معراج یہ حوروں کے لب پر گفتگو
 ہر کابی کے شرف سے خوش تھے جبریل امین
 سرحدِ سدرہ پہ جا کر رک گئے روح الامیں
 ہے تری ذاتِ گرامی رحمت للعالمین
 چار سو ڈنکا بجا ہے دینِ حق کی شان کا
 ہے گواہ قرآن۔ تو ہے صاحبِ خلقِ عظیم
 جو کہ خادم ہے جنابِ صاحبِ لولاک کا
 اس پہ خالق نے کیا نارِ جہنم کو حرام

ہو ریاضِ بے نوا پر بھی نوازش کی نظر

اے شفیق و غمگسار و محسن و ذی احتشام ۷۰

چودھری بشیر احمد تارڑ

”چودھری بشیر احمد تارڑ ولد چودھری فضل الہی ۳ فروری ۱۹۰۴ء کو وینکے تارڑ ضلع حافظ آباد
 میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ سے میٹرک پاس کیا۔ ”علی گڑھ مسلم
 کالج سے ایف اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کی ڈگری حاصل۔ وہ ۱۹۳۲ء میں ایکسٹرا
 اسٹنٹ کمشنر گوجرانوالہ تعینات ہوئے۔“ ۷۱

آپ کئی شہروں میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء کا عرصہ آپ نے
 بطور آفیسر آبادی سرگودھا میں گزارا۔ دوبارہ آپ ۱۹۵۴ء میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے سرگودھا آئے
 جہاں ۱۹۵۶ء تک رہے۔ ۱۹۵۶ء میں ریٹائر ہوئے تو یہیں رہائش رکھ لی۔ آپ ۱۹۶۶ء میں بلدیاتی

ایکشن میں وائس چیئرمین میونسپل کمیٹی سرگودھا منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۱ء تک اس عہدے پر رہے۔ آپ نے سرگودھا کی بہبود اور اسے نکھارنے کیلئے بہت کام کیا۔ کئی تنظیموں کے رکن رہے اور اپنی سی کوشش جاری رکھی جو سرگودھا کی بہتری کے لئے تھی بالآخر آپ نے ۲۰ اگست ۱۹۸۹ء کو اسی شہر میں وفات پائی۔ اور آپ کی میت کو آپ کے گاؤں ”وینکے تارڑ“ میں خاندانی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

چودھری بشیر احمد تارڑ باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔ لیکن شوق آپ سے کبھی کبھی شعر کہلو الیتا تھا۔ پھر یہ کہ جب کامران مشاعرے سرگودھا کے ادبی ماحول کا حصہ تھے تو آپ بھی ان میں شامل ہوتے۔ آپ کا وہ کلام اگرچہ محفوظ نہیں لیکن آپ نے بارہویں کامران مشاعرہ میں چاندنی کے عنوان سے جو نظم پڑھی تھی اس کے چند اشعار مجھے مل سکے وہ حاضر ہیں شاید ان اشعار کو پڑھ کر ان کے شاعر ہونے کو تسلیم کیا جاسکے

سیمیں کرنوں کا رقص پانی پر جیسے سے کا اثر جوانی پر
شب کے ماتھے پہ چاند کا جھومر لوٹتا ہے متاع قلب و نظر
جب ستارے نظر ملاتے ہیں میکدے کھج کے پاس آتے ہیں
کس قدر کیف کتنی مستی ہے
چاندنی رات پھر بھی ڈستی ہے ۷۲

اعجاز کرنا لوی

اعجاز کرنا لوی جن کا اصل نام اعجاز حسین اعجاز تھا ۶ مارچ ۱۹۰۴ء کو کرنا ل (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ لیکن سخنور ان سرگودھا ۷۴ء میں آپ کی ولادت ۱۹۰۶ء تحریر ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم پانی پت میں حاصل کی قیام پاکستان کے بعد ہجرت کی اور گھومتے گھماتے بھلوال میں رہائش اختیار کی محمود اسیر لکھتے ہیں کہ :

”جگر مراد آبادی سے فیض یاب ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے

بعد درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ انجمن فروغ ادب بھلوال کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔۔۔۔۔ آپ کی شاعری رنگِ قدیم سے عبارت ہے۔ جس میں رومان پسندی کا عنصر اور غمِ ہجران کے خار جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ آپ سوزِ محبت میں ڈوبی ہوئی داستانیں زدِ عام دیکھنے کے خواہشمند ہیں مگر اپنے انجام سے خوف زدہ بھی ہیں اور یہ ایک فطری امر ہے۔ شعروں میں روانی اور برجستگی کے اعتبار سے آپ کا کلام اپنی مثال آپ ہے۔“ ۷۵

ایک طرف تو یہ دعویٰ ہے اور دوسری طرف جانِ رحمت میں اعجاز حسین اعجاز کے نام سے آپ کی ایک نعت شامل ہے جس میں درج ذیل ۱۵ اشعار ہیں۔

سوادِ عرشِ اعظم ہے جلو خانہ محمدؐ کا کلام اللہ حقیقت میں ہے افسانہ محمدؐ کا
جسے دیکھو وہ ہے جامِ مئے توحید سے سرخوش سرور افزائے بزمِ دل ہے میخانہ محمدؐ کا
چراغِ طور کا پروانہ ہو کر رہ گئے موسیٰ چراغِ طور خود ہوتا ہے پروانہ محمدؐ کا
نہ ہر دل لائقِ الفت نہ ہر سر قابلِ سودا ہے خوش قسمت جسے کہتے ہیں دیوانہ محمدؐ کا
نہیں مجھ کو غرضِ اعجاز وہ نوری کہ خاکی ہیں

مجھے تو عشق ہے اُن سے میں پروانہ محمدؐ کا ۷۶

اس نعت کے بارے میں راجا رشید محمود ماہنامہ نعت کے ایک شمارے میں لکھتے ہیں :

”یہ نعت وحشت کلکتوی کی ہے جو ”الرشید“ نعت نمبر صفحہ ۶۰۵ پر

شائع ہوئی ہے۔ البتہ یہاں مقطع وحشت والا نہیں۔

کسی کا چل سکا جادو نہ طبع وحشت آگیاں پر خدا کا شکر ہے وحشت ہے دیوانہ محمدؐ کا“ ۷۷

یہاں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ نعت کس شاعر کی ہے۔ جب تک وہ دونوں بنیادی ماخذ

سامنے نہ ہوں۔ ممکن ہے کسی طرح مصرع پر نعت کہی گئی ہو اور آپس میں گڈنڈ ہو گئی ہو۔ لہذا اس نعت

کو ایک طرف رکھ کر اعجاز کرنا لوی کے کچھ اور شعر ملاحظہ فرمائیے۔

حقیقت بن کے جو ابھریں سراب ایسے بھی ہوتے ہیں
 نہیں تعبیر ہوتی جن کے خواب ایسے بھی ہوتے ہیں
 بدل دیتے ہیں اک پل میں جو صدیوں کے اندھیروں کو
 زمانے میں بہت سے انقلاب ایسے بھی ہوتے ہیں



حسرتوں کا زرد چہرہ ارغواں ہوتا گیا میرا افسانہ جب ان کی داستاں ہوتا گیا
 مختصر ہوتیں تمنائیں تو کوئی غم نہ تھا دل ہی سارا آرزوؤں کا جہاں ہوتا گیا ۸
 اعجاز حسین اعجاز المعروف اعجاز کرنا لوی نے ۱۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو بھلوال میں وفات پائی۔

محمد حسین شوق

”محمد حسین شوق ولد چودھری امام دین ۲۳ دسمبر ۱۹۰۳ء کو قصبہ دھریکاں خورد نزد قادر آباد
 ضلع گجرات میں اپنے ننھیال کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی گاؤں قادر آباد تحصیل پھالیہ
 ہے۔“ ۹ ساتویں جماعت میں تھے جب پہلا شعر کہا اور عاجز تخلص استعمال کیا۔ جماعت دہم میں
 شوق تخلص اختیار کر لیا۔ میٹرک کے بعد فارسی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں اردو فاضل کیا۔ سنٹر
 ٹریننگ کالج لاہور سے اوٹی کی کلاس پاس کی۔ اور محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ پہلے جلاپور
 جٹاں، پھر مری اور وہاں سے دھریہ ضلع شاہ پور میں آ گئے۔ دھریہ کے بعد بھاگٹا نوالہ میں ہیڈ اوٹی
 ٹیچر رہے۔ بھلوال، بھاڑہ، مڈھ رانجھا، چک نمبر ۵۵ شمالی اور سرگودھا میں آپ تدریسی فرائض ادا
 کرتے رہے۔ سرگودھا کے ضلع بننے اور دفاتر یہاں منتقل ہونے پر محمد حسین شوق ڈسٹرکٹ انسپکٹر آپ
 سکولز کے دفتر میں آ گئے۔ جہاں سے ۱۹۵۹ میں ریٹائرمنٹ لی لیکن پھر آپ کو بلا لیا گیا۔ جبکہ دوسری
 بار ۱۹۶۲ء اور آخر کار ۱۹۶۳ء میں ریٹائر ہو گئے۔ سات سال مزید زندہ رہے اور ”۱۷ مئی ۱۹۷۱ء بروز

پیر اس عالم فانی سے عالم جاودانی کا رخ کیا۔ آپ کی لوح مزار پہ یہ شعر درج ہے۔
 ”تیری زندگی اک شمع ہے اک نور نورِ ازل سے ہے
 اسے موت بھی نہ بجھا سکی جو چراغ تو نے جلا دیا“ ۷۰

آپ کی وفات پر شعرا نے اپنے اپنے دکھ کا اظہار شعروں کی صورت میں بھی کیا۔ نصرت
 چوہدری نے کہا۔

آنسو اتر کے کون و مکاں سے چلا گیا اک روشنی کا پھول یہاں سے چلا گیا
 قدیلِ فکر و نور ادب کا چراغ شوق کہتے ہیں لوگ آج یہاں سے چلا گیا
 محمد حسین شوق نے سرگودھا میں جو ہر نظامی، انگریز سردی اور پھر انور گوئندی کے ساتھ مل
 کر شعر و سخن کی صرف یادگار محافل ہی ترتیب نہیں دیں بلکہ ادب کا وہ پودا لگایا جو آج تناور درخت بن
 چکا ہے اور جس کے سب پتے ہرے بھرے ہیں۔ آپ کے بھائی راز گجراتی لکھتے ہیں کہ:
 ”میرے بھائی کے سینے میں حقیقی عشق کی آتش خوابیدہ تھی۔ جو
 کبھی کبھی بھڑک اٹھتی اور شعلہ زن ہو جاتی تو با آواز بلند مستانہ و ارا لحق کا نعرہ

لگاتے کہ زمین ہل جاتی اور گرد و نواح کا ماحول منور ہو جاتا“۔ ۷۱

جب ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں دل کی بات لگتی ہے اور اس میں عشق
 کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مجذوبیت کی کیفیت میں کہے ہوئے اشعار اور عشق میں ڈوب کر لکھے ہوئے
 حروف کا رنگ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسے لمحات میں فکر کے آسماں پر ابھرے ہوئے الفاظ نمایاں
 ہوتے ہیں۔ یہ عالم اگرچہ خود کلامی کا ہوتا ہے لیکن اپنے احتساب کا بھی ہوتا ہے اس وقت میں میں
 نہیں رہتا تو ہو جاتا ہے اور جب تو کا لہجہ ہو تو بات یہ نکلتی ہے۔

نگاہ پاک نہیں دل بھی پاکباز نہیں کہ تیرے قلب و نظر آشنائے راز نہیں
 ہیں تیرے قلب و نظر میں بتانِ یاس و الم سرورِ غزنوی و شوخیِ ایاز نہیں
 مقامِ عشق و ہوس میں کچھ امتیاز نہیں قہیلِ حسن نہیں تو شہیدِ ناز نہیں

حقیقتِ ابدی شہدِ مجاز نہیں ترے جنوں کا ابھی سلسلہ دراز نہیں
 ادائے فقر نہیں خوئے دلنواز نہیں سرورِ جذب و محبت کا سوزِ ساز نہیں
 جہانِ سود و زیاں میں تو بے نیاز نہیں یقینِ کار کشائی بھی کار ساز نہیں
 جنوں شوق نہیں جوشِ جانگداز نہیں
 فروشِ عشق نہیں سجدۂ نیاز نہیں“ ۵۲

دعائے مسلم

اے حامی و ہمدردے، اے چارۂ ہر دردے
 بازوئے مسلمان میں پھر قوتِ حیدر دے
 دل دے جو محبت میں اسلام کی مٹ جائے
 شمشیر عطا کر وہ جو شرک مٹا ڈالے
 پھر اپنے مسلمان کو دے تختِ مسلمانی
 اسلام کے لشکر کو پہلے سے بہادر دے
 گل ہائے تمنا سے دامن کو مرے بھر دے
 جو کفر کے خیبر کو پھر زیرو زبر کر دے
 الفت میں محمدؐ کی کٹ جائے جو وہ سردے
 کفار کے سینوں سے ہو پار وہ خنجر دے
 پھر شوکتِ دارا دے پھر تختِ سکندر دے
 فاروق دے خالد دے اور حیدر و صفدر دے
 بس شوقِ شہادت دے ایمان کی دولت دے
 دینا ہے اگر کچھ تو یہ ایزدِ برتر دے ۵۳

عبدالغنی ناز

عبدالغنی نام اور ناز تخلص تھا۔ آپ موضع پیل تحصیل خوشاب ضلع شاہ پور میں جنوری ۱۹۰۵ء
 میں جناب کالے خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد فارسی فاضل کا
 امتحان پاس کیا اور محکمہ تعلیم میں ”ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ ذاتی قابلیت کی بنا پر
 بعد ازاں آپ کو ایس وی کی خصوصی سند دی گئی۔“ ۵۵

عبدالغنی ناز ابتداء سے ہی اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیم کی طرف راغب تھے۔ اور ان دنوں مضامین کا وسیع مطالعہ کیا۔ چونکہ آپ کو فی البدیہہ شعر گوئی میں بھی ملکہ تھا۔ اس لئے اکثر بات چیت میں بھی شعر موزوں کر لیا کرتے۔ تدریس سے وابستگی کے دوران ہی آپ کی تین کتابیں ”اسوۂ حسنہ“، ”سیرت فاروق“ اور ”صدیق اکبر“ شائع ہو چکی تھیں۔ ”اسوۂ حسنہ“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر منظوم مجموعہ اور ”سیرت فاروق“ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اخلاق کا مجموعہ ہے۔ جبکہ ”صدیق اکبر“ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کے خاص خاص واقعات کو منظوم کیا گیا ہے۔ بالترتیب ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۲ء میں یہ کتب شائع ہوئیں۔ قاضی عبدالرحمن پی ای سی درجہ اول انسپکٹر آف سکولز لکھتے ہیں۔

”عبدالغنی ناز صاحب کا انتخاب موضوع کوئی نیا نہیں لیکن انہوں

نے اپنی کوشش اور محنت سے مضمون کتاب کو اس جدت سے پیش کیا ہے کہ طبیعت داد دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ شاعر نے اپنے فن کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی زندگی کے حسین کردار دلپذیر طریقہ سے پیش کر کے اپنے قارئین کو ان کی تقلید کی دعوت دی۔“ ۷۱

عبدالغنی ناز ساٹھ سال کی عمر پر جنوری ۱۹۶۵ء میں جب ریٹائر ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات پر کتاب ”ذوالنورین“ کے عنوان کے تحت لکھ رہے تھے۔ ۷۲ آپ خوش اخلاق اور ملنسار ہونے کے علاوہ خوش مذاق اور بہت ذہین تھے۔ آپ کی نظم ایک مخصوص دلپذیری، خلوص و عشق، دینی و دنیوی فلاح کا جذبہ اور ایمان و عمل کی راہیں تلاش کرنے کے لئے ایک روشنی ہے۔

عبدالغنی ناز جب ریٹائر ہوئے تو گورنمنٹ مڈل سکول پدھراڑ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بقول محمد صفدر خان ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً ۱۱ سال زندہ رہے اور ۱۹۷۶ء کے لگ بھگ وفات پائی۔ آپ کو اپنے آبائی گاؤں پیل میں ہی دفن کیا گیا جہاں آپ رہائش پذیر تھے۔ ۷۸

لیکن اس سلسلے میں پیل کے عبدالرشید نائی سے جب میری بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ ناز صاحب تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں ۱۹۸۹ء یا ۱۹۹۰ء میں پیل میں فوت ہوئے۔ ۸۹ عبدالرشید نائی کی بات میں اس لئے بھی وزن ہے کہ آپ کی تخلیقات ۱۹۷۶ء کے بعد بھی مفت روزہ ہلال راو پنڈی میں شائع ہوتی رہیں۔

اولیاتِ صدیق

جناب حضرت صدیق میں وہ کیا بڑائی تھی وہ کیا ایسی فضیلت تھی وہ کیا ایسی اچھائی تھی وہ کیا ایسی کشش تھی کون سی وہ جاذبیت تھی کہ جس کی رُو سے ہر موقعہ پہ ان کی اولیت تھی ہیں جتنے نامور کیوں ان کا سب سے نام بالا ہے تھے جتنے شان والے سب سے اُن کی شان اعلیٰ ہے رسول اللہ نے اُن کو بنایا کیوں امام اپنا کیا پہلے پہل یک جا کلام پاک انہوں نے کیوں نبوت کا کیا اعلان جب ہادی برتر نے ملی پہلی خلافت کیوں انہیں اس کا سبب کہیئے نہیں ملتی کسی کو یونہی مختاری و سرداری یہ عزت اُن کو دلوائی محمدؐ کی اطاعت نے یہ آقائی انہیں بخشی محمدؐ کی غلامی نے محمدؐ کی نگہ ہر چیز پر تاثیر کرتی ہے محمدؐ وہ غلاموں کو عطا کی جس نے سلطانی

وہی ہاں ہاں وہی جو بے سہاروں کا سہارا تھا

وہ جس نے اک نظر سے سارے عالم کو سنوارا تھا۔ ۹۰

چودہ اگست (۱۹۷۹ء)

یہی وہ دن ہے جب قلت نے کثرت کو جھکایا تھا خدا والوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا

اسی دن ہی غلامی کی کٹیں صد سالہ زنجیریں اسی دن قوم نے اپنی بدل ڈالی تھیں تقدیریں
 نہتوں نے اسی دن اک بڑا میدان مارا تھا فقط اللہ کا تکیہ تھا، قائد کا سہارا تھا
 اسی دن کفر کے ظلمت کدے چُن چُن کے ڈھائے تھے یہ وہ دن ہے کہ طوفاں میں دیئے ہم نے جلائے تھے
 یقین و اتحاد و ضبط پر کر کے عمل ہم نے گرائے صبر سے سب جبر کے اونچے محل ہم نے
 خدا نے دی ہزیمت آج ہی منصب پرستوں کو کیا غالب اسی دن معجزانہ زیر دستوں کو
 خزاں کا دور تھا جب جھوم کر فصل بہار آئی دے پاؤں اسی دن رحمت پروردگار آئی
 یہی وہ دن ہے جب بخشا گیا اپنا وطن ہم کو قفس میں چھوٹے ہی مل گیا دلکش چمن ہم کو
 فضا پر ہول بھیگی رات تھی، گہرا اندھیرا تھا
 کہ زریں تاج پہنے صبح آئی اور سویرا تھا ۱۹

عطا بلوچ

عطا محمد خان اور عطا تخلص تھا۔ آپ ۲۶ جنوری ۱۹۰۵ء کو ساہیوال ضلع سرگودھا میں پیدا
 ہوئے۔ خالصہ مڈل سکول اور پھر گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال سے تعلیم حاصل کی۔ آپ کے والد شبیر
 خان پولیس میں ملازم تھے لہذا اولاد کو بھی انہوں نے پولیس میں بھرتی کروایا۔
 عطا محمد خان ۱۹۲۳ء میں اے ایس آئی بھرتی ہوئے اور پندرہ سال تک راولپنڈی کے
 مختلف علاقوں میں خدمات انجام دیتے رہے۔ انسپکٹر کے عہدے پر ترقی پائی تو آپ کا تبادلہ رہتک کر
 دیا گیا۔ جہاں سے کچھ عرصہ بعد پھر مغربی پنجاب میں خدمات سونپی گئیں۔ سیالکوٹ میں تھے کہ
 ۱۹۶۳ء میں آپ کی مدت ملازمت پوری ہو گئی اور آپ ڈی ایس پی کے عہدے سے پنشن یافت
 ہوئے۔ آپ کے بھائی عبدالغفور خان بھی ڈی ایس پی ریٹائر ہوئے۔

عطا محمد خان عطا بلوچ نے ریٹائرمنٹ کے بعد ساہیوال میں ہی رہائش رکھی۔ جہاں آپ
 نے ادنیٰ محفلوں کی ابتدا کی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں نعت گوئی اور نعت خوانی کو

آپ نے پروان چڑھایا۔ آپ نے ساہیوال میں عید میلاد النبیؐ کے جلوسوں کی بنیاد رکھی۔ چونکہ فرصت ہی فرصت تھی۔ ہر روز ادبی لوگوں کا اٹھنا بیٹھنا آپ کے پاس ہوتا تھا۔ لاہوری گیٹ کے باہر شام کو ایک محفل بھی ہوتی اور سننے سنانے کا شغل ہوتا۔ ۹۲

آپ نے اگرچہ بہت لکھا لیکن آپ کا کلام محفوظ نہیں رہا۔ ۱۹۸۴ء میں آپ حیات تھے۔ کیونکہ ”جانِ رحمت“ کے لیے اخلاقِ عارف کو آپ نے خود فارم پُر کر کے دیا تھا۔ البتہ آخری عمر میں بیماری نے زور پکڑ لیا تھا اور اسی حالت میں وفات پائی۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ۱۹۸۵ء یا ۱۹۸۶ء میں وفات پائی ہوگی۔ ۹۳

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

محمدؐ کو پیدا خدا گر نہ کرتا قسم ہے خدا کی خدائی نہ ہوتی
ہمارے گناہوں پہ یہ پردہ پوشی محمدؐ نہ ہوتے رہائی نہ ہوتی
بھلائی کا موجب ہے وہ ذاتِ عالی وہاں جہاں میں بھلائی نہ ہوتی
خدا کو نہ پہچانتی نسلِ آدم محمدؐ کی گر رہنمائی نہ ہوتی

ہوئی نعت تیری عطا ہے وگر نہ

مقدر میں اتنی بڑائی نہ ہوتی ۹۴



محمدؐ کے صدقے میں قربان جاؤں جو لاکھوں کروڑوں اداؤں کے قابل
یہ محشر میں، کہہ کر، عطا کو چھڑایا یہ فٹ ہے ہماری نگاہوں کے قابل



میں توبہ کر چکا تھا مگر کیا کروں عطا اک شکل خوش نما پہ طبیعت مچل گئی ۹۵



تو جہاں چلے تیرے ہر قدم پہ گلابِ عطر میں چھڑک دوں
کہ خدا کا بندہ تو ہے عطا پہ ترے لیے میں عطار ہوں ۹۶

فراق کنگروی

فراق کنگروی کا اصل نام طفیل محمد خان تھا۔ ”آپ یکم اپریل یا ۳۰ مارچ ۱۹۰۵ء کو موضع گنگرہ چووالا تحصیل و ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے ۱۹۰۷ء۔“ آپ کے والد کا نام جھنڈو خان تھا۔ آپ نے میٹرک کا امتحان ڈی اے وی ہائی سکول جالندھر سے پاس کیا اور پھر ایف اے کی سند ڈی اے وی کالج جالندھر سے حاصل کی۔ ڈی اے وی کالج اس دور میں علمی اور ادبی دونوں حوالوں سے بہت معروف تھا اور یہاں سے کئی لوگ نکلے جو بعد میں ادب میں معتبر حیثیت کے مالک ٹھہرے۔

طفیل محمد خان فراق نے ایف اے کے بعد ڈی سی آفس جالندھر میں ملازمت اختیار کر لی ۱۹۳۷ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو آپ نے پاکستان کے حق میں اپنا ووٹ دیا یوں آپ کا تبادلہ جالندھر سے ڈی سی آفس سرگودھا ہو گیا۔ جہاں آپ نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ملازمت کے سلسلے کو جاری کیا۔ ان دنوں چونکہ پچپن سال کی عمر سرکاری ملازمتوں سے ریٹائرمنٹ کی مقرر تھی لہذا آپ نے ۱۹۶۰ء میں ہیڈر جسریشن کے عہدے سے پینشن پائی۔

فراق کنگروی نے کالج کے زمانے میں شعر کہنا شروع کیا اور مختلف اخبارات و رسائل میں شائع بھی ہونے لگے۔ قیام پاکستان پر جب ہجرت کی تو باقی سامان کے ساتھ شعری اثاثہ بھی وہیں چھوڑنا پڑا۔ سرگودھا میں آ کر ملازمت کے جھمیلوں میں مصروفیت کے باعث بہت کم لکھا جو ایک ڈائری میں محفوظ کر لیا جس پر یکم جولائی ۱۹۷۳ء کی تاریخ تحریر ہے۔ اس ڈائری میں نظمیں اور غزلیں درج ہیں۔ نظمیں زیادہ تر وطن کے حوالے سے ہیں۔ آپ کے بیٹے پروفیسر عبدالقیوم رانا نے آپ کے کلام کو ترتیب دے کر ”تفکراتِ فراق“ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

آپ نے ۲۲ جنوری ۱۹۸۷ء کو ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی اور سرگودھا میں ہی دفن

ہوئے ۹۸ آپ کے ورثے کا میں آپ کا بیٹا پروفیسر عبدالقیوم صاحب کتاب شاعر ہے۔

آپ نے ۸ جون ۱۹۵۰ء کو جالندھر میں اپنے ایک دوست چوہدری مولارام ہیڈ ٹریڈری کلرک کو ایک منظوم خط لکھا۔ اس خط میں وہاں کی زندگی، ہجرت کی وجہ اور پاکستان میں خاندان کے قیام نیز سرگودھا کے حالات کے علاوہ یادوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اگرچہ آپ کی پوری ڈائری میرے سامنے ہے لیکن اس خط کا انتخاب شاید حالات سے بہتر آگاہ کر سکے اور ان کی شاعری پر بھی انداز اور اسلوب کے حوالے سے سوچنے کا موقع مل سکے۔ مزید ان کی زود گوئی کا بھی اندازہ ہو سکے۔

منظوم خط بنام چوہدری مولارام ہیڈ ٹریڈری کلرک جالندھر

نہ پوچھو جب سے چھوٹا آشیاں ہے ہوا تاریک آنکھوں میں جہاں ہے
بہار آئی خزاں کو ساتھ لے کر ہوا تاراج جس سے گلستان ہے
ہم آہنگوں نے ہم کو خار سمجھا کہا ”ان کا وجود اب یا گراں ہے“
چمن والوں کے اُف ظلم و تشدد ابھی تک زیر لب نالہ نہاں ہے
نکالا جس طرح گلشن سے ہم کو ذرا ڈھونڈو نظیر اس کی کہاں ہے؟
اٹھا کر پھینکا یوں باہر وطن سے مریض اک دانت جیسے در وہاں ہے
پلے تھے گود میں صدیوں سے جس کی وہ بھارت ماتا اب سوتیلی ماں ہے
ہوئے بے گھر اعزا سارے بکھرے کوئی لاہور کوئی مولتاں ہے
کوئی رکھتا ہے لائلپور رہائش کسی کا منگھری میں مکاں ہے
نہ مونس پاس ہے کوئی نہ غم خوار طفیل اب یوسف بے کارواں ہے
نہ خوش ہوں سامعین یہ نظم سن کر حقیقت میں یہ غم کی داستاں ہے
لو صاحب پھر ملیں گے اب اجازت گزر دل پر رہا گرچہ گراں ہے

اکٹھے ہو کے پھر ہم ہم نوا ہوں

دعا کرتا فراقِ خستہ جاں ہے ۹۹

غزل

ہوا ہے میکدہ ویران ٹوٹے پیمانے تھے رند جس کے جہاں پھر میں جانے پہچانے
 اگرچہ ہوش ہے توہین بے خودی لیکن ہوں آیا ہوش میں ساقی کو ہوش میں لانے
 ہمارے قتل کا منصوبہ سوچا سمجھا تھا تھے بٹتے آرہے مدت سے تانے اور بانے
 پرانی بزم میں اُس نے ہمیں ذلیل کیا کیے جو فیصلے غیروں کی شہ پہ من مانے
 ہماری دیکھ کے رسوائی برسرِ محفل چراغ گھی کے جلائے گھروں میں اعدانے
 بنے یگانے بھی بیگانے ندرتِ قدرت گلہ کیا اُن کا جو پہلے سے ہی تھے بیگانے
 فراق پہرے ہیں ہر سمت یاس و حسرت کے
 بدلنے پائیں یہ ایام کب خدا جانے

سید صوفی نقوی

خاندانِ سادات کے چشم و چراغ سید اقبال محمد صوفی نقوی ولد سید شاہنواز نقوی ۱۲ دسمبر
 ۱۹۰۵ء کو قصبہ ریحانہ کلاں ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ مقامِ پیدائش کے بارے ایک غلط فہمی
 جو پیدا ہو رہی ہے وہ یہ کہ ”سخنوران سرگودھا“ ۱۰۲۔ ”انہماک“ ۱۰۳ اور ”سید اقبال محمد صوفی نقوی کی
 شخصیت اور شاعری“ ۱۰۳ میں ”قصبہ اہرانہ کلاں“ رقم ہے۔ جو اہرانہ نہیں بلکہ ریحانہ ہے۔ آپ نے
 اسی گاؤں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اینگلورور نیکلر کا امتحان ”اینگلورور نیکلر خالصہ مڈل انگلش سکول“
 کالرہ ضلع جالندھر سے پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں ڈی اے وی ہائی سکول ہوشیار پور سے میٹرک کا امتحان
 پاس کرنے کے بعد انارکلی لاہور میں واقع مسلم بینک میں ملازمت اختیار کر لی۔ میٹرک کرنے کے
 دو سال بعد پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے منشی فاضل کیا۔ اور اگلے سال ہی
 ایف کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۰ء میں آپ نے گریجوایشن اور ۱۹۳۲ء میں فارسی میں ایم اے کا امتحان
 پاس کیا۔ یہ تمام امتحانات بعد از میٹرک آپ نے پرائیویٹ طور پر پاس کئے۔ ایم اے فارسی کے

بعد ایم اوایل اور پھر ۱۹۳۶ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی ٹی کیا۔

سید صوفی نقوی نے ۱۹۲۶ء میں منشی فاضل کرنے کے بعد ڈل سکول راج پور بھائیاں میں عربی ٹیچر کی حیثیت سے شعبہ تدریس میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں آپ کا تبادلہ جالندھر ہو گیا۔ آپ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۴ء تک نتھانہ ہائی سکول میں بطور O.T رہے اور ۱۹۴۵ء میں انگلش ٹیچر مقرر ہو گئے۔ ۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو آپ نے ہجرت کی اور بھلوال کے نزدیک ڈی بی ڈل سکول سردار پورنوں میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے آپ کی تقرری ہوئی۔ اس کے بعد ضلع سرگودھا کے مختلف شہروں میں آپ فرائض ادا کرتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر بنا دیئے گئے اور ۱۱ اگست ۱۹۶۵ء کو ۶۰ سال کی عمر پر کٹھ سگھراں تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا کے ہائی سکول سے آپ نے ریٹائرمنٹ لی۔

سید صوفی نقوی نہم جماعت میں تھے جب شعر کہنا شروع کیا۔ اور فارسی کے ایک مشہور و معتبر شاعر جناب غلام قادر گرامی سے اصلاح لینے لگے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ بھلوال ضلع سرگودھا میں مستقلاً سکونت پذیر ہوئے۔ یہ تمام عرصہ آپ خاموشی سے اردو، فارسی، اور پنجابی زبانوں میں شعر کہتے رہے۔ یوں اپنی زندگی میں ”تاثرات“ (غزلیں)۔ ”انہماک“ (متفرق) ”ارادت“ (نعت)۔ ”فرش راہ“ (غزلیات)۔ ”تہذیب کاروگ“ (نظم)۔ ”نوید سعید“ (متفرق شاعری) اور ”خانیاں“ کے نام سے آپ کے شعری مجموعے تیار ہوئے۔ جبکہ ان تمام مجموعوں کا مجموعہ ”کلیات صوفی“ کے نام سے سامنے آیا۔ میری جب آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ کی عمر ۹۶ سال سے تجاوز کر چکی تھی اور آپ ابھی تک ادبی حوالے سے متحرک تھے جب کہ اس کے دو ماہ بعد یعنی ۲۳ مارچ ۲۰۰۲ء کو اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

آپ کی شاعری میں ہمیں مختلف ادوار کے حوالے سے اتار چڑھاؤ دکھائی دیتا ہے لیکن آپ چونکہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مذہبی سکالر اور جید عالم تھے لہذا آپ کی وہ پاکیزہ سوچ ہمیں آپ کی شاعری میں بہت زیادہ ملتی ہے۔ لیکن جب غزل کہی تو غزل کی لاج رکھنے

کی بھی پوری کوشش کی ۔

غزل

دل ہے مایوس تمناؤں کا گویا مرگھٹ ایک سنان سا برباد سا غم کا مرگھٹ
 مردہ جذبات پہ اک ہو کا ہے عالم طاری ایک خاموش، بھیا تک، نہیں دیکھا مرگھٹ
 دل ویراں کا ہے اب ایسا بھیا تک منظر کبھی دیکھا نہ سنا ہم نے تو ایسا مرگھٹ
 میری بے تاب تمناؤں کا مرقد ہے یہاں کیا کبھی تو نے ذرا آ کے بھی دیکھا مرگھٹ
 یہ وہ دل ہے جو کبھی شوق کی جولانگہ تھا اب وہی دل ہے کہ ہے یاس و الم کا مرگھٹ
 تیری الفت سے تھا دل ہم نے تو آباد کیا وائے تقدیر کہ وہ بن گیا الٹا مرگھٹ
 شمع کی بزم میں پروانے چلے، ڈھیر ہوئے جلوہ گہ حسن کی بھی بن گئی گویا مرگھٹ
 حسرتوں آرزوؤں، ولولوں کا ہے مدفن
 دل نہیں صوفی کا ہے ایک طرح کا مرگھٹ ۱۰۶

ادیب، ادب اور ساقیء ادب نواز

ادیب

ادیب زخمہ زین سازِ فطرتِ خاموش ادیب نغمہ نواز و مغنی گل پوش
 نہ ہو یہ تو نہ ہو بزمِ سخن میں جوش و خروش کبھی نہ شاید معنی کہیں ہو جلوہ فروش
 جہاں تمام ہو بے خود سکوت سے مدہوش
 تمام دہر کی نیرنگیاں بھی ہوں روپوش

ادب

ادب کی چاشنی جب لا جواب ہو جائے تو دل نواز جہانِ خراب ہو جائے
 یہ تلخ کامی دوراں شراب ہو جائے جو زہر گھولیں تو وہ شہد ناب ہو جائے
 ممت میں بھی وہ رنگِ حیات بھر ڈالے
 وہ بے ثباتی کو بھی باثبات کر ڈالے

ساقی ادب نواز

ادب فروز نگاہیں ادب نواز کلام ادب نواز ہے ساقی ادب سے پُر ہے جام
 ادیب شوق سے پی لیں یہاں مئے گلغام مئے ادب کی ہے اس بزم میں صلائے عام
 تری نگاہ کا ساقی یہ فیض عام رہے
 جدھر نگاہ پھرے اس طرف ہی جام رہے



حقیر آستانی

کیثور چندرسین نام اور حقیر آستانی اُن کا ادبی حوالہ ہے۔ انہوں نے میانی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا میں جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم میانی میں حاصل کی۔ بعد ازاں بھیرہ سے تحصیل عالم کے بعد کالج سرگودھا میں داخلہ لیا۔ لیکن تقسیم ہند کے باعث اس خطے کو چھوڑنا پڑا۔ اور مزید تعلیمی سفر سینٹ زیورس کالج بمبئی میں جاری کیا۔ جہاں سے عمدہ کارکردگی کی بنا پر ڈاکٹر سر محمد اقبال اردو سکالر شپ کے علاوہ کئی انعامات حاصل کئے۔ بمبئی یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا۔ اس دوران بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث کئی اعزازات حاصل کئے اور گولڈ میڈل کے حق دار بھی ٹھہرے۔ ایم اے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے امریکہ کا سفر کیا اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے واپس لوٹے:

”جناب حقیر آستانی نے سات سال بمبئی یونیورسٹی میں بحیثیت

پروفیسر اور دو برس شکاگو میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام

دیں۔ پانچ سال و سکونسن یونیورسٹی امریکہ میں ریسرچ سکالر بھی رہے۔

گیارہ سال تک ایشین ڈویلپمنٹ بینک (فیلڈ) میں سینئر ایگزیکٹو کے

عہدے پر خدمات انجام دیں اور وفات تک عالمی بینک میں کنسلٹینٹ

رہے۔ مختصر علالت کے بعد اپریل ۱۹۸۹ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔“ ۱۰۸
 ڈاکٹر کیشور چندر سین حقیر آستانی نے معاشیات پر جہاں متعدد کتب تحریر کیں وہاں اردو
 اور انگریزی میں آپ کی شاعری کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں ”افکار گریزاں“ اور
 ”خبط و ضبط“ آپ کے شعری مجموعے ہیں۔

ایک خوش نظر گیت

پیار کی پاگل ہواؤں پر سوار
 گنگنائے گی امنگوں کی پھوار
 چٹکیاں بھر بھر کے اٹھے گا خمار

بج اٹھے گا سازِ دل کا تار تار
 رنگ و بو کی ہوں گی ہر سوتیزیاں
 بے محابہ، بے دھڑک، دیوانہ وار
 دھڑکنوں کی ہوں گی ہم آغوشیاں
 اور بڑھ جائے گا ہر شے کا وقار
 جھوم اٹھیں گی حسرتوں کی ڈالیاں
 ہر طرف ہوگا جوانی کا نکھار
 وسعت افلاک پر چھا جاؤں گا
 ہوگا دو عالم پہ میرا اختیار
 اپنی محنت کا ثمر مل جائے گا
 گر رہا گرم سفر مل جائے گا
 میری دنیا میں بھی آئے گی بہار
 شوق کے خوشے، خوشی کی بالیاں
 میری دنیا میں بھی آئے گی بہار
 اک نئے انداز میں سرگوشیاں
 میری دنیا میں بھی آئے گی بہار
 اک اسی امید پر سب کچھ نثار
 میں دنیا میں بھی آئے گی بہار ۱۰۹

غزل

آرزوں کا دل مضطر میں خاکہ ہی رہا رنگ بھرنا آرزوؤں میں کرشمہ ہی رہا
 کچھ نہیں ہوتا اچانک عالم امکان میں جو نظر آیا وہ اکثر بے تحاشہ ہی رہا
 منزلیں ذوقِ طلب کی راہ میں تھیں بے شمار ہم سفر ذوقِ طلب کا دورِ جادہ ہی رہا
 دیکھتے ہی دیکھتے عمر دو روزہ ڈھل گئی اور جینے کا ارادہ بس ارادہ ہی رہا
 زندگی کو بارہا ہم نے سنوارا تھا حقیر
 جانے کیوں کر ایک گوشہ محوِ گریہ ہی رہا ۱۱۰

راجا علی گوہر

راجہ علی گوہر ۱۸۔ اپریل ۱۹۰۶ء کو شاہ پور صدر جو کہ اس دور میں ضلعی ہیڈ کوارٹر بھی تھا میں پیدا ہوئے۔ وہیں سے مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد J.V کی سند حاصل کی اور سکول میں مدرس ہو گئے۔ شاہ پور صدر نے پہلوان بھی پیدا کئے ہیں اور اکھاڑہ وغیرہ ایک زمانے میں پہلوانوں کے زور کی جگہ ہوتی تھی۔ راجہ علی گوہر بھی ان پہلوانوں میں سے تھے جو شاہ پور صدر نے جنم دیئے۔ راجہ علی گوہر، جو ہر نظامی وغیرہ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ آپ کا عہد بھی ایک ہی ہے۔ جن دنوں جو ہر نظامی سرگودھا میں تھے تو آپ کا تبادلہ بھی سرگودھا میں ہی تھا۔ اور ادبی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ لیکن آپ ان لوگوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے جو لکھا شاید وہ محفوظ نہیں رہا۔ ۱۹۶۶ء میں آپ ایم سی پرائمری سکول بلاک نمبر ۲ سے ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور پھر کچھ عرصہ بعد آپ جھنگ چلے گئے۔ جہاں ڈھلتی عمر کے اثرات تھے یا دل برداشتی کا عنصر تھا کہ دل اچاٹ ہو گیا اور ادبی حلقوں سے بالکل کٹ گئے۔ جب تک آپ سرگودھا میں رہے ادبی حلقوں میں پہچان بن کر رہے۔ آپ کی خدمات کو ادبی سرگرمیوں کے انعقاد کے سلسلے میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جھنگ میں خدا جانے کیا ہوا۔ یہ سب کچھ پردہ راز میں ہے اور پھر ایک عرصہ تک علیل رہنے کے بعد اپریل ۱۹۹۱ء

میں آپ نے وفات پائی۔“ ۱۱۲

محمود اسیر آپ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

”راجہ علی گوہر کے ہاں سوزِ جنوں اور سوزِ محبت کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کے کلام میں مسرت و انبساط اور فرحت و شادمانی کے مضامین بمشکل ہی نظر آئیں گے۔ انداز بیان ان کی شاعری کا ساتھ نہیں دیتا۔ ان کی غزل اندرونی و بیرونی کرب اور سوز و گداز میں ڈوبی ہوتی ہے۔ وہ اپنے زخموں کا علاج خود کرنا چاہتے ہیں۔ طبیعت میں بے نیازی ہے۔ کسی کی ہمدردی کے خواہاں نہیں۔ انہوں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ اور اب وہ اس دنیائے رنگ و بو سے دور بہت دور اپنے باقی ماندہ ایام عزت کے ساتھ بسر کرنا چاہتے ہیں۔“ ۱۱۳

اور یہی ہوا کہ اپنے ماضی سے دور جا کر بس گئے۔ جہاں ان کی کوئی پہچان نہیں تھی۔ راجہ علی گوہر جو سرگودھا کی ادبی فضا میں سرگرم رہا کرتا تھا۔ گمنامی کی زندگی گزار کر اپنے اصل ٹھکانے جا پہنچا۔ سخنوران سرگودھا میں آپ کا جو کلام پیش کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

غزل

قفس رسیدہ نے یوں ماتم بہار کیا جگر کے خون سے زنداں کو لالہ زار کیا
مری وفاؤں کا محفل میں تذکرہ کر کے مجھے حضور نے بے وجہ شرمسار کیا
خرد نے ادھ کھلی کلیوں کے پیرہن نوچے جنوں نے اپنے ہی دامن کو تار تار کیا
یہی کہا کہ مجھے آپ سے محبت ہے بڑے طویل فسانے کا اختصار کیا

سکون مل تو چکا تھا جنوں میں اے گوہر

کسی کی یاد نے پھر مجھ کو بے قرار کیا! ۱۱۳



ترے تیر نظر کا جو ہمیں گھائل سمجھتے ہیں وہ کیا جانیں کہ ہم اس کو بھی اک منزل سمجھتے ہیں
 ذرا ٹھہرو چرالوں زندگی ان مست آنکھوں سے تعصب سے جنہیں اہل جہاں قاتل سمجھتے ہیں
 سنا ہے ان کی محفل میں مرا بھی ذکر ہوتا ہے خدا کا شکر ہے مجھ کو وہ اس قابل سمجھتے ہیں
 یہ خواہش ہے تمہاری یاد سے غافل نہ ہو جائیں تمہاری یاد کو ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
 جو طوفانوں سے گزرے ہوں جو منجد ہاروں سے کھلے ہوں وہ طوفانوں کو منجد ہاروں کو بھی ساحل سمجھتے ہیں
 حقیقت میں محافظ زندگی کی موت ہے اے دل یہ وہ نکتہ ہے جس نکتے کو اہل دل سمجھتے ہیں
 پنپ سکتے نہیں وہ لوگ دنیا میں کبھی گوہر
 جو اپنی راہ میں ذرے کو بھی حائل سمجھتے ہیں ۱۱۵

سید وزیر شیرازی

شاعر اہل بیت سید وزیر حسین شیرازی ۱۹۰۶ء ۱۱۶ھ میں شاہدرہ (لاہور) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید سردار علی شیرازی جو گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ شاہدرہ میں ہی مقیم تھے۔ سید وزیر شیرازی تعلیم کے حصول کے بعد اگرچہ والد کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگ گئے۔ لیکن ان کے اندر ایک آرٹسٹ اور خوش نویس جو بیٹھا تھا اس نے انہیں اپنی جانب کھینچ لیا۔ انہوں نے بڑے شوق سے خوشنویسی سیکھی۔ اسے اپنایا اور ملک کے بہترین کاتبوں میں شمار ہونے لگے۔ آپ ۲۴ سال تک خوشنویس ایسوسی ایشن آف سرگودھا کے صدر رہے۔
 شیخوپورہ سے آپ کا خاندان امرتسر میں رہائش پذیر ہو گیا تھا اور جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو آپ نے ہجرت کی اور سرگودھا آ کر آباد ہوئے۔

سید وزیر شیرازی ۱۹۳۸ء میں ادب کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ فارسی آپ کی مادری زبان تھی۔ پنجاب میں رہائش پذیر تھے بلکہ والد بھی پنجابی تھے۔ اردو کو قومی زبان کے حوالے سے سیکھا اور پانچ سال کا عرصہ آپ نے افریقہ میں بھی کاروباری سلسلے میں گزارا تھا وہاں کی زبان بھی

سیکھ لی تھی۔ یوں آپ کئی زبانوں کے ”جانو“ تھے۔ خوشنویسی کو بطور پیشہ اپنانے سے پہلے کچھ عرصہ پولیس میں بھی آپ نے ملازمت کی تھی۔

سید وزیر شیرازی کو شاعری کا شوق اپنے تایا سید جیون شاہ شیرازی اور چچا سید اکبر شاہ کے باعث پیدا ہوا۔ وہ اپنے وقت کے اچھا شعر کہنے والوں میں شامل تھے۔ سو آپ نے اصلاح بھی اپنے تایا اور چچا دونوں سے لی۔ ۱۱۷

”وزیر شیرازی مرحوم ایک بامروت اور خلیق انسان تھے۔ ان کی زندگی میں ان کی بیٹھک پر شاعروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ہر شام ایک محفل اور ہر دن ایک ہنگامہ ہوتا تھا۔ آپ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ آخری عمر میں حافظ یوسف آزاد سے آپ کا انس بڑھ گیا تھا۔۔۔“ ۱۱۸

سید وزیر شیرازی چونکہ مرثیہ اور سلام کے شاعر تھے لہذا ان کی پرکھ مرثیہ نگاری کے حوالے سے ہی ہو سکتی ہے۔ آپ کے شعری مجموعہ ”خیابان نجات“ میں حمد اور نعت کے علاوہ سلام، قصیدہ، منقبت اور مرثیہ شامل ہے۔ جس میں عشق خانوادہ رسول اور غم حسین کی واضح تصویر نظر آتی ہے۔ پروفیسر ہارون الرشید تبسم کے مطابق:

”ان کے مرثیہ میں کردار نگاری، جذبات نگاری اور واقعہ نگاری ان کی فنی خوبیوں کا منہ بولتا اظہار ہے۔ ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت سادگی ہے۔ دلکش تشبیہات و استعارات نے ان کی سادہ شاعری کو حسن معانی کا خزینہ بنا دیا ہے۔“ ۱۱۹

سید وزیر شیرازی نے خوشنویسی میں اپنی جو روایت قائم کی تھی وہ اپنے بچوں کو بھی منتقل کی۔ لیکن شاعری شاید آگے پاس کرنے میں ناکام رہے۔ ابتداء میں انہوں نے غزل بھی کہی لیکن اس غزل میں بھی نعت اور منقبت کا وافر حصہ شامل ہوتا۔ غالب کی کچھ غزلوں کا پنجابی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ مشاعروں میں اپنی آواز سے سحر طاری کر دیتے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی حسین یادیں

چھوڑ کر ۲۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو سرگودھا میں عدم کو سدھا رکھے۔

سلام

ولائے سبطِ پیبرِ گلے لگا کے چلے چلے جہاں سے تو ہم زندگی بنا کے چلے
 قدم قدم پہ چمن در چمن کھلا کے چمن ہم اس ادا سے چراغِ وفا جلا کے چلے
 کہا یہ ماں نے جو اصغر کو شاہ اٹھا کے چلے چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے
 اسی کو عارفِ عزمِ حسینؑ کہتے ہیں جو قتل گاہ میں بے خوف سر اٹھا کے چلے
 وہ لوگ مر کے بھی زندہ ہیں بزمِ ہستی میں غمِ حیات کو جو آئینہ دکھا کے چلے
 یہ زندگی کا سلیقہ بتا گئے ہیں حسینؑ کہ سر بلند وہی ہے جو سر جھکا کے چلے
 نگاہ بانِ شریعت اسی کو کہتے ہیں جو زیرِ تیغ بھی پیغامِ حق سنا کے چلے
 جنابِ فاطمہ زہراؑ نے رکھ لئے جن کر جو تیر سینہ شہیرؑ پر جفا کے چلے

تڑپ اٹھی نگہ رشک بر سرِ محشر

وزیرِ خلد میں جب ساتھ مصطفیٰؐ کے چلے ۱۲۰

غزل

گو میں شریکِ محفلِ اہلِ سخن نہ تھا لیکن مرے بغیر وقارِ چمن نہ تھا
 بے شک حسین اور بھی ہوں گے جہان میں میری نظر میں تجھ سا کوئی گلبدن نہ تھا
 چلتے رہے تو سامنے آتے رہے حجاب ٹھہرے تو زندگی کا کوئی پیرہن نہ تھا
 حق بات آخرش مرے منہ سے نکل گئی بے باک تھا ضرور دریدہ دہن نہ تھا
 آندھی کا زور دیکھتے ہی لڑکھڑا گئے وہ لوگ جن کے دوش پہ بارِ کفن نہ تھا
 بے نقش مٹ گئے ترے نقشِ وفا کے بعد دیکھا تو دل میں ایک بھی نقشِ کہن نہ تھا

جنت کی بو نہ ہو گی میسر اسے وزیر

دنیا میں جو غلامِ درِ پنجتن نہ تھا ۱۲۱

یونس حسین جھجھروی

محمد یونس حسین خان پورا نام ہے۔ آپ ۱۹۰۶ء میں جھجھر ضلع روہتک میں پیدا ہوئے۔ آپ پٹھان یوسف زئی خاندان کے ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے میٹرک تک اپنے قصبے میں ہی تعلیم حاصل کی اور پھر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ عظیم اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ آپ نے دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا۔ لیکن جونہی پاکستان کا قیام ممکن ہوا تو اپنی خدمات اس مملکت خداداد کو دے دیں اور پاکستان آرمی میں آ گئے۔ ایک طویل عرصہ فوج میں گزارنے کے بعد ۱۹۵۶ء کے لگ بھگ آئریری کیپٹن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کی خدمات کے صلے میں تمغہ خدمت درجہ اول اور تمغہ شجاعت سے بھی آپ کو نوازا گیا تھا۔ محمد یونس خان نے ۱۹۳۰ء میں شاعری کی ابتداء کی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اپنی پابندیوں اور مصروفیات کے باوجود اپنی فکر اور خیال کو استعمال کرتے رہے اور جب بھی کبھی موڈ بنا اظہار کے لئے شعر کو استعمال کیا۔ آپ صوفی تخلص کرتے تھے۔ اور یہ تخلص صرف نام کی حد تک نہیں تھا بلکہ آپ فطرتاً بھی صوفی تھے۔ اور آپ کی شاعری میں بھی آپ کی صوفیانہ فطرت کا عکس نظر آتا ہے۔ پاکستان آرمی میں ملازمت کے دوران ملک کے مختلف حصوں میں سفر کرتے رہے اور جب ریٹائر ہوئے تو مستقلاً سرگودھا کو اپنا مسکن بنایا اور یہیں ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء کو وفات پائی۔

آپ کی شاعری میں زندگی اور موت کا راز منکشف ہوتا دکھائی دیتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ درد و الم کے سائے مسکرا کر زندگی کو گلے لگا رہے ہیں۔ اور انسانی ذات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

غزل

وہ افق چمکی وہ صبح عیش کا منظر کھلا بادۂ خورشید چھلکا میکدے کا در کھلا
اب تری الفت کا پردہ ذرے ذرے پر کھلا ہر طرف اک اضطرابِ شوق کا دفتر کھلا
جستجو ان کی مجھے لائی ہجومِ عام میں میری تنہائی کا شیرازہ سرِ محشر کھلا

تیرا دیوانہ ہے کوئی یا جنوں کا قافلہ گرد چہرے پر پریشانی میں ڈوبا سر کھلا
 بدگمانی تجھ کو صوتی کی محبت پر ہے کیوں
 راز تجھ پہ کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا ۱۲۳



حسرتِ ناکام کا ہر گام مسکن دیکھ کر آنکھ بھر آئی ہے اکثر اپنا گلشن دیکھ کر
 چند تنکے اور وہ بھی اس طرح پھیلے ہوئے برق بھی حیرت زدہ تھی میرا خرمن دیکھ کر
 کس میں تاب دید ہے گر سامنے آؤ مگر اشتیاق دید بڑھ جاتا ہے چلمن دیکھ کر
 چوٹی سی دل پر لگی آنکھوں میں آنسو آگئے پھول مرجھائے ہوئے بالائے مدفن دیکھ کر
 اس لئے رکھی نہیں میں نے بنائے اشیاں بجلیاں تڑپا کریں گی میرا خرمن دیکھ کر
 آپ ہی تھے ایک جس کا دل پسچا ہی نہیں ورنہ دنیا رو پڑی تھی آہ و شیون دیکھ کر
 آپ نے پابندیاں صوتی پہ کیس عائد مگر
 دل بغاوت پر اتر آتا ہے قدغن دیکھ کر ۱۲۴

حاجی سلطان احمد سالک

سلطان احمد نام اور سالک تخلص جبکہ حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے بعد حاجی کو نام کا

حصہ بنا لیا:

”حاجی سلطان احمد سالک ۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کو نور پور تھل ضلع شاہ پور

میں پیدا ہوئے۔ گاؤں کے سکول سے ہی مڈل تک تعلیم حاصل کی اور ایس

وی کرنے کے بعد تدریس کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔“ ۱۲۵

سالک (مرحوم) کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ آپ کے والد میاں محمد اپنا تخلص جانی

کرتے تھے اور پورے نام سے یعنی میاں محمد جانی مشہور تھے۔ آپ اپنے وقت میں اپنے علاقے کے

صاحب علم اور عمدہ شاعر مانے جاتے تھے۔

سلطان احمد سالک چھٹی جماعت کے طالب تھے جب شعر کہنا شروع کیا اور اپنے والد سے ہی اصلاح لینے لگے۔ تعلیم اس دور میں آٹھ جماعت بھی بہت تصور کی جاتی تھی اس پر مستزاد تدریس کے شعبے سے منسلک ہونا۔ سو آپ نے مطالعہ کو کافی وسعت دی۔ آپ نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر لکھنا بھی شروع کر دی۔ آپ نے اردو اور پنجابی ہر دو زبانوں میں لکھا۔ اور بحیثیت ایک ادیب، ایک شاعر، ایک مصنف، ایک معلم اور ایک مبلغ کے اپنی پہچان اپنے علاقے میں بنائی۔ اپنے عہد کے کئی ایک رسائل میں آپ کی تحاریر شائع ہوئیں۔ آپ ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء کو ۶۰ سال کی عمر پر مدت ملازمت پوری کر کے ریٹائر ہوئے اور بعد میں سارا وقت خدمت اسلام اور تصنیف و تالیف میں گزارا۔ آپ کا معمول تھا کہ ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو اپنے آقا و ہادی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا میلاد شریف بڑے اہتمام اور محبت سے منایا کرتے تھے۔ اور شاید اللہ تعالیٰ کو یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اپنے محبوب ﷺ کے اس مبارک دن کی نسبت سے سلطان احمد سالک کی وفات اسی تاریخ کو یعنی ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ بمطابق ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ء کو واقع ہوئی۔ ۱۲۶۔ آپ کو اپنے قصبے میں ہی دفن کیا گیا۔

حاجی سلطان احمد سالک نے اپنے پیچھے بہت سے مسودات اور کلام چھوڑا جو ان کے بیٹے حاجی حافظ خطیب محمد رمضان کے پاس موجود ہے۔ آپ کے دو شعری مجموعے ”مخزن اشعار (حصہ اول) اور ”یاران نبی ﷺ“ شائع ہو چکے ہیں۔ جبکہ غیر مطبوعہ تصانیف کے نام درج ذیل ہیں۔ کلیات سالک (اردو پنجابی ۲ حصے)۔ گلزار سالک (۲ حصے)۔ نذر سالک۔ سالک کے دو ہڑے۔ رہنمائے سالک۔ سوانح محمد جانی۔ گلدستہ سالک۔ یادداشت حج۔ انتخاب سالک۔ کشلول سالک (۲ حصے)۔ بیاض سالک (۲ حصے)۔ راز حکمت (۲ حصے)۔ خطبات سالک۔ رحمت للعالمین۔ بارہ ماہ اسلامی۔

سالک کا مجموعی طور پر زیادہ کام نعت رسول مقبول ﷺ کے حوالے سے ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ تمام مسودات زمانے کی نذر ہو جاتے ہیں یا پھر پریس سے نکال کر انہیں محفوظ کرنے کا اہتمام کیا

جاتا ہے۔ نمونہ کلام میں نعت رسول مقبول ملاحظہ ہو۔

نعت

مبارک اہل عالم کو شفیع المذنبین آیا
گھٹائیں کفر و ظلمت کی جہاں پر چھا گئی تھیں جب
ہوا اسلام کا غوغا جہاں میں جن کے آنے سے
محافظ اس کا خالق ہے رہے گا تا قیامت یہ
حبیب اپنے کو ملنے کا خدا نے شوق فرمایا
شب معراج محبوب خدا جب عرش پر پہنچا
خدا نے یہ شرف بخشا بلایا اپنی قربت میں
احد احمد کے رازوں میں تجھے پڑنے سے کیا حاصل
ہوا ارشاد باری رحمت للعالمین آیا
ضلالت کے مٹانے کو یہ شمس العارفین آیا
رہے گا دین حق ان کا یہ ختم المرسلین آیا
جو فرقان منور لے کے خیر المرسلین آیا
اشارہ پا کے رفر ف کو لئے روح الامیں آیا
ملائک حور و غلماں نے کہا نور میں آیا
”فکان قاب قوسین“ کا اشارہ بالیقین آیا
وہ طالب اور یہ مطلوب شک اس میں نہیں آیا

چلیں نقش قدم عربیٰ پہ جو سالک وہ مومن ہیں

برائے مومناں ہے وعدہ خلد بریں آیا ۱۲۷



نام کافی ہے مجھے ہوں بندہ اس سرکار کا
امت خیر الرسل ہوں کیا ہوا عاصی ہوں میں
خواب میں جلوہ دکھا دو اے حبیب کبریا
حال ابتر ہو چلا ہے آپ کے بیمار کا

وقت آخر اپنے آقا کو نہ بھولوں اے خدا

نام ہو میری زباں پر احمد مختار کا ۱۲۸

سردار بشن سنگھ بیکل

مولانا عبدالحمید سوہدروی نے سردار بشن سنگھ کو ہندو شعراء میں شامل کیا ہے۔ جب کہ ایسا

نہیں۔ سردار جی کا تعلق سکھ مذہب سے تھا۔ ہندومت سے نہیں۔ ان کے حالات پر سے اگرچہ پردہ نہیں اٹھایا جاسکا لیکن قیاس غالب ہے کہ وہ بیسویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں ضلع شاہ پور کے قصبے سلانوالی کے نزدیک ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹ اسکول کی تعلیم کے دوران ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور سرگودھا میں مقیم ایک شاعر خلیق لاابالی سے اصلاح لینے لگے تھے۔ تعلیم کے بعد ملازمت کے سلسلے میں مشرقی پنجاب چلے گئے اور یوں سرگودھا کے افق سے غائب ہو گئے۔

مولانا عبدالمجید نے دوسرا ستم یہ کیا کہ ”برج گوپی ناتھ بیکل“ ۱۳۰ اور ”سردار بشن سنگھ بیکل“ ۱۳۱ دونوں کے کھاتے میں ایک ہی نعت صرف ایک بند کی کمی بیشی سے ڈال دی۔ اور یوں تحقیق کے اصولوں کو پامال کیا۔

راجا رشید محمود کا نام تحقیق میں اور خاص طور پر نعت کی تحقیق میں نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ نعت میں نہایت محبت اور محنت سے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی ”بابو برج گوپی ناتھ بیکل“ ۱۳۲ کے حصے میں چار اور ”سردار بشن سنگھ بیکل“ ۱۳۳ کے کھاتے میں دو بند ڈال کر اتنی آگاہی دے دی کہ یہ نعت اس کی ذاتی لائبریری میں ماہنامہ پیشوا اور ماہنامہ الفضل میں موجود ہونے کی صورت میں محفوظ ہے۔ آپ نے اس نعت کے حوالے سے مزید بھی بحث کی ہے۔

جناب نور احمد میرٹھی نے غیر مسلم نعت گو کے حوالے سے بہت خوبصورت اور مستند کام کئے ہیں لیکن نور سخن میں وہ ”بابو برج گوپی ناتھ بیکل امرتسری“ ۱۳۳ کے ضمن میں مسدس کو مثنوی کے رنگ میں تبدیل کر کے انہی چار بند میں سے پانچ اشعار نقل کر دیئے ہیں جبکہ ”سردار بشن سنگھ بیکل“ ۱۳۵ کے نام اسی مسدس کا آخری بند کر دیا ہے۔ لیکن بہر زماں بہر زبانا، میں ”برج گوپی ناتھ بیکل امرتسری“ ۱۳۶ کی اسی نعت کے ۸ اشعار کو پہلے مثنوی کی صورت میں اور پھر ان الفاظ کے ساتھ ”بیکل امرتسری کے ایک نعتیہ مسدس کے چار بند دیکھئے جو مختلف کتب میں ملتے ہیں۔“ ۱۳۷ اگلے صفحے پر شائع کر دیا ہے۔ لیکن اس ضخیم کتاب میں انہوں نے سردار بشن سنگھ بیکل کی نعت شامل نہیں کی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان مذکورہ کتب سے پہلے ممتاز حسن نے جو نعتیہ انتخاب شائع کیا اس

میں انہوں نے صرف ”سردار بشن سنگھ بیکل“ ۱۳۸ کی اس نعتیہ مسدس کے تین بند شامل کئے ہیں۔ پہلا بند شامل نہیں کیا۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ نعت جو کہ ”پیشوا“ دہلی ۱۹۳۳ء اور افضل قادیان کے خاص نمبر میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ سردار بشن سنگھ بیکل ہی کی ہے۔ لیکن بیکل تخلص کی غلط فہمی نے اسے فانی مراد آبادی سے نعت کا انتخاب کرتے وقت برج گوپی ناتھ بیکل کے کھاتے میں ڈلوادیا۔ جو بعد میں بلا سوچے سمجھے شائع ہوتی رہی اور الجھن کا شکار بنی۔

سردار بشن سنگھ بیکل کا کلام چونکہ نہیں مل سکا۔ ایک ہی نعتیہ مسدس ہے جس کے تین بند پیش کئے جا رہے ہیں۔

نعت رسول مقبول ﷺ

اے رسول پاک اے پیغمبر عالی وقار چشم باطن میں نے دیکھی تجھ میں شان کردگار
تیرے دم سے گل نظر آئے ہیں وہ عرفاں کے خار خوبیوں کا ہو تری کیوں کر بھلا ہم سے شمار

نور سے تیرے اندھرے میں درخشانی ہوئی

تیرے آگے آبرو کفار کی پانی ہوئی

اک جہالت کی گھٹا تھی چار سو چھائی ہوئی ہر طرف خلق خدا پھرتی تھی گھبرائی ہوئی
شاخ دینداری کی تھی بے طرح مرجھائی ہوئی لہلہا اٹھی تری جب جلوہ آرائی ہوئی

تیرے دم سے ہو گئیں تاریکیاں سب منتشر

پاگنی راحت ترے آنے سے چشم منتظر

کیوں نہ ہم بھی اس جہاں کا پیشوا مانیں تجھے کیوں نہ راہِ حق میں اپنا رہنما جانیں تجھے
دیکھنے کو دے خدا آنکھیں تو پہچانیں تجھے حق کی ہے بیکل صدا، شمس الضحیٰ مانیں تجھے

گر مسلمانوں کا اک پیغمبرِ اعظم ہے تو

اپنی آنکھوں میں بھی اک اوتار سے کب کم ہے تو ۱۳۹

نواب زادہ ملک حبیب اللہ خان ٹوانہ

ملک حبیب اللہ خان ٹوانہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۷ء کو ہڈالی تحصیل خوشاب ضلع شاہپور میں پیدا ہوئے۔ اپنی سن کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ اور پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی کچھ عرصہ زیر تعلیم رہے۔ آپ کے والد ملک ممتاز محمد خان راجپوتوں کے معروف قبیلے ٹوانہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ملک حبیب اللہ خان پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے فوج سے شاہی کمشنر پایا اور شمشیر اعزاز حاصل کی۔ آپ مسلم یونیورسٹی کی سینیٹ کے ممبر رہے۔ قانون ساز اسمبلی پنجاب کے ممبر (MLC) رہے۔ پاکستان کے لئے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر ۱۹۴۵ء میں یونیسٹ پارٹی کے خلاف بھرپور حصہ لیا اور تقریباً ۱۰ لاکھ روپے خرچ کئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی سلور جوبلی پر مختلف ذریعوں سے ضلعی بوائز سکاؤٹ ایسوسی ایشن کو آرگنائز کیا۔ ضلعی FAUNA کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے اس کی تنظیم کی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ سرگودھا کے ۹ سال تک سینئر وائس چیئرمین رہے۔ آرمی سلیکشن بورڈ نمبر ۲ کے اڑھائی سال تک سویلین ممبر رہے۔ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے تاحیات ممبر رہے۔ ریڈ کراس سوسائٹی نیشنل ہارس اینڈ کیٹل شو آف پاکستان کے ممبر رہے۔ آل پاکستان مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے۔ قرارداد پاکستان پر دستخط کرنے والوں میں شامل تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد جہاد کشمیر کیلئے ایک لاکھ روپیہ اور دیگر عوامی بہبود کی سرگرمیوں کے لئے کام کرنے والی انجمنوں (charities) کو پچاس ہزار روپے دیئے۔ آپ ایک سند یافتہ اور رجسٹرڈ حکیم تھے سو کم و بیش ۳۰ سال تک بلا معاوضہ لوگوں کا علاج کرتے رہے۔

تقسیم ہند سے پہلے انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا تھا جسے مسلم لیگ Agitation کے دوران واپس کر دیا۔ آپ پہلے زمیندار تھے جنہوں نے چند دیگر زمینداروں کے ساتھ مل کر ایک امدادی کمیٹی بنائی۔ آپ ۱۹۵۰-۵۱ء میں صوبائی ممبر منتخب ہوئے۔ آپ کے دو بچے احمد اقبال ٹوانہ اور ملک علی انور تھے۔ احمد اقبال نے آفیسرز ٹریننگ سکول کوہاٹ سے کمیشن لیا اور ابتدائی عسکری

تربیت کے اختتام پر اعزازی تلواری حاصل کی۔ ملک علی انور نے ایچی سن کالج سے ۵ میڈل حاصل کئے اور ہیڈ بوائے رہے۔

ملک حبیب اللہ خان ٹوانہ پیٹنگ، فوٹو گرافی اور شکار کے بھی از حد شائق تھے۔ آپ نے ۱۹۶۰ء میں پورے براعظم اور برطانیہ کا سفر کیا۔ ۱۹۶۵ء میں حج کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ آپ ایک شاعر بھی تھے اور ”تجلیات“ کے نام سے ۱۹۴۷ء میں آپ کا شعری مجموعہ شائع ہوا تھا۔ ۱۳۰ اس مجموعہ میں حمد، نعت، مناقب، غزلیات، رباعیات، قطعات اور فارسی کلام شامل ہے۔

آپ کے چچا نواب ملک محمد مبارز خان ٹوانہ کی کوشش سے ۱۹۱۴ء میں ”اوبرائین اسلامیہ ہائی سکول“ قائم ہوا جو آپ کے والد ملک ممتاز خان ٹوانہ کی کوششوں سے یکم مئی ۱۹۲۹ء کو انٹر کالج (ڈی ماؤنٹ مورسی کالج) شاہ پور بن گیا ۱۹۳۲ء میں اسے ڈگری کالج کا درجہ مل گیا۔ جو بعد میں سرگودھا منتقل ہو گیا۔

آپ نے ساری زندگی جہان آباد میں گزاری لیکن وفات اپنے خاندانی گاؤں ہڈالی میں نومبر ۱۹۷۲ء میں پائی۔ ۱۳۱

نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

میں اور تو

میں سراپا درد دل کی درد مند آواز ہوں میں وفور درد کا اک نالہ دمساز ہوں
میں تماشا گاہ ہستی کا سہانا راز ہوں میں کسی کی فکرِ عالی کا پر پرواز ہوں
تو ہے تصویرِ تصور میں حیاتِ کائنات تو ہے تقدیرِ حیاتِ جاوداں کا سومنات
تو ہے مومن کی فراست تو ہے ایماں کا ثبات میں سراپا التجا ہوں تو سراپا التفات
ماہی بے آب میں اور بحر بے پایاں ہے تو اس جہادِ زندگی میں درد کا درماں ہے تو
میں مثالِ برگِ خشک اور چشمہِ حیواں ہے تو جانفزا جاں بخش ہے اور ساحلِ طوفاں ہے تو
کشتی بے آب کو اپنا کنارہ بخش دے

دست بستہ پا شکستہ کو سہارا بخش دے
میں ہوں مجبورِ سلاسل تو اشارہ بخش دے
اے مرے مولا مرے آقا خدارا بخش دے ۱۳۲



عشق اجزائے پریشاں کو کہاں لے جائے گا خاک کے ذروں کو بالائے گماں لے جائے گا
فرصتِ یک دو نفس ہے بازیِ یک زندگی کس کو ساحل تک یہ بحرِ بے کراں لے جائے گا
ظلمتِ شب کو مٹا دیتا ہے خاور کا ورود آسماں انجم کی چادر کو کہاں لے جائے گا
دیدہ ناعاقبت اندیش حیراں ہو تو ہو ہفت اقلیمِ خرد پیرمغاں لے جائے گا
وادی شوق انتہائے منزلِ مقصود ہے جادہ پیا تیری منزل کا نشان لے جائے گا
الجھنیں مٹ جائیں گی تاریکیاں چھٹ جائیں گی
روزِ محشر جب حبیبِ اس کی اماں لے جائے گا ۱۳۳

حافظ یوسف آزاد

محمد یوسف ولد ظفر الدین ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کے شہر سکندرہ راؤ ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ اہل قریش کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم قرآن مجید سے شروع کی اور ۱۹۱۹ء میں حفظ کر لیا۔ یہ سال جس طرح قومی حوالے سے اہم تھا اسی طرح آپ کی زندگی میں بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسی سال آپ نے کم عمری کے باوجود تحریکِ خلافت میں حصہ لیا۔ اگرچہ عمر صرف بارہ سال تھی لیکن شعور جاگ اٹھا تھا۔ اسی سال آپ نے شعر کہنا شروع کیا اور اللہ راضی راہبر سے سلسلہ تلمذ قائم کیا۔ راہبر کا سلسلہ امیر مینائی سے جا ملتا ہے اور اسی خوش بختی پر حافظ صاحب نے کہا تھا۔

الفت مرے رقیب کی تم کم نہ کر سکتے دل سے تمہیں نکال دیں یہ ہم نہ کر سکتے

آزاد ایک پودا ہوں باغِ امیر کا دشمن جسے قلم سے کبھی خم نہ کر سکے
ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

نہیں ہے کوئی کمال مجھ میں، میں کیسے کہوں دو کمال کا ہوں
نہیں ہوں میداں سے ہٹنے والا کھلاڑی شمشیر و ڈھال کا ہوں
امیر مینائی سلسلہ ہے تخلص آزاد نام یوسف
نہیں ہوں کچے گرو کا چیلہ میں پورے مرشد کا بالکا ہوں

اس کم عمری میں آپ نے مشاعروں میں جانا شروع کر دیا تھا۔ سکندرہ راؤ سے نکلے تو احمد
آباد جا پہنچے جہاں اپنا کام ایک خراد مشین لگا کر شروع کیا لیکن ناکامی رہی۔ گتکا اور بنوٹ اپنے والد
سے سیکھا تھا اب والد نے انہیں ”رستم پہلوان“ کے حوالے کر دیا جن سے پہلوانی کے گر سیکھے۔
پہلوانی اور شاعری اگرچہ دو متضاد پہلو ہیں لیکن آپ نے ان دونوں کو ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ یہاں
تک کہ مسلم لیگ کی ممبر سازی اور تحریک پاکستان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ گاندھی اور گانگریس
کے خلاف کئی نظمیں لکھیں۔ منظوم ڈرامے لکھے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا تو آپ
ایک تذبذب کا شکار ہو گئے لیکن پھر فیصلہ کر کے ۱۹۵۰ء میں پاکستان کا رخ کیا اور سرگودھا کو اپنا مسکن
بنایا۔ ایک سال تک گننامی کی زندگی گزاری لیکن ۱۹۵۱ء میں جب جگر مراد آبادی سرگودھا آئے تو ایک
مشاعرہ میں حافظ یوسف کو اپنے ہمراہ لے گئے اس دن سے لے کر وفات کے دن تک سرگودھا کے
ادبی افق پر آپ نمایاں رہے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی نظموں سے
دلوں کو گرماتے رہے۔ آپ کے وارنٹ گرفتاری بمعہ انعام جاری ہوئے مگر جلسے میں باقاعدگی سے
حاضر ہونے کے باوجود حکومت کے قابو میں نہ آ سکے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں آپ نے
اپنے خیال اور الفاظ سے حصہ لیا۔

جان صدقے کر دو ناموسِ وطن کی شان پر پھوڑ دو وہ آنکھ جو اٹھتی ہے پاکستان پر
اپنے دشمن کے ارادوں سے خبر دار رہو چور، مکار، دغا باز سے ہو شیار رہو

حافظ یوسف آزاد کو اللہ تعالیٰ نے شعری شعور کے ساتھ لحن بھی داؤدی عطا کیا تھا۔ موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ لہذا جب آپ کسی مشاعرے میں ترنم سے پڑھتے تو سماں باندھ دیتے مزید یہ کہ شہر اور شہر سے باہر آپ کے شاگردوں کی تعداد بھی بڑھنا شروع ہو گئی تھی اور ہر نو آموز شعری رموز سے آشنائی کے لئے آپ کے پاس آتا۔ غزل اور نعت آپ کے شعری میدان تھے۔ آپ کی شخصیت اور فن پر یونیورسٹی آف سرگودھا ایم اے کا مقالہ بھی تحریر کروا چکی ہے۔

مسجد گول چوک کے نیچے ٹوپوں کی ایک چھوٹی سی دکان پر شعراء کی محفل جمی رہتی۔ آپ نے ادب کے فروغ کے لئے ”بزم حریم ادب“ کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد ”انجمن ترقی اردو“ کا حصہ رہے۔ بزم قیصر کے صدر رہے۔ اور یوں ادبی حوالے سے ایک خوشنما زندگی گزار کر ۳۰ دسمبر ۱۹۷۹ء مطابق ۱۰ صفر المظفر ۱۴۰۰ھ بروز ہفتہ ایک مختصر علالت کے بعد وفات پائی۔ ۳۳

نمونہء کلام۔

حمد باری تعالیٰ

قادر ہر ایک شے پہ تو ربِ قدیر ہے تیری نظیر ہی نہیں تو بے نظیر ہے
وہ غوث ہے قطب ہے کہ روشن ضمیر ہے ہر اک نبی، ولی ترے در کا فقیر ہے
پتھر میں رزق کیڑے کو پہنچا رہا ہے تو اے ربّ دو جہاں تو سمیع و بصیر ہے
رزاق رزق سب کو تو دیتا ہے بے طلب محتاج تیرے در کا غریب و امیر ہے
روشن یہ دو جہان ہیں تیرے ہی نور سے معبود تیری ذات سراجا منیر ہے
مشکل کشا ہے تو میرا حاجت روا ہے تو رحمن ہے، رحیم ہے تو دیکھ کر
یوسف کسی کے آگے نہ دستِ دراز کر
مانگے تو اس سے مانگ جو میروں کا میر ہے ۳۵



شبِ غم کی گھڑیاں ارے توبہ توبہ کئی رات پہلو بدلتے بدلتے

مگر وائے افسوس تم ہی نہ آئے چراغِ سحر بجھ گیا جلتے جلتے
 تڑپتے تڑپتے مچلتے مچلتے شبِ تار ڈھل ہی گئی ڈھلتے ڈھلتے
 کئی بار گھبرا کے آواز دی ہے تمہیں میں نے سورج نکلتے نکلتے
 نہیں ہے مرا حال لکھنے کے قابل نہ اب دل رہا ہے تڑپنے کے قابل
 خدا کے لئے آ کے صورت دکھا دو چلے آؤ اک دن ٹہلتے ٹہلتے
 محبت میں سمجھوں ہوئی کامیابی اگر تم دمِ واپس سامنے ہو
 مری آخری بس یہی ہے تمنا تمہیں دیکھ لوں دم نکلتے نکلتے
 غلط ہے محبت میں بگڑا ہوا دل سنبھلتا نہیں ہے یہ کس نے کہا ہے
 سنبھالے کوئی تو سنبھل جاتا ہے دل سنبھلتا ہے لیکن سنبھلتے سنبھلتے
 تمہارا خدا کیا ہمارا نہیں ہے دیا حسن تم کو ہمیں صبر دے گا
 پریشانیاں چند دن تو رہیں گی بہل جائے گا دل بہلتے بہلتے
 ہمیں ڈر ہے اک دن بہک جاؤ گے تم زیادہ نہ بیٹھا کرو مے کدے میں
 نہیں دیر لگتی ہے آزاد صاحب اس انساں کو نیت بدلتے بدلتے ۱۳۶

درج بالا غزل کا انتخاب صرف اس لئے کیا ہے کہ استاد قمر جلالوی کی غزل جو منی بیگم نے
 بھی گائی ہے اس کے بارے میں یہ واضح کرنا مقصد ہے کہ ایک مشاعرے میں یوسف آزاد نے قمر
 جلالوی کے روبرو یہ غزل پڑھی تھی جس سے متاثر ہو کر انہوں نے بعد میں اپنی غزل لکھی۔

میاں فضل الرحمن بسمل

فضل الرحمان نام اور بسمل تخلص تھا۔ وہ ۱۹۰۷ء کے لگ بھگ بھیرہ ضلع سرگودھا میں پیدا
 ہوئے۔ ان کے والد میاں عبدالرحمان ۱۸۹۸ء میں قادیان میں جا کر مرزائیت میں داخل ہو چکے
 تھے۔ یوں فضل الرحمان ایک مرزائی گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے پیدائشی مرزائی تھے۔ ابتدائی

تعلیم بھیرہ میں حاصل کی بعد ازاں بی اے اور پھر بی ٹی کر کے تدریس کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ اس سرکاری ملازمت میں ہونے کے باوجود مرزائیت کے فروغ کے لئے کام کرتے رہے۔ جب ریٹائر ہوئے تو مرکز کی طرف سے انہیں بھیرہ میں جماعت کا امیر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۳ء تک وہ جماعت کے امیر رہے۔ اسی دوران انہیں ربوہ میں بھی خدمات سونپی گئیں۔ یہ عہد ان کے تیسرے خلیفہ کا تھا۔ ربوہ میں انہیں جامعہ احمدیہ میں تدریس کا کام دیا گیا اور وہ مختلف اوقات میں وہاں اردو، فارسی اور انگریزی کے مضامین پڑھاتے رہے۔

فضل الرحمان بسمل کو اوائل عمری سے شاعری کا شوق تھا۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے۔ لیکن جماعت کی ذمہ داریوں اور تبلیغ کے باعث بہت زیادہ نہ لکھ سکے۔ مرزائیت کے لئے البتہ نظمیں وغیرہ لکھیں۔ جو تبلیغی اور اصلاحی حوالے سے تھیں۔ ان کے علاوہ حمد و نعت اور غزل بھی لکھی۔ ان کے بیٹے انجینئر محمود مجیب اصغر نے سارے کلام کو جمع کر کے ”جذباتِ دل“ کے عنوان سے کتاب شائع کروائی۔ اس ضمن میں ان کے بیٹے کا کہنا ہے:

”والد صاحب: شعر و شاعری کا بھی شوق تھا اور خدام الاحمدیہ کیلئے

فارسی میں نظمیں بھی لکھنے کا موقع ملا۔ جن میں سے بعض سلسلہ کے اخبارات و

رسائل میں شامل ہوتی رہیں ان کے شعر و شاعری کا زمانہ بہت طویل ہے۔

کچھ کلام تو ضائع ہو چکا ہے۔ تاہم والد صاحب کی ۱۰ جنوری ۱۹۹۳ء میں

وفات کے بعد جو نظمیں مل سکیں انہیں یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔“ ۱۳۷

میاں فضل الرحمان بسمل چچو کے جماعت کے اہم اور ذمہ دار فرد تھے۔ اس لئے انہیں ملک

سے باہر بھی بعض اوقات بھیجا جاتا اور یہ ان کے تبلیغی دورے ہوتے۔ اس سلسلے میں انہیں بہت سے

ممالک میں جانے کا موقع ملا۔

یہاں نمونے کے طور پر: کی دو غزلیں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ایک روش پر لکھی گئی

نظموں سے ہٹ کر ان کی غزل کے اسباب اور فکر کو سمجھا جاسکے۔

میں نے پوچھا جان من دل میرا تیرے دل میں ہے تو جواب آیا مگر آیا وہ لفظ نل میں ہے
 کیفیت نظر غضب کی مجھ سے پوچھو اے ندیم تیر جو قاتل کی چٹکی میں ہے میرے دل میں ہے
 کامیابی کیلئے ہیں راہ میں دشواریاں پر شکستِ دائمی انسان کی باطل میں ہے
 علم والا ہی رہے گا کامیاب و کامراں اور مایوسی سراسر قسمتِ جاہل میں ہے
 گرچہ موتی مل سکیں گے بحرِ قلزم میں بہت زندگی آرام کی چاہو تو وہ ساحل میں ہے
 اور کہاں سے ڈھونڈنے جاؤ گے تم مردِ حقیر
 بے کسی کی ایک ہی تصویر اس بسکٹ میں ہے



عشق والے یہ کام کرتے ہیں ہو کے بدنام نام کرتے ہیں
 دن کو آہیں ہیں رات کو نالے چین اپنا حرام کرتے ہیں
 ہے محبت ذرا نہیں نفرت خوش طبیعت کلام کرتے ہیں
 ابنِ مریم ہو یا کہ ہو موسیٰ سب کا ہم احترام کرتے ہیں
 ہم وہ ہیں جو کہ رات کچھلی پہر
 ہاتھ باندھے قیام کرتے ہیں ۱۳۸

جوہر نظامی

اصل نام عبدالغفور اور ادبی حوالہ جوہر نظامی تھا۔ جوہر تخلص کرتے اور دہلی میں خواجہ حسن نظامی
 سے ملاقات کے بعد ان سے متاثر ہونے کے باعث نظامی استعمال کیا۔ آپ ۶ جولائی ۱۹۰۹ء کو شاہ پور
 صدر ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے شناختی کارڈ پر یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء تاریخ پیدائش تحریر ہے۔ ۱۳۹
 آپ کے والد کا نام غلام حسین ۱۵۰ تھا۔ لیکن محسن عباس نے غلام حسن ۱۵۱ نام تحریر کیا ہے۔
 راجا عبدالغفور (جوہر نظامی) نے ۱۹۶۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے میٹرک کا

امتحان پاس کیا۔ اور ڈسٹرکٹ بورڈ میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۹ء تک آپ نے بحیثیت سینئر کلرک ڈسٹرکٹ بورڈ میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۹ء میں تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا ادارہ قائم ہوا تو آپ اس ادارے میں آ گئے۔ ٹی ڈی اے کا صدر مقام چونکہ جوہر آباد تھا لہذا آپ ۱۹۵۲ء میں جوہر آباد منتقل ہو گئے۔

سرگودھا قیام کے دوران آپ نے کئی یادگار مشاعرے کروائے اور شاعری کو فروغ دینے کیلئے کئی اہم اقدامات کئے۔ جوہر آباد جب منتقل ہوئے تو یہاں ادبی سرگرمیوں کا دور شروع ہوا۔ اور ادبی حوالے سے بہت سے بڑے نام یہاں سے اٹھے یا یہاں رہنے کے بعد ابھر کر سامنے آئے۔ اس دور میں شکیب جلالی، احمد ہمیش، الطاف پرواز، شہزاد احمد، وغیرہ بھی جوہر آباد میں مقیم تھے۔

جوہر آباد میں ٹی ڈی اے سے ریٹائرمنٹ کے بعد کہیں اور جانا مناسب نہ سمجھا اور زندگی کے باقی ایام ادب کے لئے کام کرنے میں گزارے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۹۶ء کو آپ کی زوجہ کا انتقال ہوا تو کچھ بجھ سے گئے اور پھر ۴۹ دن کے بعد ۱۸ اگست ۱۹۹۶ء کو آپ نے وفات پائی۔ جوہر آباد ہی آپ کا مدفن بنا۔ ۱۵۲

جوہر نظامی ایک سیدھے سادے مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور یہ سادگی و شرافت ساری زندگی آپ کے ساتھ رہی۔ بلکہ بزرگوں سے ملایہ ورثہ آپ نے اپنی اولاد کو بھی منتقل کیا۔ پھر یہ کہ شاعری میں آپ نے جس لگن اور ذوق کو اپنایا وہ بھی بیٹوں کو ورثے میں دے دیا۔ آپ کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ”لوح محفوظ“ ”وہم رسا“ اور ”برج نور“ لوح محفوظ کے فلیپ پر جناب وزیر آغا کی رائے کچھ یوں ہے:

”مجھے جوہر نظامی کے درویشانہ مسلک کی اولین جھلک سلطان

علی تنکیانہ مرحوم کے میلے میں دکھائی دی۔ وہ جیسے میلے میں تنہا تھے۔ بعد ازاں

جب ان سے بار بار ملاقات ہوئی تو میں جان گیا کہ وہ بھرے میلے ہی میں

نہیں بھری کائنات میں بھی اکیلے ہیں یہی شاید ایک سچے فنکار کا طرہ امتیاز

ہے۔“ ۱۵۳

جوہر نظامی کا دوسرا شعری مجموعہ ”وہم رسا“ ہے۔ اس کے پس ورق پر سید ضمیر جعفری کی رائے شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”جوہر نظامی سچے تجربوں، کھرے راستوں اور لفظوں کے قادر

الکلام شاعر ہیں۔ سنبھلی ہوئی وضعداری میں چاک گریباں کی طرح داری کی

آمیزش ان کے فن و فکر کی مخصوص پہچان ہے۔ شعری حوالے سے تھل کی ریت کو

شاداب کرنے میں ان کی برساتوں کے نم اور غم کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔“ ۱۵۴

میں نے جوہر نظامی کو مطالعے کے بعد جیسا پایا یا وہ میرا اپنا نقطہ نظر ہے۔ میں نے انہیں

روایات سے جڑا ہوا پایا۔ انہوں نے غزل کی روایات کو سنبھالنے اور آگے لے کر چلنے کیلئے بڑے خوش

آئندہ فیصلے کئے۔ ان کے اسلوبِ بیاں میں ایک روانی ہے۔ خیالات بھی سادہ لفظوں میں عام فہم

ہیں اور علامات وغیرہ کی بھی بھرمار نہیں۔ بلکہ حیران کن تراکیب سے بھی اجتناب برتتے ہیں۔ اسی

لئے شاید ان کے اشعار یادداشت میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ آپ کے کلام کے بارے جناب غلام

نبی اعوان اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جوہر کے ہاں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے لفظ بولتے نہیں

بلکہ گنگناتے ہیں۔ اس کا حرف حرف مترنم ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ لفظ صرف

اس کے سامنے گنگناتے ہیں جو ان لفظوں کا شناسا ہو۔ جوہر کی غزل بڑی مرصع

اور مترنم ہوتی ہے۔ وہ الفاظ کا استعمال اس خوبی سے کرتا ہے کہ مترادفات کی

جرات کوئی نہیں کر سکتا۔ جو لفظ جہاں اس نے لگا دیا اگر اسے دائیں بائیں کیا

جائے تو شعر کی شاندار عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہتی ہے۔“ ۱۵۵

جوہر کا رنگ سخن ملاحظہ فرمائیے۔

جو تھا نصیب میں وہ بیش و کم خرید لیا خوشی ہوئی نہ میسر تو غم خرید لیا

مستوتوں کے خزانے لٹا دیئے میں نے
 جفا کے پردے میں تیری وفا میں مضمحل ہیں
 بس اک فردہ تبسم تھی کائنات مری
 زیاں نصیبی سوداگرانِ عشق نہ پوچھ
 مری نگاہ میں ہے اک متاعِ بے مایہ
 وہ ساز عیش جو بے سوزِ غم خرید لیا

ستم ظریفی اربابِ اقتدار نہ پوچھ

مذاقِ غیرتِ اہلِ قلم خرید لیا ۱۵۶



دل جس سے معطر ہے تری گل بدنی ہے
 ستاؤ ذرا ہمسفر و چھاؤں گھنی ہے
 میں کون ہوں اک عمر سے یہ سوچ رہا ہوں
 وہ جس نے مرے زخموں کو گلزار کیا ہے
 کیوں جھوٹ سے بیزار ہے سفاک زمانہ
 منسوب ہے کیوں سرخی دامنِ شفق سے
 بلبل میں ترا لہجہ شیریں سخی ہے
 شاید یہی انعامِ غریبِ الوطنی ہے
 اک چادرِ اوہام ہے جو سر پہ تنی ہے
 کہتے ہیں ترا غمزہ ناوکِ فگنی ہے
 سچ بولنے والا بھی تو گردن زدنی ہے
 وہ ہونٹ تو ہمرنگِ عمیقِ یمنی ہے

وہ مرد قلندر جسے کہتے ہیں نظامی

افلاس کا مارا ہے مگر دل کا غنی ہے ۱۵۷

غلام جیلانی باصر

ضلع سرگودھا میں بھیرہ کی آبادی جتنی پرانی ہے اتنی مردم خیز اور ادبی حوالے سے نمایاں
 ہے۔ اس شہر میں ادبی شخصیات دیگر مکتبہ ہائے فکر کے ساتھ ساتھ چلتی اور اس شہر کی عزت و احترام کو
 واضح کرتی رہی ہیں۔ بہت سے دیگر شعراء اور ادباء کی طرح خواجہ غلام جیلانی باصر بھیروی کا کلام تو

گاہ گاہ پڑھنے میں آجاتا ہے لیکن افسوس کہ شخصی کیفیات کے صفحات ان کے تعارف سے خالی ہیں۔ ان کے بارے جو ابتدائی علم مجھے ہوا وہ یہ کہ ۲۹ اگست ۱۹۳۰ء کو لاہور والی مسجد بھیرہ میں انجمن نور اسلام کے ہونے والے جلسہ میں وہ شامل تھے۔ اور اس وقت بھی اپنی ادبی پہچان رکھتے تھے۔ آپ چونکہ زیادہ عرصہ بھیرہ سے باہر رہے اس لیے بھیرہ میں کم لوگ آپ سے واقف ہیں۔ آپ لاہور میں ملازمت کرتے تھے اور چیف سنٹرل انسپکٹر میونسپل کارپوریشن لاہور کے عہدے پر فائز رہے۔ باغبانپورہ میں رہائش پذیر تھے۔ بھیرہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ ”شمس الاسلام“ کے نومبر ۱۹۳۳ء کے شمارے میں آپ کا مضمون ”مرزائے قادیانی کی دماغی حالت۔ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں دلازار گستاخیاں“ شامل تھا اور آپ کا ایک نعتیہ مجموعہ گلہائے عقیدت کے نام سے ۱۹۷۵ء میں شامل ہوا تھا۔ پھر آپ اگست ۱۹۹۰ء تک ہر دو تیسرے شمارے میں کسی نہ کسی حیثیت سے شامل ہوتے۔ اس سے تو یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۹۰ء تک زندہ تھے۔ بہر حال آپ کے کوائف کی تلاش میں مجھے ناکامی رہی۔ ان کا کلام بھی زیادہ تر حمد و نعت اور اخلاقیات کے علاوہ تاریخ گوئی وغیرہ پر یا خاص مواقعوں کی نسبت سے ہمیں ملتا ہے۔ مولانا ظہور احمد بگوی کی وفات (۱۹۳۵ء) پر بھی ان کی سوز و غم میں ڈوبی ہوئی دو نظمیں ملتی ہیں۔ ایک نظم دیکھئے۔

گوہر نایاب

اے شہیدِ ملتِ عالی ہم والا تبار	اے فقیہِ اعظم و بطلِ جلیلِ ذی وقار
تیرے دم سے گلشنِ علم و عمل تھا پُر بہار	تیری مرگِ ناگہاں نے کر دیا سینہ فگار
جذبہِ احقاقِ حق سے دل تیرا سرشار تھا	لشکرِ اعدائے دیں سے برسرِ پیکار تھا
تیرے سینے میں تھی ایماں کی تجلی جلوہ گر	پائے استقلال میں آئی نہ لغزشِ عمر بھر
فہم و تدبیر و بصیرت میں تھا یکتائے زماں	عزت و عظمت کا تیری معترف ہے اک جہاں
ہیں ترے رشحاتِ خامہ دل نشین و دل ستاں	حکمتِ ایمان و عرفاں کا پیامِ جاوداں

کس قدر پر جوش و درد انگیز ہر تقریر تھی روح پرور اور معنی خیز ہر تحریر تھی
 آہ تجھ پر گردشِ افلاک غالب آ گئی تیرہ بختی زندگی ضوفشاں پر چھا گئی
 مرگِ ظالم نے نہ چھوڑا گوہرِ نایاب کو خون کے آنسو رلائے حلقہٴ احباب کو
 عالم و فاضل یہاں موجود ہیں گو بے شمار لیکن ایسا مخلص و بے لوث و بے حد جاں نثار
 مردِ مومن والا و گرویدہ دینِ متین وائے بد بختی کہ ہم کو مل نہیں سکتا کہیں
 یاد کر کے تیرے الطاف و کرم مہر و وفا وصفِ اخلاص و مروت خوبیِ صدق و صفا
 باصرِ محزوں عقیدت مند دیرینہ ترا دردِ مہجوری و حسرت میں رہے گا بتلا

تیری تربت پر ہمیشہ بارشِ انوار ہو

خلقِ مصروف دعا ہو رحمتِ غفار ہو ۱۵۸

نعت محبوبِ ربِّ ﷺ

میں بھی ہوں روزِ ازل سے جاں نثارِ مصطفیٰؐ رات دن میری نظر میں ہے دیارِ مصطفیٰؐ
 خوش نصیبی پر مجھے اپنی جہاں میں ناز ہو میں اگر ہو جاؤں خاکِ رہ گزارِ مصطفیٰؐ
 اپنے سینے میں بسائے پھر رہا ہوں رات دن دل کے آئینے میں ہیں نقش و نگارِ مصطفیٰؐ
 یہ عروجِ حسن، یہ توقیرِ فخرِ دو جہاں مصطفیٰؐ کا خود ہے طالبِ کردگارِ مصطفیٰؐ
 میں تڑپتا ہوں حضوری کیلئے شام و سحر کاش دیکھیں یہ نگاہیں جلوہ زارِ مصطفیٰؐ
 ان سے حاصلِ گلشنِ دیں کو ہو میں شادابیاں شبر و شبیر ہیں جانِ بہارِ مصطفیٰؐ
 جس کی توصیف و ثنا میں ہے خدارطب اللساں دونوں عالم میں ہے وہ حسنِ وقارِ مصطفیٰؐ
 جان وہ کیا جو نہ ہو نامِ محمدؐ پر نثار دل وہ کیا ہے جو نہ ہو آئینہ دارِ مصطفیٰؐ

روحِ رحمت سرورِ کونین پر لاکھوں سلام

جان سے دل سے ہے باصر بھی نثارِ مصطفیٰؐ ۱۵۹

ناسک امرتسری

آپ کا نام غلام نبی میر تھا۔ اور یہ نام بحیثیت نثر نگار مطالعے کے دوران کئی بار میری نظروں سے گزرا لیکن میرے علم میں یہ نہیں تھا کہ اس شخصیت کا تعلق سرگودھا سے بھی ہو سکتا ہے اور آج جب اس نام اور آپ کے کلام کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تو نا کام رہا۔ دراصل میں سرگودھا کے مین قبرستان میں سے کتبوں کو نقل کر رہا تھا تو ایک قبر نے مجھے روک لیا۔ کتبے پر درج ذیل الفاظ درج تھے۔

”حضرت علامہ غلام نبی میر ناسک امرتسری سالارِ اعلیٰ مجلسِ اصرار

جان نثار ختم نبوت، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خاص پیروکار تاریخ

وفات ۲۲ ذوالحجہ ۱۴۱۴ھ بمطابق ۳ جون ۱۹۹۴ء بروز جمعہ المبارک“

اس قبر کے چاروں طرف اردو اور فارسی میں کچھ اشعار رقم ہیں جن میں ناسک بطور تخلص

موجود ہے۔ یوں یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ علامہ غلام نبی میر ناسک اردو اور فارسی کے شاعر تھے

اور وہ بھی منجھے ہوئے اور کافی کلام کے مالک۔ کیونکہ ان کی وفات کے بعد جب قبر کو پختہ بنوایا گیا تو

ان کے ایسے اشعار جن کا تعلق اسی حوالے سے ہو تلاش کرنے میں کافی کلام پڑھا گیا ہوگا۔ بہر حال

میر ناسک کے جو اشعار ان کی قبر کے چاروں طرف لکھے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

ہیں شش جہات میں پھیلے غلامِ بولہسی جلاؤ پھر سے چراغِ محمدِ عربی

☆

نگین خاتمِ محبوب بن نہیں سکتا کئے نہ سان پہ ناسک جو مثل سنگِ عقیق

☆

ذات تو کنزِ مخفیا عشق را جستجوئے او آنچہ ز عشق شد عیاں، خواہش خود نمائے تو

شوق و جنوں کہ دادہ ای دل را کشاں کشاں برو گاہ بہ سوئے مقتلے گاہ بہ سوئے کوئے تو

تو کہ بروئے ذات خود افگنی پردہ صد ہزار بایں ہمہ حجاب ہمارا نمود روئے تو

گرچہ وجود کائنات جلوہ نمود صد ہزار ناسک علاقہ ای نہ داشت لآولائے ہوئے تو



بادۂ عشق کا ریاغ ہیں ہم جذبِ رفتہ کارک سراغ ہیں ہم
 جہل و تشکیک کی فضاؤں میں پر یقین عزم کا بلاغ ہیں ہم
 کفر جس کو کبھی بجھا نہ سکا دینِ حق کا وہی چراغ ہیں ہم

خادمِ مرسیں کے ہم خادم

ہو کے درویشِ شہِ دماغ ہیں ہم ۱۶۰

بدرالدین بدر

بدرالدین نام اور بدر تخلص تھا۔ آپ پاہریانوالی تحصیل پھالیہ ضلع گجرات میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ ایسا تھا کہ یہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور مسلمان کم تعداد میں تھے۔ جس کا اثر بچپن میں ہی بدرالدین کی ذات پر بھی پڑا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

”تیسری جماعت میں تھا جبکہ بڑے بھائی اور ہمشیرہ کی شادی

ہوئی۔ باراتیوں کی تواضع کیلئے گائے ذبح کی گئی۔ ہندوؤں نے ہنگامہ کھڑا

کر دیا۔ ایک سکھ لڑکا بھی مارا گیا اور یوں گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ صحت اور

تعلیم دونوں اس سے متاثر ہوئے۔ ذاتی مطالعہ سے بہت کچھ سیکھا۔“ ۱۶۱

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ کی سکولنگ یہیں تک محدود رہی ہوگی۔ اس پر یہ

ہوا کہ اسی بے گھری کے عالم میں کم عمری میں ہی شادی ہو گئی اور چند سال بعد رفیقہ حیات ایک بچے کو

جنم دے کر راہی ملک عدم ہوئی تو آپ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اسی ملازمت کے دوران آپ نے

دوسری شادی کی۔ فوج میں آپ نے سپاہی رینک کی ملازمت پوری کرنے کے بعد پنشن لی اور

۱۹۳۶ء میں کویت چلے گئے۔ پروفیسر ہارون الرشید تبسم کے مطابق:

”انہوں نے برٹش آئل کمپنی یعنی B.O.C میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۶۱ء تک ملازمت کرتے رہے۔ جب وہ کمپنی کویت سے برطانیہ منتقل ہو گئی تو بدرالدین بدر نے برطانیہ جانے کی بجائے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔“ ۱۶۲

یہ عرصہ ۱۵ سال بنتا ہے۔ جبکہ بدر صاحب نے لکھا ہے:

”بیس سال بعد وطن عزیز کو واپسی ہوئی۔ سرگودھا میں رہنا پسند کیا۔ اب تک ۱۸ سال ہو چکے ہیں۔ جو بچے ماں کی گود میں لائے تھے وہ ابھی زیر تعلیم ہیں اور جو بڑے تھے وہ بی۔ اے کی ڈگری لے چکے ہیں۔“ ۱۶۳

یہ تحریر ۱۹۷۸ء کی ہے۔

بدرالدین بدر نے ذاتی طور پر مطالعے سے فارسی میں بھی شد بد حاصل کی۔ تمام بڑے شعراء کو پڑھا۔ اردو ادبیات پر عبور حاصل کیا۔ جب بھی وقت ملا پڑھنے کے علاوہ شعر بھی لکھ لئے۔ سرگودھا میں آنے کے بعد اگرچہ گمنامی کی زندگی گزاری لیکن کبھی کبھی وزیر شیرازی کی بیٹھک پر بھی جاتے اور دیگر اہل ادب سے بھی ملاقات وغیرہ رہتی۔ آپ خود سرگودھا کی اس زندگی کے بارے تحریر کرتے ہیں کہ:

”سرگودھا کی زندگی کو میں اپنی گمنامی کی زندگی کہوں یا کم آ میزی

کی کہ محلے والوں سے بھی ابھی تک محتاج تعارف ہوں۔“ ۱۶۴

۱۸ سال اس شہر میں گزارنے کے بعد آپ کا یہ بیان ہے۔

بدرالدین بدر کے دو شعری مجموعے ”جمال بدر“ اور ”خیابان بدر“ شائع ہوئے۔ دوسرے مجموعے کی اشاعت کے تین سال بعد ہی آپ ۱۱ ستمبر ۱۹۸۸ء کو اس جہان فانی کو الوداع کہہ گئے۔ ۱۶۵

انور سدید کا کہنا ہے کہ:

”سادگی اور معصومیت ان کی شعری شخصیت کا خاصہ ہے۔ ان کی

غزل غمِ زمانہ سے پاک ہے اور غمِ زمانہ کبھی ان پر یورش کرنے کی کوشش بھی

کرے تو وہ بڑی خوبصورتی اور دانائی سے طرح دے جاتے ہیں اور غم محبوب کو
اپنے گلے سے لگا لیتے ہیں کہ اس کے بغیر غزل میں روشنی پیدا نہیں ہوتی۔“ ۱۶۱

غزل

گر تری راہ میں فطرت کے قوانین نہیں پھر تو تقدیر کوئی آئین تسکین نہیں
زندگی بنتی ہے انساں کی عمل سے لیکن مردہ قوموں کے لئے کوئی عمل دین نہیں
پاس خودداری کا جس شخص میں احساس نہ ہو ہے تو انسان مگر قابل تحسین نہیں
حسن تو ہر جگہ موجود ہے لیکن افسوس تو نگہ باز نہیں تو ہی نگہ بین نہیں
جلوہ طور اگر دیکھے تو موسیٰ دیکھے سب تجھے دیکھیں کہ تو فلم کی سکرین نہیں

تو غزل بدر بہر رنگ سجا لیتا ہے !
کوئی مصرع بھی ترا تشنہ تزمین نہیں ۱۶۲



رگوں میں روحِ رومی ہے نہ شوقِ بوعلی دل میں
کھلے پھر کس طرح عشقِ الہی کی کلی دل میں
جہاں کے سب گلی کوچے مجھے سنان لگتے ہیں
بسی ہے جب سے تیری پاک بستی کی گلی دل میں
ہے تیرا حسن تو ہر سو فروغِ دیدہء عالم
تجھے میں ہو بہو دیکھوں لگن ایسی گلی دل میں
محیطِ زینتِ شانہ کشِ زلفِ عروساں ہوں
مگر اس زلف کی تیری شکن ہی بس گئی دل میں
بدن کی ہر رگ جاں میں محبت کا تیری یہ درد
گہے ہوتا ہے سر میں گاہ جگر میں اور کبھی دل میں

مسح شہر کرتا ہے علاج جسم و جاں لیکن
 محبت کی نکالے کون جو نشتر چھبی دل میں
 بیاں نہ کر سکا ان کے جلالِ حسن سے اے بدر
 وہ آئے بھی مگر خواہش جو تھی دل کی رہی دل میں ۱۶۸

قاضی عزیز احمد

قاضی عزیز احمد المتخلص عزیز ۳۱ مئی ۱۹۱۰ء کو قاضی عطا محمد کے گھر خوشاب میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک عالم دین اور مجاہد تھے۔ لیکن شاعری، ادب اور خطاطی آپ کے من میں رچے بے تھے۔ جب کہ حکمت میں بھی آپ اپنی پہچان رکھتے تھے۔ اسی طرح صحافت کے میدان میں بھی آپ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

قاضی عزیز احمد نے تحریک پاکستان کے دوران خاکسار تحریک کے سرگرم رکن کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۸ء کی کشمیر کی جنگ میں جہاد کیا بعد ازاں سول دینفس میں بھی کام کیا۔ علامہ اقبال سے آپ کو محبت تھی۔ جب تک وہ زندہ رہے شعر کہا اس کے بعد شعر کہنا ترک کر دیا۔ اسی لیے آپ کا کلام آج دستیاب نہیں۔ ایک شعری مجموعہ بعنوان ”فکر فردا“ شائع ہوا تھا جو اب نایاب ہے۔ البتہ نثر نگاری کا سلسلہ جاری رہا اور درج کتب منظر عام پر آئیں۔

۱۔ اصطلاحات قرآن، ۲۔ مرآة التوضیح، ۳۔ تحفظ کی راہ، ۴۔ الادین الا تقسیم،

۵۔ ضرورت امام، ۶۔ حرمت امام ۱۳۹

آپ نے ۹۵ سال کی عمر میں ۲۰۰۵ء میں خوشاب میں ہی وفات پائی۔

ناکامی علاج سرِ دار تو دیکھو گردن تو کئی بار سرِ دار گئی ہے
 صد شکر اندھیروں میں بھی رستہ نہیں بھولے ابھری ہے سحر اور شبِ تار گئی ہے
 اے ڈھونڈنے والو مجھے واپس نہ بلاؤ منزل کے نشانوں میں نظر ہار گئی ہے

کشتی کو کناروں سے محبت تھی وگرنہ ملاح کی تدبیر تو بے کار گئی ہے
 اے دروہ محشر تیری مخلوق ابھی تو آئی تھی تو مند پہ بیمار گئی ہے
 تم پر تو ہے مفلوج علالت بھی امیر و
 غربت تو سرِ دار کئی بار گئی ہے ۱۷۰

ملک خادم حسین

ملک خادم حسین ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ ملک محمد رمضان کے ہاں موضع بلونزد مٹھ ٹوانہ ہڈالی
 میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ۱۷۱ آپ آرمڈ فورسز
 میں بحیثیت کلرک خدمات انجام دیتے رہے۔ یہ یونٹ ۱۸ ٹوانہ لانسرز کے نام سے مشہور تھی کیونکہ
 ملک عمر حیات ٹوانہ اس یونٹ کے اخراجات برداشت کرتے تھے اور انہی کی یونٹ سمجھی جاتی تھی۔
 پاکستان کے قیام کے بعد ۱۸ لانسرز کا نام ۱۹ لانسرز کر دیا گیا۔ جس نے حمید گل، توقیر ضیا، تنویر نقوی اور
 عارف حسن جیسے جرنیل پیدا کئے۔

۱۹۴۴ء میں ملک خادم حسین جبکہ جمعدار تھے تو ان کا شعری مجموعہ ”دیوان خادم“ شائع
 ہوا۔ جس کا دیباچہ اس کی یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل جی۔ ایچ۔ کر جلی نے لکھا تھا۔ ۱۷۲
 اسی دوران خادم حسین نے اپنے والد کے ہمراہ مرزائیت اختیار کر لی۔

جمعداری سے ہی انہیں کمشن مل گیا اور پھر قیام پاکستان کے تھوڑا عرصہ بعد ہی انہوں نے
 ریٹائرمنٹ لے لی تب آپ کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ چونکہ مرزائی تنظیم کے سیکرٹری تھے اس
 لئے گاؤں میں رہنا ان کے لئے کچھ مشکل تھا تب وہ والدین اور بچوں کے ہمراہ لاہور منتقل ہو گئے اور
 شاہ عالم مارکیٹ میں رہائش رکھی لیکن چند ماہ بعد ہی ربوہ منتقل ہو گئے۔ یہیں ان کے والد نے ۷۰
 سال کی عمر میں ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو وفات پائی۔ دیوان خادم کا دوسرا ایڈیشن یہیں سے ۱۹۵۶ء میں شائع
 ہوا۔ ربوہ (موجودہ چناب نگر) میں انہیں کچھ اہم خدمات سونپی گئیں اور اسی سلسلے میں مرزائیت پر

ایک کتاب بھی انہوں نے لکھی۔ ”۱۹۷۴ء میں چناب نگر میں ہی وفات پائی اور خصوصی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کے بیٹے کینیڈا میں جا کر آباد ہوئے۔“ ۱۷۳

راقم نے قبر پر کتبہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار چناب نگر میں مرزائیوں کے متعلقہ صاحبان سے کیا۔ لیکن اجازت نہ مل سکی۔ البتہ لائبریری کے چیف لائبریرین نے وفات کے سلسلے میں ستر کی دہائی کی تصدیق کی۔

خادم حسین ملک نے اپنی شاعری میں جن اصناف کو برتا ہے۔ ان میں حمد، نعت، قطعہ، نظم اور غزل شامل ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں کئی غزلیں اضافی شامل کی گئی ہیں۔ شاعری میں روایات کی پاسداری اور ایک بے ساختہ پن ہے۔ آج سے تقریباً ۶۵ یا ۷۰ سال قبل کہے گئے ان اشعار کو ہم آج کے اشعار پر اگر منطبق کرنا چاہیں تو اسلوب اس کی قدامت کا اشارہ دیتا ہے۔ اس کلام کے مطالعہ سے جو تصویر زندگی ابھر کر قاری کے ذہن پر مرتسم ہوتا ہے اس میں پر خلوص جذبہ اور احساس بالکل واضح ہے۔

کیا بتائیں کہ ترے عشق میں کیا کیا دیکھا
چرخ کا جور مقدر کا بگڑنا دیکھا
بہر پابوس وہیں اٹھا غبارِ مجنوں
وادی نجد میں جو ناقہ لیلیٰ دیکھا
خوب ہے پردہ نشیں وہ ترا کیا کہنا مگر
جس کو بھی دیکھا ترے حسن کا شیدا دیکھا
عمر بھر رہتے ہیں ناشادِ محبت والے
بزمِ ہستی میں یہ دستور نرالا دیکھا
مٹ گئے تجھ سے محبت میں ہزاروں خادم

ہم نے دنیا میں ہے لاکھوں کا تماشا دیکھا ۱۷۴



مری تقدیر میں رونا ترپنا یار لکھا تھا
ازل سے میرے حصے میں کسی کا پیار لکھا تھا
نہیں ٹٹیں یہ تحریریں جو ہیں قسمت کی زنجیریں
میری آنکھوں کا گویا ان سے ہونا چار لکھا تھا
محبت کا جواب ہنس کر دیا تھا اس نے نفرت سے
جہاں تحریر تھی گل کی وہاں پر خار لکھا تھا
گلہ مجھ کو نہیں ان سے پڑے پردے تھے آنکھوں پر
ذلیل ہونا محبت میں سر بازار لکھا تھا

خفا ہونا بجا تیرا جفا سہنا بجا میرا مقدر میں ازل سے یوں مری سرکار لکھا تھا
 تمنا ہے کہ محشر تک رہے نظرِ کرم مجھ پر خوش قسمت کہ سجدے کو ترا دربار لکھا تھا
 ہوا افسوس کیوں اتنا تمہیں خادم کے مرنے کا
 ازل سے اس کی قسمت میں نشانِ دار لکھا تھا ۱۷۵

ڈاکٹر محمد شریف قیصر

ڈاکٹر محمد شریف المتخلص قیصر ۱۹۱۰ء میں اس وقت کے رواج کے مطابق اپنے تمہیال رسول
 پور مفتیاں، شادیوال ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدین سرگودھا کے گاؤں چک نمبر ۷۵
 جنوبی میں سکونت پذیر تھے۔ آپ کی تعلیم کی ابتداء اسی چک سے ہوئی جو بھاگٹا نوالہ سے ہو کر سرگودھا
 میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے پر آ کر ٹھہری۔ بعد ازاں آپ نے ایل ایس ایم ایف کیا اور طب کے
 شعبہ سے منسلک ہو گئے۔ آپ کے والد مفتی محمد فاضل طبیبہ کالج دہلی سے فارغ التحصیل تھے۔ آپ
 نے بھی انہیں سے طب کے اسرار و رموز سیکھے۔

ڈاکٹر محمد شریف قیصر سیاست کے خازن میں بھی رہے۔ پہلے کانگریس اور پھر خاکسار
 تحریک میں شامل رہے لیکن جب مسلم لیگ کی مسلمانوں کے لیے الگ مملکت کے حصول کی جدوجہد
 دیکھی تو مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور پھر پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ آپ نے مسلمان بچوں کی
 تعلیم کے لیے سرگودھا میں اقبال مسلم ہائی سکول کی بنیاد رکھی۔ آپ نے ۱۹۳۷ء میں ایک مفت روزہ
 اخبار ”ہمدرد“ جاری کیا جو اکتوبر ۱۹۳۹ء تک شائع ہوتا رہا۔ آپ نے اپنی ان پڑھ شریک حیات کو تعلیم
 دلوائی اور اپنے گاؤں میں بچیوں کی تعلیم کے لیے ایک سرکاری سکول کھلوا کر اُسے وہاں بچیوں کی
 تدریس پر مامور کیا۔ اسی طرح طبی شعبے میں بھی غرباء کے لیے مفت علاج کا انتظام کیا۔

ڈاکٹر محمد شریف قیصر نے عین جوانی یعنی ۱۹۳۵ء میں وفات پائی اور چک نمبر ۷۵ جنوبی

کے قبرستان ہی دفن ہوئے۔

ہفت روزہ ”ہمدرد“ میں آپ کی نظمیں جو شائع ہوئیں۔ آپ کے بیٹے طارق مفتی ایڈووکیٹ نے انہیں یک جا کر کے کتابی صورت میں ”دیوانِ قیصر“ کے نام سے شائع کروا دیا ہے۔ ان نظموں کے مطالعے سے آپ کی فکری اوج اور جذبہ قومی کا صحیح ادراک ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی شاعری میں کسانوں، دہقانوں اور دیہات کے غریب عوام کے مسائل پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ شعری ذوق کی تسکین بھی ہو جاتی ہے اور اس طبقے کے عوام کو راہِ عمل کے تعین میں رہنمائی بھی مل جاتی ہے۔

درسِ اخوت

اے مسلمان یاد کر تو اپنی کہنہ داستاں
تھی تمہاری بے گماں کثرت کبھی وحدت میں گم
بھول بیٹھا ہے تو کُل مومنونِ اخوۃ
ایک مومن پر کبھی جب ہو مصیبت کا نزول
اس میں کوئی ہو عرب یا مغل یا افغان ہو
پھمڑا، سینہ، دماغ و چشم اور قلب و جگر
گونجتی دیو حرم میں تھی تری اونچی اذیاں
منتشر وحدت تری کثرت میں ہے اب بے گماں
دل میں وہ باقی نہیں بے تابیاں ہم دردیاں
اُس پہ گر پتا گرے تجھ پر گرے کوہِ گراں
مشترکہ سب مسلمانوں کا ہے سودوزیاں
ایک تن کے عضو ہیں گو ہیں جدا ان کے مکاں

سوچ دل میں تو اے مسلم سن کے قیصر کی مثال

پھکے ہیں پکوان تیرے اونچی ہے تیری دکان

کب تک

کب تک اے آسماں تیرا بیاں سنتے رہیں
آہ کب تک سہتے جائیں یہ تیرے جو رستم
متحد ہو جائیں گے ہندوستان ایک دن
ڈوب کر مر جائیں کیوں نہ شرم سے سب نوجواں
کب تک پہنے رہیں طوقِ غلامی ہم نفس
تا بکے اغیار کی ہم پھبتیاں سنتے رہیں
تا کجا مظلوم کی آہ و فغاں سنتے رہیں
تا کجا یہ تفرقوں کی داستاں سنتے رہیں
کب تک یہ طعن و تشنیع بتان سنتے رہیں
تا کجا اغیار کی ہم جھڑکیاں سنتے رہیں

ہو چکا لبریز اب پیاتہ صبر و کلیب تاکجا تقدیر کی سرگوشیاں سنتے رہیں
ہم نہ قیصر بننے کی ٹھانیں تو پھر بتلاؤ کیا
وعدہ آزادی ہندوستان سنتے رہیں ۱۹۴۷ء

مرزا مامول انور

”یہ خاکسار مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۰ء عید الفطر کی صبح لودھیانہ (حال
بھارت) میں والدین کی پہلی اولاد بن کر اس دارِ فانی میں وارد ہوا۔ اولادِ
نرینہ کی آرزو برآنے پر میرے عالم فاضل بزرگوں نے مامول انور نام
رکھا۔ یہ دونوں الفاظ عربی زبان کے ہیں جن کا لغوی مفہوم ہے وہ خوبصورت
شے جس کی امید یا انتظار تھا۔ لیکن رائے عامہ اور ابتدائی درسگاہوں نے اس
نام کی بلاغت کو تسلیم و قبول نہ کیا اور غلط العام معمول انور سکولوں کالجوں کے
رجسٹروں پر چڑھتا رہا اور شہرت پا گیا۔ ۱۹۷۷ء

جناب مامول انور کی ذاتی تحریر سے ایک تو اُن کے نام غلط العام ہونے کی وجہ سمجھ میں آتی
ہے۔ دوسرا ”نقوشِ سرگودھا“ ۱۹۷۸ء۔ ”داستانِ سرگودھا“ ۱۹۷۹ء۔ ”سخنورانِ سرگودھا“ ۱۹۸۰ء اور ”اب
انہیں ڈھونڈ جاؤں رخِ زیبا لے کر“ ۱۹۸۱ء میں درج تاریخ پیدائش ۱۱ اکتوبر غلط ہونے کا علم ہوتا ہے۔
ابتدائی تعلیم دہلی سے حاصل کی۔ آپ اسلامیہ ہائی سکول لدھیانہ میں آٹھویں جماعت کے طالب علم
تھے جب پہلی نظم چاند کے عنوان سے لدھیانہ کے ہفت روزہ اخبار ”الاصلاح“ کے پہلے صفحہ پر شائع
ہوئی۔ اس سے حوصلہ بڑھا اور تو اتر سے لکھنے لگے۔ میٹرک، ایف اے، ادیب فاضل اور بی اے میں
اسی باعث اچھے نمبر نہ لے سکے۔ آپ کے والد مرزا مقبول حسن ملازمت کے سلسلہ میں چونکہ مغربی
پنجاب (موجودہ پاکستان) آگئے تھے۔ لہذا ایف اے اور بی اے جھنگ سے کیا بعد ازاں سیشن کورٹ
سرگودھا میں بطور ایگزامینر تعینات ہو گئے۔ یہ شاید ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا اور پھر آپ یہیں کے ہو رہے اسی

سال جب دہلی گئے تو نواب سراج الدین سائل دہلوی کے ہاں ایک مشاعرہ میں پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اُن کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے آئندہ ترنم سے پڑھنے لگے۔ اُس دور میں آپ نے سرگودھا، جھنگ، لدھیانہ اور دہلی کے علاوہ بمبئی کے خلافت ہاؤس میں مولانا شوکت علی کی صدرات میں اور انجمن حمایت اسلام لاہور میں علامہ اقبال کی صدرات میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں کلام سنا کر داد وصول کی۔ ۱۵ اگست ۱۹۳۲ء کو آپ نے ہفتہ وار ادبی اخبار ”المقالہ“ شروع کیا جس کی تیسری کاپی میرے سامنے ہے اور اس کے پہلے صفحہ پر غزل بعنوان ”شبِ ماہتاب“ چھپی ہوئی ہے۔

وہ جو بار پہ مہتاب کا چمک جانا کشش کے جوش سے امواج کا چھلک جانا
 و فورِ درد سے اٹھنا وہ ہوک کا دل میں قرار صبر کا پھر لاکھ سرٹپک جانا
 مثالِ ماہ پس ابر دیدہ تر میں رخ نگار کا بے ساختہ جھلک جانا
 مسل کے دل کو کلیجے میں چٹکیاں لے کر نسیمِ سرد کا جھونکوں سے پھر تھپک جانا

شمیمِ غنچہ رنگِ خیال سے انور

فضائے باغِ دل زار کا مہک جانا ۱۸۲

آپ کا شعری مجموعہ ”صحیفہ“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں سے انتخاب ”بزمِ ادب سرگودھا“ کے ۲۰ دسمبر ۱۹۳۶ء کے غیر طرہی مشاعرہ میں ترنم سے آپ نے سنایا ۱۸۳ ”داستان سرگودھا“ ۱۸۳ اور ”اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر“ ۱۸۵ میں ان کی ایک انگریزی شہرہ آفاق کتاب۔ ”The law of Equality“ کے بارے بھی پتہ چلتا ہے جس کا اردو ترجمہ انہوں نے ”قانونِ مکافات“ لکھا ہے۔ لیکن ”قانونِ مکافات“ کے نیچے جو انگریزی میں الفاظ درج ہیں وہ ہیں۔

ہیں۔ ”The Law of Retribution“ ۱۸۶

جناب مرزا مامول انور ۱۹۵۰ء میں ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کے ذمہ دار مقرر ہوئے اور ۱۹۷۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ قانونِ مکافات کی اشاعت ۱۹۹۰ء میں ہوئی۔ آپ نے بہت سا تحریری ورثہ چھوڑا جو شاید غیر محفوظ ہاتھوں میں چلا گیا۔ انشورنس کمپنی کے گورنمنٹ

کی تحویل میں چلے جانے کے بعد آپ نے بچوں کو انگریزی، اردو اور پنجابی پڑھانا شروع کر دیا۔ اور پھر یہ زندگی کو مصروف اور اپنے انداز سے گزارنے والا شخص ۱۱ اپریل ۱۹۹۸ء کو عدم کو سدھا گیا۔

مرزا مامول انور نے اگرچہ شاعری میں غزل بھی کہی ہے لیکن آپ کی پہچان نظم بنی۔ جن میں طویل نظمیں بھی بڑے شوق سے مشاعروں میں اُن سے سنی جاتی تھیں۔ بمبئی میں قیام کے دوران تقسیم ہند سے پہلے کہی گئی ایک نظم ”عید نظارہ“ یہاں پیش کی جاتی ہے۔ مطالعہ فرمائیے۔

نہ پوچھ عید کی روداد ہم نشیں خاموش
وہ خاص و عام کو تکمیل انبساط کی دھن
وہ بزم ہائے تعیش وہ جلوہ ہائے نشاط
وہ مالا بار سے ساحل کا پُر فضا منظر
وہ سرگیں سی زمیں اور وہ نیلگوں لہریں
اور اس کے مد مقابل بلندیوں پہ بچھا
اسی بساط کی رنگیں کمین گاہوں میں
فراز و پست پہ جھرمٹ وہ ثابت و سیار
وہ ایک ہی سا تبسم حسین چہروں پر
لباس ہائے رنگا رنگ، رشکِ عریانی
وہ آزمائشِ دل، گیسوؤں کا ہر حلقہ
عرض کہ عید، عروس البلاد، کی ہدم

کے مجال کہ اس سحر سے نہ ہو مسور

کجا کہ ایک غریب الد یار خانہ بدوش

مرزا مامول انور کا انداز تغزل بھی ملاحظہ فرمائیے۔

لبوں سے آہ نکل کر دعا نہ بن جائے مرا یہ حسنِ طلب بھی خطا نہ بن جائے

صنم تراش نے تکمیل فن تو کر ڈالی اب اُس کا ترشا ہوا بُت خدا نہ بن جائے
 وفا شعار بھی اب تو فریب دینے لگے فریب ہی کہیں رسم وفا نہ بن جائے
 جزا بھی جس میں ہو شامل وہی ہے کارِ ثواب گنہ نہیں ہے جو خود ہی سزا نہ بن جائے
 خدا شناس ہی بننا کٹھن نہیں انور
 جو خود شناس ہو انساں تو کیا نہ بن جائے ۱۸۷

خواجہ فخر الدین سیالوی

ضلع سرگودھا میں سیال شریف سلسلہ چشتیہ کے رشد و ہدایت کا ایک مرکز ہے۔ جہاں سے علم و نور کی کرنیں چہار سو پھیلیں اور انسانیت کو منور کر گئیں۔ اسی سر زمین میں حضرت خواجہ غلام فخر الدین ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت خواجہ ضیاء الدین سیالوی کے تیسرے صاحبزادے تھے۔ آپ کے والد، دادا، پڑدادا اور بڑے بھائی (خواجہ قمر الدین سیالوی) سلسلہ چشتیہ کے عظیم صوفیاء میں سے تھے۔ ”باب جبریل“ کے مطابق آپ نے:

”حافظ کریم بخش صاحب سے قرآن مجید حفظ کیا۔ حضرت خواجہ

محمد حامد صاحب تونسوی سے شرف بیعت حاصل کیا۔ ابتدائی تعلیم سیال

شریف ہی میں حاصل کی۔ قطبی، میر قطبی، مشکوٰۃ شریف، مقامات حریری، اور

سبعہ معلقہ وغیرہ کتابیں مولانا معین الدین اجمیری سے پڑھیں۔“ ۱۸۸

خواجہ غلام فخر الدین سیالوی علم و ادب سے پاکیزہ شغف رکھتے تھے۔ آپ اردو، فارسی،

عربی اور پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ آپ کا شعری مجموعہ ”باب جبریل“ کے نام سے شائع ہوا۔ جس

میں اگرچہ اکثر اصناف شامل ہیں۔ لیکن جو آپ کی پہچان بنی وہ نعت ہے۔

اصغر علی نظامی جو کہ مدینۃ المنورہ میں مقیم ہیں اپنے ایک مضمون فخر نامہ میں رقم طراز ہیں:

”مدینہ طیبہ کی محفلوں میں خواجہ محمد شفیع صاحب، نور محمد جلال

صاحب، سلطانی صاحب، اصغر چشتی صاحب اور زاہد صاحب نے خواجہ صاحب کا لکھا ہوا سلام بہت دفعہ پڑھا اور درج ذیل شعر ایک سماں باندھ دیتا تھا۔

من فدایت شوم کہ کلفت ما بر تو آمد گراں، سلام علیک
”بسم اللہ شریف، کے اعداد کئی صدیوں سے ’۷۸۶‘ شمار ہوتے آ

رہے ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب حرف ’الف‘ کو لفظ ’اللہ‘ کا حصہ قرار دیتے تھے اور ہمیشہ ۷۸۷ کا عدد بسم اللہ شریف کیلئے لکھا کرتے تھے“ ۱۸۹

خواجہ غلام فخر الدین کو شاعری کی دیگر اصناف کے علاوہ مادہ تاریخ نکالنے میں بھی قدرت حاصل تھی۔ اس صنف میں اگرچہ آپ نے فارسی زبان کو زیادہ تر برتا لیکن اردو میں بھی آپ کے قطعات تاریخ کتاب کا حصہ ہیں۔ ملک گل زمان کا قطعہ تاریخ وفات آپ نے یوں لکھا ہے۔

چھپ گیا زیر زمیں اک پاک طینت نوجواں حسرتا جس کے الم میں ہے زمانہ نوحہ خواں
بدھ کی شب تھی اور اٹھائیسویں ماہ رجب جب شہادت پا کے حاصل کی حیات جاوداں

خون کے آنسو بہا کر فخر ہاتف نے کہا

رنگ لائے گا کبھی بے ریب خون گل زمان ۱۹۰

”خواجہ فخر الدین سیالوی ایک مرنجاں مرنج اور ہمہ جہت شخصیت

کے حامل تھے۔ وہ حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھے۔ ان کی شخصیت پر ایک

ٹھہری ہوئی شفاف جھیل کا گماں ہوتا ہے۔ جس کا نیلا صاف پانی پاکیزگی کا

منظر ہوتا ہے اور جس کی گہرائی اس کے من کی رفعت کی غماز رہتی ہے۔“ ۱۹۱

آپ نے ۲۵ ربیع الاول ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹ جولائی ۱۹۹۸ء کو وفات پائی اور سیال شریف میں

دفن ہوئے۔ ۱۹۲ء آپ نے ”باب جبریل“ (شاعری) کے علاوہ۔ ”حقوق والدین“ اور ”الفقر و فخری“ کے

نام سے دو کتابیں حسن تحقیق کا منظر بھی یادگار چھوڑیں۔ آپ کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

میلا د شریف

مرحبا آ گیا پیارا پیارا جن زینت محفل و رونق انجمن
 بزم گلشن میں تجھ سے بہار آ گئی رشک گلزار جنت بنے کوہ و بن
 لائی بادِ صبا بوئے زلف دوتا بن گئی ہے فضا ساری مشکِ ختن
 کیف میں قمریاں گنگتانے لگیں مست بے خود ہوئے طائرانِ چمن
 گیت خوشیوں کے سب مل کے گانے لگے نرگس ولالہ و سنبل و یاسمن
 تیرے جو بن کی خیرات سب کو ملی پھول کو رنگ و بو، سرو کو بانگین
 سب ترے حسن کی ہیں یہ نیرنگیاں ورنہ پھولوں کے ہیں کاغذی پیرہن
 بلبلِ خوشنوا مسکرا کر ذرا
 فخر کا کچھ سنا تازہ شیریں سخن

غزل

خیال دلربا کو آج مہماں کر رہا ہوں میں جنونِ وحشت و سودا کا ساماں کر رہا ہوں میں
 سجایا باغِ دل ایسا ہے داغوں سے تری خاطر کہ نرگس لالہ و ریحماں کو حیراں کر رہا ہوں میں
 رقیبوں کا ہے گھیرا درمیاں میں رشکِ گلشن ہے حجابِ خار سے سیرِ گلستان کر رہا ہوں میں
 بیادِ سبز خطِ فصلِ خزاں بھی موسمِ گل ہے بہارِ فصل کو پامال ہجراں کر رہا ہوں میں
 شبِ دیبجور و دشتِ سہمگیں اور خوفِ ناکامی فقط امید پر قطعِ بیاباں کر رہا ہوں میں
 جفا میں فخرِ دلبر کے مجھے وہ لطف آیا ہے
 کہ صد ہا عیش و عشرت اس پہ قربان کر رہا ہوں میں ۱۹۳

حکیم حاجی نور محمد

نور محمد نام اور ابو ظفر کنیت کے ساتھ آپ حج کی سعادت سے مشرف ہونے کے باعث

حاجی اور حکمت (طب) کے مطالعہ کے حوالے سے حکیم کا سابقہ بھی لکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی لاحقے بھی استعمال کر لیا کرتے جو شاہپوری چشتی قادری تھے۔

حکیم حاجی نور محمد ۱۹ جولائی ۱۹۱۱ء کو شاہ پور شہر میں شیر محمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ قوم کے کھل تھے۔ آپ کے بزرگوں کے بارے کہا جاتا ہے کہ بہاولپور کے قلعہ کو آباد کیا۔ وہاں سے ملتان آ گئے۔ جہاں سے قسمت نے آپ کو گروٹ میں لا کر آباد کیا اور ان میں سے ایک کنبہ شاہ پور شہر میں مقیم ہو گیا جو زرگری کا کام کرنے لگا اسی کنبے سے حکیم حاجی ابو ظفر نور محمد شاہپوری چشتی قادری کا تعلق تھا۔ آپ اپنا سلسلہ نسب راجہ لکھپال سے جا ملاتے ہیں جس نے خواجہ حضرت معین الدین چشتی اجمیری کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ حاجی نور محمد اپنے بارے لکھتے ہیں:

”بچپن سے حکمت کا شوق تھا۔ مدرسہ سے فارغ ہو کر قرآن

شریف پڑھا۔ پھر مولوی غلام احمد مرحوم جلیپانوی سے فارسی درسی کتابیں

پڑھیں۔ مولوی حافظ حکیم عبدالرسول زبدا الحکماء سے میزان طب سے تا

مفرح القلوب فارسی میں، موجز سے تا قانون شیخ عربی میں سبقا پڑھے۔

ساتھ ہی صرف و نحو و منطق کے رسائل پڑھے۔ فقہ، حدیث و تفسیر کا مطالعہ

جاری رکھا۔“ ۱۹۳

شعر گوئی کی طرف آنا بالکل حادثاتی تھا۔ آپ کا جواں سال بیٹا محمد ظفر ۱۹ سال کی عمر میں ریل گاڑی کی زد میں آیا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کے غم کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اسی حالت میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ آپ نے اردو، فارسی، پنجابی اور عربی میں شعر کہے۔ اگرچہ فنی حوالے سے وہ اشعار کمزور تھے۔ اور اسقام بھی کچھ زیادہ ہی تھے۔ بس جو خیال ذہن میں آتا موزوں و ناموزوں اسے لکھ لیتے۔ شاید بعد میں کبھی اس جانب غور ہی نہیں کیا۔ یا ممکن ہے کہ شاعری آپ کا مطالعہ ہی نہ رہا ہو۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے اشعار یا غزلیں ان میں سے ایسی نکالی جاسکتی ہیں جو فنی حوالے سے ٹھیک قرار پاتی ہیں۔ ”مایہ حیات بو ظفر نور محمد“ آپ کا شعری مجموعہ ہے جس میں

یوان کے رنگ میں ترتیب دی گئی ہے۔ اس میں حمد، نعت، مناقب اور درد، غم، رفاقت اور جدائی وغیرہ کے مضامین لئے غزلیں شامل ہیں۔ جوان کے دل کی آواز اور آپ بیتی کا بیان ہے۔ حکیم نور محمد نے ۱۹۸۶ء میں شاہ پور شہر میں وفات پائی۔

دزدیدہ آنکھ والے دل کو بھلا چرایا باقی تھا تن یہ بے دل وہ ہجر سے جلایا
دیتے خبر نہیں وہ کب دیں گے دل کو واپس ہر دم ہے یاد اس کی جس نے مجھے بھلایا
بادل سے چاند نکلا روشن فضا ہوئی کل پھر بھی وہ چاند روشن مجھ کو نظر نہ آیا
ان کی نظر کی باتیں جاتے جو کہہ گئے تھے کیسے زباں کہے وہ کرنے کا ڈھب نہ آیا
پہلو میں آگ روشن نہ جانتا ہوں کیوں ہے شاید شمع کی مانند ہے عشق نے جلایا
اے عشق میرے صادق کر تو ہی رہنمائی

چل ساتھ مل منائیں، جائے جہاں منایا

کسی کو ہے یہاں عشرت کسی کو ہے وہاں راحت مگر ہم ہیں وہ جن کو ہر جگہ ہر وقت ہے حسرت
کہاں تک ٹھو کریں کھائیں کہاں جائیں کہاں پائیں میرے آقا سنوارو اب مری بگڑی ہوئی قسمت
تمنا ہی میں گزرے جو گزارے زندگی کے دن رہیں ہم منتظر کب تک یہی کہتے ہوئی مدت
برے ہیں یا بھلے ہیں فخر ہے سب تیری نسبت کا کسی کے بس نہ پانا تو میری حاجت مری عزت
مری یہ عرض ہے ہر دم نہ در سے دور کر دینا
ہوں قرباں نور سے تیرے، تری لچپال ہے فطرت ۱۹۵

حاتم علی حاتم

کچھ لوگ حاتم علی حاتم اور حاتم علی رانجھا کو ایک ہی شخص سمجھتے ہیں۔ جبکہ ایسی بات نہیں ہے۔ حاتم علی رانجھا کا تعلق سیالکوٹ سے تھا جہاں وہ ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے اور ۱۹۸۸ء میں وفات پائی۔ پنجابی زبان میں شعر کہتے تھے ”حسینی وکیل“ اور ”تاجدار کربلا المعروف علی دلال“ ان کی مطبوعہ کتب

تھیں جبکہ ”سجاد نامہ“ قلمی شکل میں موجود ہے۔ اور حاتم علی حاتم ”یکم اگست ۱۹۱۱ء کو چک نمبر ۲۷ شمالی ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے۔“ ۱۹۱۶ء آپ کے والد چودھری حسن محمد کا آبائی گاؤں ہریہ والا ضلع گجرات اور جاٹ وڑاہا قبیلے سے تعلق تھا۔ وہاں زمینوں پر لوگوں نے قبضہ کر لیا تو نقل مکانی کر کے یہاں آ گئے۔ حاتم علی حاتم ابھی بچے ہی تھے کہ والدین کا انتقال ہو گیا۔ حالات کے ہاتھوں سرگودھا کو بھی چھوڑنا پڑا اور ہندوستان کے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے ۱۹۲۵ء میں لاہور آ کر محکمہ تعلیم میں معلمی اختیار کر لی۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کر لی تھی۔ سو ”حاتم ہائی سکول“ کے نام سے ایک تعلیمی ادارے کی بھی بنیاد رکھی۔ جو ۱۹۷۲ء میں گورنمنٹ کی تحویل میں چلا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ آپ جہلم میں بھی مقیم رہے۔ دوبارہ سرگودھا آئے اور یہاں سے ایک ہفت روزہ اخبار ”حقائق“ کے نام سے جاری کیا۔ جو چار سال تک شائع ہوتا رہا۔ ایک ماہنامہ ”ادبی جریدہ“ لاہور سے بھی نکالتے رہے۔

حاتم علی حاتم اردو، فارسی، پنجابی اور انگریزی میں شعر کہتے تھے۔ آپ کی تخلیقات کئی ماہناموں اور ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ ”داستانِ ناتمام“ کے نام سے ایک اردو شعری مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا لیکن اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے اور ”۱۹۹۵ء“ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

”گجرات میں اردو شاعری“ میں حاتم علی حاتم کی تاریخ پیدائش یکم نومبر ۱۹۰۹ء ۱۹۷۷ء درج ہے۔ جبکہ ”سخنورانِ جہلم“ میں ۱۹۱۱ء ۱۹۸۰ء تحریر ہے۔

چودھری حاتم علی نے جوانی میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور خوشی محمد ناصر سے اصلاح لینے لگے تھے۔ چونکہ زندگی بھر حالات سے نبرد آزما رہے اور کسی ایک مقام پر ٹک کر بیٹھنا نصیب نہ ہوا اس لئے ان کی شاعری میں ہم انہیں حالات کا پرتو دیکھتے ہیں جو روایتی سا ہے۔ لیکن پھر بھی اچھا ذوق اور عمدہ فکر کو خوبصورت لفظوں میں ڈھالنے کا فن جانتے تھے۔

بے کلی آج کی شب لحظہ نہ پل جائے گی رات فرقت کی غلط بات کہ ڈھل جائے گی ان کے آنے سے مرے گھر میں چراغاں ہوگا میرے ماحول کی تقدیر بدل جائے گی

رند تو رندے و جام بھی رقصاں ہوں گے یعنی محفل کی ہر اک چیز مچل جائے گی
 توبہ اس آتشِ فرقت کے بیاں سے توبہ یوں زباں گرمی الفاظ سے جل جائے گی
 ہو نہ جائے مجھے ڈر ہے کہیں محشر برپا قلبِ سوزاں سے یونہی آہ نکل جائے گی
 جب نگاہوں سے نگاہوں کا تصادم ہو گا تیغِ ناکردہ گنہگار پہ چل جائے گی
 ان کا ہر جور ہے حاتم کو بہرنگ پسند
 ہاں ذرا ان کی طبیعت جو بہل جائے گی ۱۹۹



تعظیم کے مقام ہمیں جاننے پڑے تیری گلی کے لوگ بھی پہچاننے پڑے
 منظور تھیں حضور کی خوشنودیاں ضرور ناکردہ کچھ قصور ہمیں ماننے پڑے
 اے دوست میری کوششیں سب ہو چکیں تمام آخر مجھے رقیب کے گن ماننے پڑے
 ڈھونڈا کئے ہیں عمر بھر اک سنگ آستاں اس جستجو میں دشت و جبل چھاننے پڑے
 حاتم و نورِ شوق میں ہم کیا سے کیا ہوئے
 ٹھانے نہ تھے جو عزم کبھی ٹھاننے پڑے ۲۰۰

میر عبدالرشید اشک

عبدالرشید نام، اشک تخلص اور میر خاندان کے یہ چشم و چراغ ۲۶ جولائی ۱۹۱۲ء کو چوٹہ ضلع
 سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میر سراج دین تاجر پیشہ تھے اور کشمیر النسل تھے۔ ڈاکٹر خورشید
 رضوی نے سخنوران سرگودھا میں ان کے تعارف میں سن پیدائش ۱۹۱۵ء تحریر کیا ہے اور اسی کو نقوش
 سرگودھا میں ۲۰۳ دہرا دیا گیا ہے مجھے ۱۹۱۲ء کے حق میں جو بات لے جاتی ہے وہ یہ کہ میر صاحب نے
 حصول تعلیم کے بعد والد کے ساتھ تجارت میں بھی ہاتھ بٹایا اور پھر ۱۹۳۲ء میں سرگودھا آئے۔ یوں ۱۹۱۲ء
 سے ۱۹۳۲ء تک ۲۰ سال عمر بنتی ہے۔ جسے ۱۹۱۵ء میں تین سال کے فرق سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

میر عبدالرشید نے والد کی وساطت سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات کی اور پھر انہیں کے حلقہء ارادت و اثر میں شامل ہو گئے۔ گیارہ سال کی عمر تھی جب موجی تخلص اختیار کر کے شعر کہنا شروع کیا۔ چونکہ شاید آپ کو اس نہیں تھا کہ وہاں سے نقل مکانی کر کے سیالکوٹ، لاہور، بہاولپور، لاکپور میں تھوڑا تھوڑا عرصہ قیام کرتے ہوئے ۱۹۳۲ء میں سرگودھا میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ اور سیاست کے خاردار سے ہوتے ہوئے صحافت کے میدان میں آخر قدم جمایا۔

جناب انور سدید لکھتے ہیں:

”سرگودھا سے اک ہندو کانگریسی نے ”سرگودھا سماچار“ کے نام سے اخبار جاری کیا اور ادارت کے لئے نوجوان ادیب عبدالرشید اشک پر نظر جاٹھری۔ اور ”سرگودھا سماچار“ کا پہلا پرچہ چھپا تو اس پر بطور ایڈیٹر عبدالرشید اشک کا نام درج تھا۔ اس زمانے میں اشک صاحب نے مارکسی تحریک کا مقدور بھر مطالعہ کیا۔ سو وہ غیر طبقاتی نظام سے بہت متاثر تھے۔

”سرگودھا سماچار“ کا مالک کٹر کانگریسی تھا لہذا ان دنوں کا نباہ نہ ہو سکا۔ اور عبدالرشید اشک اخبار سے علیحدہ ہو گئے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر وہ بہت خوش تھے۔ لیکن بعد کے حالات نے انہیں دل برداشتہ کر دیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے ہفتہ وار اخبار ”شعلہ“ جاری کیا اور اس کی پیشانی پر جو طغریہ درج تھا:

خودی کونہ دے سیم وزر کے عوض ہیں دیتے شعلہ شرر کے عوض“۔ ۲۰۳

”شعلہ“ اخبار جاری کرنے سے پہلے آپ نے الطاف مشہدی سے جہاں شاعری میں بہت کچھ سیکھا وہاں صحافت میں بھی مہارت حاصل کی اور ان کے ہفت روزہ ”خلوص“ میں بھی کام کیا۔ ۱۹۵۲ء میں ”شعلہ“ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ آپ کو حق گوئی اور بے باکی کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ شعلہ بار بار جاری ہوتا اور پابندی کی زد میں آ جاتا۔ لیکن

میر عبد الرشید کا 'شعلہ' جذبے اور اخبار کی صورت رو بہ عمل رہا۔

میر عبد الرشید اشک نے ۲ جنوری ۱۹۸۶ء کو وفات پائی اور سرگودھا میں ہی دفن ہوئے۔ آپ نے عروض کو بڑی دلچسپی اور شوق سے سیکھا اور شعر میں معمولی سا سقم بھی آپ کی برداشت سے باہر ہوتا۔ آپ کا اتنا کلام اب بھی موجود ہے کہ اگر ترتیب دیا جائے۔ کم از کم ایک شعری مجموعہ شائع کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ آپ کا بہت سا کلام ضائع ہو چکا ہے۔ آپ کے بیٹے ارشد محمود کے پاس صرف ایک ڈائری محفوظ ہے۔ خدا کرے اُن کی اولاد کو اسے مستقل محفوظ کرنے کا خیال آجائے۔ دو غزلیں ملاحظہ فرمائیے۔

آنکھوں کو شوخ کوئی جو بھائے تو کیا کروں؟
 دل میں برنگِ بُو وہ سمائے تو کیا کروں؟
 جس صاحبِ حیا کی ہے فرقت، عذابِ جاں
 خوابوں کو بھی جو وہ نہ سجائے تو کیا کروں؟
 جس نے مذاقِ دشتِ نوردی سکھا دیا
 وہ آہو چشمِ ہاتھ نہ آئے تو کیا کروں؟
 ہر بات جس کی غیرتِ قد و نبات ہے
 کوئی دمِ وداعِ تبسم کی بجلیاں
 سائے سے بھی جو میرے گریزاں ہے وہ پری
 رہ رہ کے طورِ دل پہ گرائے تو کیا کروں؟
 غمزوں سے پارِ افق کے بلائے تو کیا کروں؟
 ذوقِ نظر کو نیند سی آئے تو کیا کروں؟
 آئے تو کیا کہوں وہ نہ آئے تو کیا کروں؟
 نکلا وہ چاند کا بھی ستائے تو کیا کروں؟
 بادِ سحر سے جان چھپائے تو کیا کروں؟
 جان اب تک اس کی یاد جلائے تو کیا کروں؟
 عشقِ بتاں نے حسنِ تغزلِ عطا کیا
 دل نازمہ و شوں کے اٹھائے تو کیا کروں؟

دیوانہ کوئی شدتِ دردِ فراق سے

تنہائیوں میں اشکِ بہائے تو کیا کروں؟ ۲۰۵

کل غیر یگانے تھے، غیر آج یگانہ ہے
نالہ نہ کروں کیونکر، خاموش رہوں کیسے
جب سامنے آتا ہے سل جاتے ہیں لب اپنے
ہمدرد کوئی آ کر یہ راز تو سمجھا دے
مت پوچھ مرے ہمد سن کر تو بھی رودے گا
پھینکا مرے لاشے کو صیاد نے یہ کہہ کر
ہر قطرہ اشک اپنا ہے گوہر لاثانی
پہاں مری آنکھوں میں انمول خزانہ ہے

حکیم غلام سرور نعیمی

غلام سرور نام پیشے کے لحاظ سے حکیم تھے۔ نعیمی کا لاحقہ اپنے استاد کی نسبت سے استعمال کیا کرتے تھے۔ آپ بدھوکوٹ تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ کے ایک مذہبی گھرانے میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام عبدالحق تھا۔ ابتدائی تعلیم بدھوکوٹ میں ہی حاصل کی۔ بعد ازاں مختلف مدارس سے ہوتے ہوئے گجرات میں مولانا مفتی احمد یار خان نعیمی کی شاگردی میں آگئے دورہ حدیث مکمل کیا اور خود بھی مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کچھ عرصہ طورہ شریف ضلع اٹک میں حضرت دوران بادشاہ کے ہاں بھی قیام رہا۔ ۱۹۵۸ء کے لگ بھک آپ سرگودھا میں منتقل ہو گئے۔ اور حکمت سے شغل فرمانے لگے ساتھ ہی دینی و علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ مدرسہ مدینہ غوثیہ مسجد حامد علی شاہ میں بھی کچھ عرصہ تدریسی اور علمی خدمات ادا کرتے رہے جہاں بہت سے طلبا آپ سے فیض یاب ہوئے۔ آپ سرگودھا میں اہل سنت کے سرکردہ شخصیات میں سے تھے۔ آپ کو اردو، پنجابی، عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ حکمت میں آپ گولڈ میڈلسٹ تھے۔ آپ طبی فاؤنڈیشن کے بنیادی ممبران میں سے تھے۔ طب کے حوالے سے آپ نے چند ایک کتب تحریر کیں جو فاؤنڈیشن

کے ارباب اشاعت کے لیے لے گئے لیکن بعد میں اُن کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

حکیم مفتی غلام سرور نعیمی نے ۱۴ دسمبر ۱۹۹۴ء کو وفات پائی اور فیکٹری ایریا کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ”احادیث اربعین فی شان انیس الغریبین“ آپ کی مطبوعہ کتاب ہے۔ جس میں چالیس احادیث پاک کا منظوم ترجمہ شامل ہے۔ اور یہ ترجمہ آپ کے پختہ کار شاعر اور عالم دین ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ اس کتاب کا ابتدائیہ بھی مقفی ہے۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں:

”بفصلِ رحمن، خالقِ زمین و زماں و مکین و مکاں و چنیں و چناں و
حور و غلماں و جن و انساں، صاحبِ الایماں، فرحاں و خنداں، مطیعِ فرماں،
خواجہء دوراں، ربیعِ شام، حبیبِ الرحمان، صاحبِ القرآں کی زبانِ معجزہ
بیاں کے قصیدہ خواں اور انبیاء گزشتہ زماں میں رطب اللساں ہیں اور حضرت
حسان شاعرِ نبی آخر الزماں کے فعل برداروں سے بندہ حقیر حکیم غلام سرور
نحیف و ناتواں، احادیثِ سید الانس و الجان کا ادنیٰ ترجمان، اشعارِ
اردو زباںِ اُلمسکمی بہ احادیثِ اربعین فی شانِ انیس الغریبین حصہ دوم ہدیہء
ناظراں ہے۔“ ۲۰۸

اس طرح یہ تحریر آگے چلتی ہے۔ اس سے پہلے بھی آپ نے احادیثِ اربعین منظوم ترجمہ
تحریر کیا۔ جس کے بارے میں آپ کے بیٹے کو علم نہیں۔ اُن کے علم میں یہی حصہ ہے۔ لیکن خواجہ بشیر
راجن لکھتے ہیں:

”حکیم صاحب حضور نبی کریم کے فرمودات (احادیثِ اربعین

حصہ اول) کا ترجمہ منظوم اردو زبان میں چھپوا کر عاشقانِ رسول کریم ﷺ کی

خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔“ ۲۰۹

اس کتاب میں ہر حدیث کا ترجمہ، بعد ازاں کلامِ شانِ سیدالابرار اور نتیجہء حدیث جیسے

مضامین شامل ہیں۔ دو احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

حدیث نمبر ۴ مشکوٰۃ صفحہ ۲۶ باب اثبات عذاب القبر - چھاپہ اصح المطابع

روایت یہ ابو داؤد ہیں عثمانؓ سے لائے
نبی اکرمؐ نے احساں جو مسلمانوں پہ فرمائے
ہوئے فارغ جو نہی تدفین میت سے نبی اکرمؐ
سر تربت ہوئے وہ محو و مصروف دعا یکدم
رہے ثابت قدم اس آن یہ وحدت کا شیدائی
نکیریں کے سوالوں کی گھڑی اس پر ہے اب آئی
باستغفار مانگو مغفرت اپنے برادر کی
گدا بن کے اے سرور چاہو نصرت رب قادر کی

نتیجہ حدیث

حضورؐ پاک سے ہم تک خبر لائے ہیں یہ عثمانؓ
پڑھو تم فاتحہ میت کی خاطر یا پڑھو قرآن
سورہ اخلاص بھی اور فاتحہ ہم دونوں پڑھتے ہیں
درود پاک پڑھتے اور پھر ہم عرض کرتے ہیں
فلاں کو اے خدایا یہ کلام پاک پہنچا دے
نہی پھر کس طرح ثابت ہوئی کچھ ہم کو بتلا دے
نہ ثابت کر سکے پھر کیوں جہالت کا پجاری ہے
ہمیں تو یہ حدیث پاک بھی دل جاں سے پیاری ہے
کرو تم التجا رب سے کہ پہنچاتا ہے وہ والی
خبر کے فہم سے تو کس لئے منکر رہا خالی
خبر ہے، حرف قرآن کا جواک ورد زباں کر لے

وہی عشر وا مثالِ حسنہ سے دامانِ دل بھر لے
 کہ استغفار سے میت مسلمان مغفرت پائے
 اے سرور ہو گیا ثابت وہ بے حد مغفرت پائے ۲۱۰
 حدیث نمبر ۲ مشکوٰۃ شریف چھاپہ صحیح المصابیح ص ۵۳۳ باب المعجزات

ہے مولیٰ سلمہ بن اکوع نے ارشاد فرمایا
 نشاں جب سلمہ کی پنڈلی پہ میں نے زخم کا پایا
 کہا میں نے کہ اے سلمہ ضرب پنڈلی پہ کیوں آئی
 کہا سلمہ نے دن خیبر کے میں نے حرب میں پائی
 ہوا مشہور لوگوں میں کہ ہے مارا گیا سلمہ
 نبیؐ کی خدمتِ اقدس میں تب لایا گیا سلمہ
 نبیؐ نے زخم پہ سہ بارہ مجھ کو دم جو فرمایا
 نہیں اس وقت سے اب تک کوئی رنج و الم پایا
 نبیؐ محترم کے دم سے سلمہ نے شفا پائی
 لکھا مشکوٰۃ یوں سرور، بخاری بھی اسے لائی
 نتیجہء حدیث

محمدؐ بے سہاروں کے سہارا بنتے رہتے ہیں
 پریشانی میں بے یاروں کے یارا بنتے رہتے ہیں
 ہوئے تھے سلمہ جب خیبر میں گہرے زخم سے گھائل
 صحابہ دیکھتے ہی موت کے اُن کے ہوئے قائل
 وہ روح اللہ تھے اپنے دم سے مردوں کو جلا دیتے
 جلی ہوں گر کجھوریں تو تھے احمدؑ پھر اگا دیتے

بھنی مچھلی خضر کے قرب میں پہنچی ہوئی زندہ
 محمدؐ کی غلامی سے خضرؑ کی شاں ہے تابندہ
 بنا کر مٹی کے طائر تھے عیسیٰ نے اڑا ڈالے
 محمدؐ نے بھی تو کنکر کو تھے کلمے پڑھا ڈالے
 کلیم اللہ نے پتھر سے گر چشمے چلا ڈالے
 یدِ رحمت سے حضرتؑ نے بھی چشمے تھے بہا ڈالے
 سبھی کفار کا منہ ایک مشتبہ خاک سے پھیرا
 کہیں ادنیٰ اشارے سے کلیجہ چاند کا چیرا
 جو تعظیم بتاں میں محو رہتے سر جھکاتے تھے
 نگاہِ مصطفیٰؐ پا کر بتوں کو وہ مٹاتے تھے
 دیا وافر عرب کے بدوؤں کو علم عرفاں سے
 نکالا کفر سے تزمین بخشی نورِ ایماں سے
 ثعل کو مرتبہ بخشا ثریا تک پہنچا ڈالا
 خدا کی وحدانیت کا سبق اُن کو پڑھا ڈالا
 جسے جو چاہیے اس کو وہی کچھ وہ عطا کر دیں
 روحانی اور جسدی رحمتِ حق سے شفا کر دیں
 نبیؐ کا خاص احساں ہے سبھی کے زخمِ غم بھرنا
 مرا شیواہ ہے سرورِ نعتِ نبویؐ کو رقم کرنا

اختر حسین رنگین

رنگین کا تعلق اہل سادات سے تھا۔ نام اگرچہ سید اختر حسین تھا لیکن طبیعت کی رنگینی سے

میل کھاتا ہوا تخلص انتخاب کیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۲ء کو قاضیواڑہ (انبالہ) میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کی اور سرگودھا کو سکون بنایا۔ چونکہ آپ پینٹر اور خوش نویس بھی تھے۔ لہذا انبالہ میں معاشی ضرورتیں خوش نویسی ہی سے پوری کرتے تھے۔ بعد ازاں سرگودھا آنے پر شیشے کا کاروبار کرنے لگے۔ یہ بھی اپنے تخلص کی طرح کا انتخاب تھا۔ آپ نے اپنی شاعری کو سنبھال کر نہیں لکھا۔ طنز و مزاح بھی آپ کے مزاح کا حصہ تھا۔ بس جو کچھ لوگوں کو یاد رہ گئے۔ محمود اسیر نے جو نمونہ کلام پیش کیا ہے۔ درج ذیل ہے۔

اختر حسین رنگین نے ۴ ستمبر ۱۹۸۰ء کو وفات پائی ۲۱۲

ہم ترستے ہیں ایک چلو کو غیر پیتے ہیں ہیں بھر کے پیمانے
ہشتم رحمت سے اس کی اے رنگین دوست بھی بن گئے ہیں بیگانے

☆

بعد مرنے کے مری قبر پہ رکھنا تندور تاکہ معلوم ہو فاقے سے مرے ہیں یہ حضور

☆

ہم کو منظور نہیں تجھ کو ستانا صاحب عرض یہ ہے کہ ہمیں بھول نہ جانا صاحب

سلیم بھٹی

محمد فیروز الدین نام، سلیم تخلص، بھٹی خاندانی لاحقہ اور ابو الخیال کنیت کے ساتھ کبھی کبھی ابو الخیال ایم فیروز الدین سلیم بھٹی بھی لکھ لیا کرتے تھے۔ آپ یکم جنوری ۱۹۱۳ء کو بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ سے پاس کیا۔ ابو شاہین فاروقی آپ کے علمی و عملی کیریئر کے بارے مزید لکھتے ہیں:

”۱۹۳۰ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پورے پنجاب میں

اول رہے۔ ۱۹۳۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے فاضل اردو کا امتحان پاس کر

کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ پھر ۱۹۳۲ء میں فاضل پنجابی کے امتحان میں

نمایاں حیثیت حاصل کی۔ آپ لاہور میں سوشیلا کالج کے پرنسپل رہے۔
۱۹۳۸ء میں لاہور سے بھیرہ منتقل ہو گئے۔ یہاں بھی درس و تدریس کے
فرائض انجام دیتے رہے۔ گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ سے ۱۹۷۱ء میں ریٹائر
ہوئے۔“ ۲۱۳

سلیم بھٹی ساری زندگی تدریس کے شعبے سے منسلک رہے۔ گورنمنٹ کی ملازمت سے
ریٹائرمنٹ کے بعد آپ اقبال پبلک سکول بھیرہ کے پرنسپل بھی رہے۔ آپ سکول میں طالب علمی
کے زمانے سے شعر و ادب کا شوق رکھتے تھے۔ منشی فاضل، اردو فاضل اور فاضل پنجابی کے امتحانات
پاس کرنا بھی اسی شوق کے باعث تھا۔ آپ نے اخلاق عاطف کو ایک خط میں اپنی چار تصانیف کا ذکر
کیا تھا جن کے نام ہیں:

”شعلے“، ”ہونکے“، ”خارِ مغیلاں“، اور ”انگارے“ لیکن ان میں سے کوئی مسودہ کتابی
صورت میں منظر عام پر نہیں آیا۔ ان کے علاوہ سلیم بھٹی کے بھانجے فیاض احمد خان کے پاس ایک مسودہ
بعنوان ”آرزو سے آرزو تک“ میں نے دیکھا جس میں تقریباً سب غزلیں ہیں۔ اور انہیں کے پاس
ایک اخبار کا تراشہ دیکھا جس پر یکم فروری ۱۹۹۲ء ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ ۲۱۴ اندازہ یہی لگایا گیا کہ ۳۱
جنوری کو آپ کی وفات ہوئی۔ لیکن ماہنامہ شمس الاسلام میں سلیم بھٹی کی تاریخ وفات ۱۴ فروری ۱۹۹۲ء
تحریر ہے۔ ۲۱۵ آپ نے سکول میں بھی ایک ادبی انجمن ”بزمِ رنگین“ کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔
جس کے صدر مولانا حکیم محمد زبیر نسیم اور سیکرٹری آپ تھے۔ آپ نے ۲۰۰۰ء کے لگ بھگ وفات پائی۔

غزل

میں پستیوں میں بھی اونچائیوں سے گزرا ہوں ترے خیال کی پرچھائیوں سے گزرا ہوں
تری اداؤں کی مجھ کو نہیں کوئی پرواہ ہزار بار میں رعنائیوں سے گزرا ہوں
رہا نہ ہوش مجھے دل رہا نہ قبضے میں میں کس کی انجمن آرائیوں سے گزرا ہوں
تھا جن پہ تکیہ وہی بن گئے عدو میرے میں خود فریب شناسائیوں سے گزرا ہوں

رہے ہیں رات کے تارے بھی ہم سفر میرے شبِ فراق کی گہرائیوں سے گزرا ہوں
 میں کیسے عشق کی بازی کو ہار سکتا ہوں ترے شباب کی انگڑائیوں سے گزرا ہوں
 دیا نہ راستہ ساحل کے ریگزاروں نے میں بحرِ عشق کی گہرائیوں سے گزرا ہوں
 سلیم آج بھی ہے فخر اُن کی قربت کا
 یہ اور بات کہ رسوائیوں سے گزرا ہوں ۲۱۶



اگرچہ راہ میں صدیوں کے فاصلے ہیں ابھی یہی بہت ہے کہ منزل کے راستے ہیں ابھی
 یہ بات سچ ہے کہ رستہ ہے کربلا کی طرح مگر یہ بات بھی سچ ہے کہ چل رہے ہیں ابھی
 وہ رابطہ ہے کہ اب ربط نامکمل ہے وہ زمستاں ہے جسے ہم بھی سوچتے ہیں ابھی
 وہ داستان جو ترے نام سے عبارت ہے سنا چکا ہوں مگر لوگ پوچھتے ہیں ابھی
 وہ رات بھر ہی اندھیروں کے تجزیے میں سلیم
 وہ سوچکا ہے مگر لوگ جاتے ہیں ابھی ۲۱۶

الطاف مشہدی

سید الطاف حسین مشہدی ولد علی حسین شاہ کی تاریخ پیدائش اور مقام پیدائش میں تذکرہ نگاروں کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پروفیسر محمد اسلم ۲۱۷ کے مطابق ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے شعری مجموعے ”داغ بیل“ ۲۱۸ اور ”شاخ گل“ ۲۱۹ ”گہائے رنگ رنگ“ ۲۲۰ ”ہمارے اہل قلم“ ۲۲۱ ”اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبالے کر“ ۲۲۲ ”سخنوران سرگودھا“ ۲۲۳ وغیرہ تمام کتب میں متفقہ طور پر تحریر ہے کہ ”۱۰ فروری ۱۹۱۴ء کو آلو مہار شریف ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔“ لیکن یہاں میں الطاف مشہدی کی اپنی ایک تحریر کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ وہ رقمطراز ہیں: ”۱۰ جون ۱۹۱۴ء کو چک نمبر ۱۱ جنوبی سرگودھا میں پیدا ہوا۔“ ۲۲۴ اسی تحریر سے ان کے کچھ مزید حالات بھی

بمیں ملتے ہیں۔ اور وہ یوں:

”بچپن ہی میں والد محترم کا سایہ اٹھ گیا۔ یتیمی کی گود اور والدہ محترمہ کے سایہ میں پل کر جوان ہوا۔ چک نمبر ۱۱۰ جنوبی ضلع سرگودھا، لالیاں ضلع جھنگ، جامکی ضلع سیالکوٹ اور دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ ادب برائے زندگی کو ادب برائے ادب کے لباس میں پیش کرنا میرا آرٹ ہے۔۔۔

بہت سے رسائل و اخبارات میری ادارت میں مختلف مقامات سے شائع ہوتے رہے ہیں اور حال ہی میں ماہنامہ ”ہم لوگ“ کو ناقدریء احباب کی نذر کر چکا ہوں۔ آجکل سرگودھا میں بیمار ہوں اور موت کا منتظر۔ اگر عزیزان احمد حسین رشک، مظہر گیلانی، صابر گیلانی اور نوازش گیلانی کی محبت کا پھاہا احباب کے عطا کردہ زخموں پر نہ ہوتا تو شاید میں وقت سے قبل ہی اپنی محبوب موت سے جا ملتا۔“ ۲۲۵

شاعرِ شباب سید الطاف مشہدی کی اس تحریر سے ان کے حالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس پر مزید کچھ کہنے کے بجائے ان کے کچھ عم عصر شعراء اور ناقدین کے حوالے سے چند اقتباسات تحریر کروں گا تاکہ الطاف مشہدی کی شاعری اور دنگ لہجے سے صحیح واقفیت ہو سکے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی کہتے ہیں!

”میں نہایت ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ الطاف مشہدی معاصرین میں قابل رشک مقام کے مالک ہیں۔“ ۲۲۶ عبدالمجید سالک کا کہنا ہے:

”الطاف مشہدی اردو شاعری میں ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ان کا تعارف کرانا بے معنی سی بات ہے۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ الطاف مشہدی ہمارے شعراء کی صف اول میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور رومانی شاعری میں تو ان کی شاید ہی کوئی مثال ہو۔“ علامہ پنڈت برجموہن کیفی داتا تریہ لکھتے ہیں: ”الطاف مشہدی کی ایک ایک نظم ایک دیوان پر بھاری ہے۔“ ڈاکٹر سید محی الدین

قادری زور نے لکھا تھا کہ: ”ہندوستانی زبان اس وقت تک پوری طرح جلوہ آرا نہیں ہو سکے گی جب تک الطاف مشہدی جیسے شاعر اس کی طرف توجہ نہیں دیں گے۔“ نیاز فتحپوری کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ”الطاف کا نام عرصہ سے ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے۔ ان کی شاعری ہم کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور ایک نئے نظام کا پتہ دیتی ہے۔“ ۲۲۷

احمد سرفراز اعوان کا کہنا ہے:

”ایک زمانے میں الطاف مشہدی کی دھوم خیبر سے اس کماری تک تھی اور برصغیر میں ہونے والا کوئی مشاعرہ الطاف مشہدی کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کی نظم ”اقبال کا پیغام“ ہر شخص کی زبان پر تھی اور اس کا یہ مصرع ۔ پتہ بھی نہیں ملتا بغیر اس کی رضا کے“ تو ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ریڈیو کی ہر مجلس میں اس کے گیت شامل ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی رومانی شاعری کا ایک عہد ختم ہو گیا۔“ ۲۲۸

”اردو زبان کے رومانی شاعر شباب حضرت الطاف مشہدی کا کلام ہندوپاک کے ممتاز جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔۔۔ اور ان میں ان کے بلند پایہ رومانی اشعار، غزلیں، نظمیں اور گیت شائع ہوتے رہتے ہیں۔۔۔“

شاعر شباب حضرت الطاف مشہدی گیت لکھنے کا خاص ملکہ اور

سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس صنف شعر میں ان کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔“ ۲۲۹

مشاہیر کے یہ حوالے دینے کا مقصد یہ ہے کہ اتنے عظیم شاعر کو ہم لوگوں نے بالکل بھلا دیا ہے۔ اگر ڈاکٹر سلیم اختر نے ”مختصر ترین ادبی تاریخ“ میں الطاف مشہدی کو شامل نہیں کیا تو ان سے ہم کیا گلہ کریں۔ ہم نے خود بھی تو اپنے اس شاعر کو بھلا دیا ہے۔

ایک اور حوالہ یہاں دینا شاید مناسب ہو کہ حیدر قریشی اور اس کے ماہیانگاروں نے آج تک اردو ماہیا پر جتنی بھی تحقیق کی ہے اور پہلے ماہیانگار کو سامنے لانے کی کوشش کی تو ایک ہی نام ان

کے سامنے آیا اور وہ ہے ہمت رائے شرما کا۔ جب کہ اس میں حقیقت نہیں۔ لیکن آج تک کسی نے بھی الطاف مشہدی کے ماہیے پر غور نہیں کیا۔ افسوس کہ میں ایک مدت سے ”الطاف کے گیت“ کا پہلا ایڈیشن تلاش کرنے میں سرگرداں ہوں۔ لیکن تاحال ناکامی ہے۔ لیکن یہی کتاب جو ۱۹۴۹ء میں دوسری بار شائع ہوئی۔ اس میں ۲۵ ماہیے شامل ہیں۔ فرق صرف ماہیا کے اجارہ داروں کے ماہیوں میں اور ان میں ہیئت کا ہے۔ الطاف مشہدی کے یہ ماہیے ڈیڑھ مصرعی ہیئت میں ہیں۔ جب کہ وہ تین مصرعی ماہیے کے پرچارک ہیں۔ راقم اس موضوع پر تفصیل سے ایک مضمون لکھ چکا ہے جو سہ ماہی درپچہ انٹرنیشنل ۲۰۰ میں شائع ہو چکا ہے۔ بہر حال یہ ایک طویل طلب بحث ہے۔

جناب الطاف مشہدی نے نثر اور نظم میں کئی تصانیف چھوڑیں جو اپنا مقام اور مرتبہ رکھنے کے باوجود گرد کی تہہ میں دب گئی ہیں۔ ان کی جو کتب میرے علم میں آئی ہیں ان میں ”تصویر احساس“، ”الطاف کے گیت“، ”الطاف کے نغمے“، ”ڈگر“، ”ریحانہ“، ”داغ بیل“، ”پریت کے گیت“، ”لذت رنگ و بو“، ”مقامات نظر“ اور ”شاخ گل“ شامل ہیں۔ ایک عہد پر شعری پہچان رکھنے والا یہ شخص ۲۴ جون ۱۹۸۱ء کو سرگودھا ۲۳۱ میں کسمپرسی کی حالت میں وفات پا گیا۔ مالک رام نے ۱۹۹۱ء سن وفات شاید غلطی سے لکھ دیا ہے۔ ۲۳۲

کرم حیدری نے ۱۹۴۵ء کے مری کے ایک آل انڈیا مشاعرہ کی روئیداد بیان کرتے ہوئے الطاف مشہدی کی شاعری کا ذکر ان میں الفاظ میں کیا ہے:

”الطاف مشہدی اپنی شاعری میں انگریزوں کے خلاف باغیانہ

اور کھلے روس پسندانہ جذبات کا اظہار بڑی شد و مد سے کرتے تھے۔

مشاعروں میں وہ اپنی باغیانہ انداز کی نظم ”اپنے دن اور اپنی راتیں“ بڑے

جوش و جذبات سے سنایا کرتے تھے۔ آواز پاٹ دار تھی اور پڑھنے کا انداز

نہایت عمدہ تھا۔“ ۲۳۳

آپ کے شاعر رومان ہونے میں تو کسی ناقد کو کوئی شک نہیں۔ لیکن مذکورہ نظم کا لہجہ واقعی

ہٹ کر تھا۔ لہذا رومان اور شباب سے ہٹ کر لکھی گئی یہ نظم ملاحظہ فرمائیے۔

اپنے دن اور اپنی راتیں

خونیں ہے آکاش کی رنگت دھرتی تھر تھر کانپ رہی ہے
 دولت کی دیوی راہوں میں سینہ پکڑے ہانپ رہی ہے
 بندوقیں کاندھوں پر رکھ کر باغی ہر سو گھوم رہے ہیں
 اونچے اونچے میناروں پر سبز پھریے جھوم رہے ہیں
 چاروں جانب پھیل رہا ہے خون کے فواروں کا منظر
 خون کے فواروں کا منظر پیلے انگاروں کا منظر
 آگ کے شعلے خون کے چھینٹے تیر رہے ہیں سرخ فضا میں
 چیخوں کا طوفان بپا ہے بھڑ بھڑ کرتی گرم ہوا میں
 جھونپڑیوں نے اونچے ایوانوں کی گردن توڑ کے رکھ دی
 مظلوموں نے ظالم انسانوں کی گردن توڑ کے رکھ دی
 بھوک کے ماروں کی رگ رگ میں آگ کے طوفاں جاگ اٹھے ہیں
 فطرت جن پر نازاں ہے وہ کامل انساں جاگ اٹھے ہیں
 مزدوروں کی آنکھوں میں ہیں کڑوی تحریروں کے فقرے
 شریانوں میں دوڑ رہے ہیں خونی تقریروں کے فقرے
 ابھرے شانوں والے دہقاں شہروں میں چنگھاڑ رہے ہیں
 زرداری کے سینے پر افلاس کا پرچم گاڑ رہے ہیں
 دوشیزائیں بک نہ سکیں گی عصمت اب نیلام نہ ہو گی
 بھوکی بیواؤں کی عزت زرداروں پر عام نہ ہو گی
 کالی آنکھیں نیلی آنکھوں کے آگے اب جھک نہ سکیں گی

سرمایہ کی سانسوں سے مزدور کی سانسیں رک نہ سکیں گی
 مزدوروں کے سزا پر اینٹوں کو ترجیح نہ دی جائے گی
 ابھرے شانوں چوڑے سینوں کی توہین نہ کی جائے گی
 پتلے ہونٹوں لمبی آنکھوں کا اب سے بیوپار نہ ہو گا
 کاغذ کے ٹکڑوں سے اچھا عسرت کا بیمار نہ ہو گا
 باتوں پر اب قید نہ ہو گی لب سینے کا حکم نہ ہو گا
 بھورے رنگ کی موت کے سائے میں جینے کا حکم نہ ہو گا
 آج سے جیون اپنا ہو گا اپنا دن اور اپنی راتیں
 میٹھی بولی، مست ترانے، اتم نغمے، سندر باتیں ۲۳۳

غزل

سحر جب مسکرا کر اوس کے موتی پروتی ہے مناظر سے گلے مل کر بڑی تسکین ہوتی ہے
 کسی کی آنکھ میں یوں میکدہ آرام کرتا ہے شفق کی گود میں جیسے شعاع مہر سوتی ہے
 لکھا ہے وقت کے ماتھے پہ اک مردِ قلندر نے کہ میخواری کی ہر لغزش بڑی معصوم ہوتی ہے
 کہیں پھولوں کے ہونٹوں پر تبسم رقص کرتا ہے کہیں کنج چمن میں زگرس بیمار روتی ہے
 وہ آنسو جس کو پی کر آدمی انسان بنتا ہے اگر ٹپکے تو قطرہ ہے جورک جائے تو موتی ہے

مری بیمار آنکھیں رات بھر الطاف روتی ہیں

یہ شبنم دل کے زخموں پر بڑی اکسیر ہوتی ہے ۲۳۵

شمیم بھیروی

خواجہ عبداللطیف نام اور شمیم تخلص تھا۔ ”۱۴ فروری ۱۹۱۴ء کو بھیرہ میں آنکھ کھولی۔“ ۲۳۶

آپ کے والد کا نام خواجہ محمد صدیق میٹھی تھا جو خود بھی شاعر تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے۔ آپ کے

دادا کرمدین سیٹھی بھی پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ یوں شاعری آپ کے خون میں سلسلہ بہ سلسلہ چلی آرہی تھی۔ اور علم و ادب آپ کی گھٹی میں پڑا تھا۔

اکثر شعراء اور ادباء کی تاریخ پیدائش میں اختلاف دیکھنے میں آتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل تاریخ پیدائش کچھ اور ہوتی ہے لیکن جب انہیں سکول میں داخل کرایا جاتا ہے تو عام طور پر عمر ایک سال یا چند مہینے کم لکھائی جاتی ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ملازمت کہیں ملتی ہے اور عمر کم ہوتی ہے تو پھر کاغذات میں بڑھادی جاتی ہے۔ لہذا اس قسم کے اختلافات دیکھنے میں آئے ہیں یہاں بھی شمیم بھیروی کی ایک دوسری تاریخ ولادت سید محمد عبداللہ قادری نے اپنے مضمون ”قاضی سلطان محمود قادری لہنی شاعر اور ادب کا عقیدت“ میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۴ء لکھی ہے۔

شمیم بھیروی نے میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ سے پاس کیا۔ طالب علمی کے دوران جبکہ آپ ابھی صرف سات سال کے تھے تو شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ میٹرک کے بعد ہائر ایجوکیشن کیلئے علی گڑھ گئے۔ لیکن والد ماجد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی غرض سے واپس آ گئے۔ اس سلسلے میں ملک کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں جب پشاور گئے تو پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ البتہ درمیان میں بمبئی کچھ عرصہ گزارا اور وہاں فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ محمد شفیع صابران کے بارے میں لکھتے ہیں:

”پشاور میں روزنامہ ”شہباز“ اور دوسرے اخباروں سے وابستہ رہے۔ اپنا اخبار بھی ”شیرازہ“ کے نام سے نکالا جو آج تک باقاعدگی سے نکل رہا ہے۔ ریڈیو پاکستان سے ان کے فیچر پروگرام اور تقریریں نشر ہوتی رہیں۔ مشاعروں میں بھی حصہ لیتے اور ادبی انجمنوں میں بھی پیش پیش رہتے۔ دائرہ ادبیہ کے ایگزیکٹو ممبر تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ نظم و نثر قلم برداشتہ لکھتے اور خوب لکھتے۔ نثر میں نیاز فتحپوری سے متاثر تھے۔ تنقید نگاری کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اقبال کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اپنی بات پر

ڈٹ جانے والے شخص تھے۔ بحث مباحثہ کیلئے ہمیشہ تیار رہتے۔ فروری ۱۹۸۴ء میں ابا سمن آرٹس کونسل میں ان کے ساتھ شام منائی گئی تو اہل علم نے بڑھ چڑھ کر ان کے کلام کی تعریف کی۔ تھوڑا عرصہ بعد ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو فوت ہو گئے۔ دل کا عارضہ جان لیوا ثابت ہوا۔ شیخ جنید بابا کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔“ ۲۳۸

تاریخ ادب میں شمیم بھیروی کا نام ایک اہمیت کا حامل ہے۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے افسانے بھی لکھے اور مضامین کے تراجم بھی کئے اور تحقیق بھی۔ کالم بھی لکھے اور فیچر بھی۔ ابو شاہین فاروقی پشاور میں ان کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

”یہاں آ کر اردو کے علاوہ فارسی، پشتو اور ہندکو میں بھی شعر کہنے لگے۔ انہوں نے علامہ اقبال اور خوشحال خان خٹک کے سینکڑوں اشعار نظم میں ترجمہ کئے۔ رحمان بابا پر ”بیان الرحمن“ کے نام سے ضخیم محاکمہ لکھا۔ پچاس سال اردو صحافت میں بحیثیت مضمون نگار، ادارہ نویس اور کالم نویس کے حصہ لیا۔ ریڈیو پر سالہا سال تک فیچر، مضامین اور شعر براڈ کاسٹ کرتے رہے۔“ ۲۳۹

شمیم بھیروی نے ساری زندگی پشاور میں گزار لی لیکن اپنی جنم بھومی سے یادوں کی حد تک مکمل تعلق قائم رکھا اور وہ ہے نام کے ساتھ بھیروی لکھنے کا۔ بالکل ایسے ہی جیسے اختر سردی نے ساری زندگی سرگودھا میں گزار لی لیکن آخری لمحوں تک سردی رہا۔ جلیل حسینی نے مرزا محمود سردی کا خاکہ جب لکھا تو شمیم بھیروی کا تذکرہ لازمی سمجھا۔ لہذا وہ لکھتا ہے کہ:

”ہائے شمیم بھیروی بڑا اچھا یار ہے۔ مرنجاں مرنج۔ سوگالی گن کر دو مسکراتا رہے گا۔ لیکن ظالم ایک ایسی دبی زبان میں کہہ دیتا ہے کہ

ساتوں کپڑوں میں آگ لگ جاتی ہے۔۔۔

معلوم ہے میں اسے ہندو کیوں کہتا ہوں۔ وہ بہت زیادہ کنجوس

ہے اور وضع قطع کے اعتبار سے بھی وہ ہندو ہے۔۔۔

میں تو یار کو پیار سے ہندو کہتا ہوں۔ دل سے نہیں کہتا۔ الحمد للہ

ایک پکا مسلمان ہے۔“ ۲۳۰

رنگ تابندگیء شام و سحر یاد آیا کبھی تو اور کبھی اعجازِ نظر یاد آیا
بے نیازانہ صبا جب بھی ادھر سے گزری مجھ کو ہر نقشِ سرِ رہگزر یاد آیا
اک تری یاد ہے تسکینِ دلِ زار ہنوز ورنہ ہر راہ میں انجامِ سفر یاد آیا
روتے روتے شبِ غم گاہ ستارے ٹوٹے ہنتے ہنتے کبھی ہر زخمِ جگر یاد آیا
خلشِ چارہ گری تھی نہ کہیں دشتِ جنوں ہم کو غربت میں نہ بھولے سے بھی گھر یاد آیا
کم نہ تھی ایک خرابے سے تری محفل بھی دل ہنگامہ طلب تشنہ فریاد آیا
شورِ طفلان ہے نہ پتھر یہ عجب بستی ہے ہم کو ہر راہ میں ہر موڑ پہ سر یاد آیا
چھین لی دولتِ احساس بھی غربت نے شمیم
نہ ہمیں سایہ دیوار نہ در یاد آیا ۲۳۱



ہماری عمر بھی گزری تو رائیگاں گزری وفا مدام دلِ دوست پر گراں گزری
تری نگاہ سے ہم زخمِ دل چھپا کے چلے تری نگاہ مگر ہم سے بدگماں گزری
وہ ناز کی کہ تصور سے بھی گریزاں ہے وہ دلبری کہ بہر رنگِ گلششاں گزری
جبین شوق کو اس کی مگر خبر نہ ہوئی وہ کیفیت کہ سرِ سنگِ آستاں گزری
وہ زندگی جسے سمجھے تھے ہم قیامت ہے
شمیم ان سے ملے جب تو شادماں گزری ۲۳۲

اخگر سرحدی

۱۹۱۴ء میں نوشہرہ (صوبہ سرحد) میں پیدا ہونے والے محمد شریف سرحدی ہونے کے باوجود پنجاب کے مرکز سرگودھا کا حصہ بن کر رہے۔ بچے ہی تھے کہ نوشہرہ سے پشاور چلے گئے۔ ہوش سنبھالا اور تعلیم کی ابتدا کی۔ بعد ازاں والدین کے ساتھ کوہاٹ منتقل ہو گئے جہاں ۱۹۳۱ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور انقلابی رنگ اپنایا۔

ہر شے کو نئے سانچے میں ڈھلنا ہوگا
پوستہ انقلاب پلنا ہوگا
اے محنت مزدور پہ جینے والو
دستور تمہیں اپنا بدلنا ہوگا



پھوٹی ہوئی قسمت کی شکایت کب تک
لب پر یہ غلامی کی حکایت کب تک؟
اٹھو کہ بدل دیں یہ نظامِ عالم
ناداری و نکبت کی نہایت کب تک؟
ان کے اس انداز اور لب و لہجے سے ان کا تحریک پاکستان کے لئے ایک سرگرم کارکن اور
آزادی وطن کیلئے سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ سیاست میں وہ کس حد تک داخل تھے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا
ہے۔ راجہ محمد یعقوب حفیظ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”تحریک آزادی کے دوران اخگر سرحدی کو جلسوں میں حکومت
کے خلاف نظمیں پڑھنے پر ۲۶ ڈیفنس انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور
ڈیرہ اسماعیل خان بھیج دیا۔ جیل میں آپ سخت بیمار ہو گئے اور بچنے کی امید نہ
رہی تو ڈاکٹر نے گورنر سے بات کی جس پر گورنر نے رہائی کا حکم دے دیا۔
دوسرے دن ان کے والد لینے آئے ابھی مکمل صحت یاب بھی نہیں ہونے
پائے تھے کہ ڈپٹی کمشنر کوہاٹ کی طرف سے صوبہ بدری کا حکم مل گیا۔ آپ
راولپنڈی آ گئے اور حکیم عبدالخالق سے علاج کروانے لگے۔ آخر کسی طرح

وزیر اعلیٰ سردار اورنگ زیب تک رسائی ہوئی اور اسمبلی میں یہ مسئلہ اٹھا کر

صوبہ بدری کا نوٹس واپس ہوا۔“ ۲۳۳

اخگر سردی نے رہائی کے بعد کوہاٹ سے اپنا رسالہ ”شرز“ جاری کیا جو صرف دو سال ہی چل سکا اور حکومت کی جانب سے بند کر دیا گیا۔ احمد پراچہ ۲۳۴ کے مطابق قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں روزگار کے سلسلہ میں سرگودھا منتقل ہو گئے۔ آپ کے بھائی پہلے سے یہاں موجود تھے۔ آپ نے آ کر گول چوک جامع مسجد کے نیچے سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ اردو زبان اور ادب آپ کی رگوں میں گردش کر رہے تھے۔ کوہاٹ سے ادبی رسالے کا اجراء، ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا اردو کانفرنس دہلی میں عزیز اختر کی معیت میں صوبے کی نمائندگی اور سرگودھا میں آ کر قومی زبان اردو کے فروغ و اشاعت میں سرگرمی، ایک کامیاب اردو کانفرنس کا انعقاد، یہاں سے مفت روزہ اخبار ”نظام نو“ کا اجراء غرض آپ کے بہت سے اقدام اردو زبان کے فروغ کیلئے اہمیت کے حامل ہیں۔ سرگودھا میں آ کر آپ نے ”مجلس ختم نبوت“ کے نام سے بھی تنظیم بنائی اور اس سلسلے میں بھی دوبار آپ کو جیل کی سزا بھگتنا پڑی۔ بقول محمد شفیع صابر ”سرگودھا سکول“ ۲۳۵ کی بنیاد کا سہرا آپ ہی کے سر آتا ہے۔

۱۹۳۱ء میں شعر گوئی کا جو سلسلہ اخگر سردی نے شروع کیا تھا وہ کسی نہ کسی صورت میں آخری عمر تک جاری رہا۔ اگرچہ آپ کی کوئی تصنیف شائع نہیں ہوئی لیکن ”نیا پرانا لہجہ“ میں آپ کے ایک شعری مجموعہ ”صریر خامہ“ اور ایک نثری مسودہ ”کارکنان تحریک اردو“ کے زیر ترتیب ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ۲۳۶ اخگر سردی کی شخصیت کے حوالے سے کوئی متضاد رائے نہیں ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے:

”یہ شخص جس نے شریفانہ بلکہ عاجزانہ انداز میں زندگی بسر کی۔

علمی لحاظ سے سرگودھا کا محسن اول ہے۔ اسے نہ تو زبردستی نمایاں ہونا آتا تھا

اور نہ دوسروں کے کاندھوں پر بندوقیں رکھ کر چلانا آتا تھا۔ اسے صرف کام کرنا

آتا تھا۔۔۔۔۔ مثبت کام۔۔۔۔۔ تعمیری کام۔۔۔۔۔ نتیجہ خیز کام۔۔۔۔۔ اور یہ اس کی

کارکردگی، اس کی لگن، اس کے خلوص ہی کی روشنی ہے جس سے سرگودھا کی
وساطت سے پورے ملک کے ادبی اور لسانی گوشے منور ہیں“ ۲۳۷
یہاں میں چاہتا ہوں کہ ”ادارہ علم و فن“ کے کارکنان کی جو رائے اخگر سرحدی کے بارے
میں ہے اس سے بھی آگاہ کیا جائے۔

”اخگر ایک خلیق اور ملنسار انسان، صادق اور مخلص رفیق ہیں۔
پرانے ساتھیوں کو ہر حال میں اپنائے رکھا گوئے دوستوں سے خوب گاڑھی
چھنتی رہی۔ سرحد میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوئے اور اب تک اردو
کے شیدائی ہیں۔ ملک میں اردو کو سرکاری حیثیت دلانے کی مہم میں سرگرم
حصہ دار ہیں۔“ ۲۳۸

جناب اخگر سرحدی اپنی ۷۷ سالہ ادبی، شاعری، صحافتی اور ایک محبت وطن کی شہری زندگی
گزار کر ۱۲ مئی ۱۹۹۱ء کو ایک طویل علالت کے بعد ہم سے جدا ہو گئے اور سرگودھا کے بڑے قبرستان
میں سپرد خاک ہوئے۔

دارور سن ہی جب ترا دستور ہو گیا	ہرگفتہ اپنا گفتہ منصور ہو گیا
نظر نگاہ، حسن سے معمور ہو گیا	کیا حادثہ تھا جو کہ سرطور ہو گیا
یہ اختیار جبر ہے یا جبر اختیار	انساں خوشی سے مرنے پہ مجبور ہو گیا
لایا ہے رنگ دوست کا ربط گریز پا	میں جس قدر قریب ہوا، دور ہو گیا

اخگر دلِ حزیں کا نرالا مزاج ہے

ان کی بس اک نگاہ سے سرور ہو گیا



تری ناکام کوشش چارہ گریوں بھی ہے اور یوں بھی

علاج دردِ الفت، بے اثر یوں بھی ہے اور یوں بھی

خراب جلوہ رنگیں، رہیں جذبہء تمکین
 محبت میں مرا ذوقِ نظر یوں بھی ہے اور یوں بھی
 کسی کے خون کی تہمت سے بچ نکلے تو اچھا ہے
 تجھے اے شمع! جلنا تا سحر یوں بھی ہے اور یوں بھی
 مالِ زندگی پر سوچتے رہنا ہے لا حاصل
 یہ شیرازہ کسی دن منتشر یوں بھی ہے اور یوں بھی
 یہ پھر تقریبِ جلوہ ہائے رنگا رنگ کیا معنی
 کہ حیراں دیدہ حیرت مگر یوں بھی اور یوں بھی
 گدائے حسن کو پروائے ننگ و نام کیا انگر
 نیازِ عاشقی، در یوزہ گریوں بھی ہے اور یوں بھی ۲۴۹

شیر محمد اسیر

شیر محمد نام اور اسیر تخلص تھا۔ آپ ضلع شاہپور، تحصیل خوشاب کے ایک گاؤں ”کنڈ“ کے
 ایک اعوان گھرانے میں ۱۹۱۵ء ۲۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم تو واجبی سی تھی لیکن مطالعہ
 سے آپ نے بہت کچھ سیکھا۔ اور پھر جب اپنے پیر و مرشد مولانا سید امیر چھپڑوی کی نگاہِ لطف و
 عنایت آپ پر پڑی تو آپ کی زندگی بدل گئی۔ آپ لکھتے ہیں کہ

”آخر میں ایسی شخصیت کا ذکر کرنا چاہوں گا جنہوں نے میری
 زندگی کا دھارا ہی بدل کے رکھ دیا۔ ایسی ہستی کہ جس نے میرے شعروں میں
 ایمانی اور وجدانی جذبہ بیدار کیا۔ وہ ہیں میرے مرشد، اللہ کے برگزیدہ اور
 سرورد عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کے سچے غلام جناب محترم مولانا سید امیر چھپڑوی
 صاحب، جن کی شخصیت اور کرم نوازی نے میرے جیسے حقیر اور ادنیٰ بندے

سے اتنا بڑا کام کروایا ہے۔ جو آج آپ کے ہاتھ میں ”داستانِ حسرت“ کی شکل میں موجود ہے۔“ ۲۵۱

اپنے پیرومرشد کے علاوہ آپ کئی دیگر شخصیات سے بھی کافی متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ جن میں بزرگِ صوفی شاعر بلھے شاہ، علامہ اقبال، ذوق اور اسد اللہ خان غالب شامل ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان سے متاثر ہونا صرف شاعری ہی ہو سکتی ہے لیکن ان کے علاوہ اور شخصیات جن کا ذکر آپ نے بڑی محبت سے کیا وہ آپ کے سکول میں ایک استاد تھے۔ آپ ”حرفِ آغاز“ میں اس شخصیت کے بارے رقمطراز ہیں کہ:

”جس طرح حکیم الامت ڈاکٹر علامہ اقبال کی زندگی میں ایک

انگریز استاد آرنلڈ نے انقلابی کردار ادا کیا، بالکل اسی طرح میری زندگی میں

ایک ہندو استاد محترم کنہیہ لال نے بڑا کردار ادا کیا۔“ ۲۵۲

”داستانِ حسرت“ شیر محمد اسیر کا شعری مجموعہ ہے۔ جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فنِ شعر سیکھا نہ ہی کسی سے اصلاح لی۔ جو ذہن میں آیا اسے صفحات پر لکھ دیا۔ لہذا ان کے کلام میں جو اسقام ہمیں ملتے ہیں یہ اس لئے بھی کوئی عجیب بات نہیں کہ ایک زمیندار جو ادبی مراکز سے بہت دور اپنے کام میں لگن ہے۔ دن بھر مل چلانا رات کو کھیتوں کو پانی دینا۔ یعنی ۲۴ گھنٹے کی مصروفیت کے باوجود اگر وہ شعر کہہ رہا ہے تو وہ تحسین کے لائق ہے اُسے بہر حال ایک عام آدمی سے زیادہ نمبر ملنے چاہیں۔ لیکن اُس نے اخلاقی اور اصلاحی پہلوؤں کو جن الفاظ میں ڈھالا ہے اور جس انداز سے بیان کیا ہے وہ ضرور قابلِ توجہ ہے۔

جناب شیر محمد اسیر نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کو شعری اظہار کا ذریعہ بنایا اور تقریباً

۸۹ سال اس دنیا میں گزار کر دسمبر ۲۰۰۴ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ نے گاؤں میں ہی

وفات پائی اور وہیں (کنڈ) میں ہی دفن ہوئے۔ نمونے کے چند اشعار

میں تو اس دنیا میں بھی اک غم زدہ انسان ہوں آرزوؤں کی کہانی کا بھرا دیوان ہوں

خاک سے پیدا ہوا اور خاک میں مل جاؤں گا بس شرف ملنے سے میں خلقت میں اک پہچان ہوں
 بت پرستوں کو دیا ہے حق پرستی کا سبق کفر کو جس نے مٹایا میں وہی ایمان ہوں
 اک بہانہ بن گیا دنیا بسانے کے لئے ہم کو جنت سے نکالا میں تو وہ ارمان ہوں
 یوں تو خلقت گونا گوں ہے عالم دنیا میں اور بندہ ہونے کے سبب اللہ کا میں احساں ہوں
 بحرِ عصیاں میں ہوا ہوں غوطہ زن ایسا اسیر

مل نہیں سکتا کنارہ کیا کروں حیران ہوں ۲۵۴



اے دل ذرا بتا دے تو نے کبھی کہیں بھی سر سبز ہوتے دیکھی الفت کی سرزمین بھی
 ان کج نگاہیوں میں اور بے وفائیوں میں الفت کے دائرے میں مقبول ہے نہیں بھی
 کوچے میں اُن کے جا کے کوئی پتہ بتا دے دیکھا کہیں بھٹکتا بے بس دل حزیں بھی
 غیروں سے دل لگا کے اپنے کئے پرانے

دنیا تو جا چکی تھی اب جا رہا ہے دیں بھی ۲۵۵

عیش بخاری

نام منظور حسین، خاندانِ سادات سے تعلق اور عیش تخلص تھا۔ آپ رسول نگر نزد ملکوال
 تحصیل بھلووال ضلع سرگودھا کے باسی تھے اور یہی گاؤں اُن کی جنم بھومی ہے۔ جس کی نسبت سے اپنے
 نام کے ساتھ کبھی کبھی رسول نگری (عیش رسول نگری) لکھا کرتے تھے۔ آپ کچھ عرصہ سرگودھا شہر میں
 بھی رہے۔ جس کا اندازہ ہم اُن کے شعری مجموعہ ”دیوانِ عیش“ پر لکھے گئے اُن کے ایڈریس سے لگا
 سکتے ہیں۔ اور پھر لاہور چلے گئے۔ لاہور کا ایڈریس ان کے ”مجموعہ رباعیات“ پر لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس
 حوالے کے علاوہ اُن کا کوئی تعارف نہیں۔ نہ ہی کتابوں پر کوئی تاریخ وغیرہ درج ہے۔ دونوں کتابیں
 میں نے مطالعہ کی ہیں۔ کافی پرانی ہیں۔ ”مجموعہ رباعیات“ پر قیمت بھی نہیں۔ لیکن ”دیوانِ عیش“

۱۳۶ صفحات کے مجموعہ کی قیمت ۴ روپے لکھی ہوئی ہے۔ جو ثنائی پریس سرگودھا سے شائع ہوئی ہے۔ دیوانِ عیش میں اُس دور کی غزلیں ہیں جب غزلوں کو نظموں کی طرح عنوان دیئے جاتے تھے۔ کیونکہ ہر غزل پر عنوان دیا گیا ہے۔ دیوانِ عیش کا دوسرا نام ”کششِ حسن“ ہے۔ جس کی ابتداء وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

”اس عوامی دور میں ایک عوامی دیوان کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے یہ حقیر ہدیہ پیش خدمت ہے۔ یہ عام فہم غزلوں، رباعیات، گیتوں اور مختلف موضوعات پر مشتمل ہے۔ اس میں شاعروں کی منطقی الجھنیں نہیں ہیں۔ یہ وہ دیوان ہے جسے معمولی پڑھا لکھا آدمی مطالعہ کر کے لطف اندوز ہو سکتا ہے“۔ ۲۵۶

ایک اور دلچسپ بات جو آپ نے آزاد نظم کے بارے کہی ہے ”اب رہا ناقد صاحبان کی تنقید کا سوال۔ جب ان لوگوں نے لنگڑی شاعری کو اپنا لیا ہے۔ اور بڑی صفائی سے اسے شاعری مان لیا ہے جس کی ایک ٹانگ مشرق اور دوسری مغرب میں ہوتی ہے تو اس پر نکتہ چینی کیا کریں گے۔ حافظ اور غالب کی روحیں میری استاد ہیں۔ دل حسینوں کا اک کھلونا ہے شاعری کیا ہے اپنا رونا ہے“ ۲۵۷

صبر و قرار

تری نگاہ نے صبر و قرار لوٹ لیا مجھے جو دل پہ تھا وہ اختیار لوٹ لیا
یہ آج کل کے بھی ساقی عجیب رہن ہیں پلا کے تھوڑی سی میرا قرار لوٹ لیا
تری نوازشیں بھی مجھ کو بارِ خاطر تھیں دکھا کے جلوہ مرا انتظار لوٹ لیا
بس ایک خواہشِ گل کے لئے ہی گلچیں نے غضب کیا تیرا حسن بہار لوٹ لیا
کسی کے غمزہ و ناز و ادا کا کیا کہنا نظر ملاتے ہیں نادیدہ کار لوٹ لیا

مجھے پلانی تھی ساقی تو دیتا جام پہ جام تمھاری دیر نے میرا خمار لوٹ لیا
 متاع صبر سے میں مالا مال تھا لیکن
 میں کیا کہوں کہ مجھے کس نے یا ر لوٹ لیا ۲۵۸

رباعیات

تجھ کو ہر بات میں پکارا ہے تو نے قسمت کو کب سنوارا ہے
 لوگ کہتے ہیں گرنے والوں کا تو ہی دنیا میں اک سہارا ہے

☆

دل کو تیرے بتوں سے یاری ہے جان جو ہے سو یہ تمھاری ہے
 خود تہی دست رہ کے دنیا میں زندگی اس طرح گزاری ہے

☆

ہجر میں بچ و تاب ہے ساقی دل میں اک اضطراب ہے ساقی
 تجھ سے ملنے کی آرزو کیا ہے اک سہانا سا خواب ہے ساقی

☆

ہیں غلامی کے جو رو استبداد ہے رعونت وہی، وہی بیداد
 سوچتا ہوں میں محو حیرت ہوں ملک ہوتے ہیں اسی طرح آزاد؟ ۲۵۹

احمد ندیم قاسمی

”پتر ہووے تاں احمد شاہیے جیہا“۔ یہ پنجابی میں علاقہ سون کا ایک روایتی جملہ ہے۔
 جسے لوگ اچھی اولاد کی خواہش یا دعا کیلئے استعمال کرتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ ”اگر بیٹا ہو تو احمد
 شاہ جیسا“۔۔۔ احمد شاہ، احمد ندیم قاسمی کا معروف نام ہے۔ لیکن یہ اُن کا اصل نام نہیں جیسا کہ اُن کی
 ذات پر لکھنے والی شخصیات نے لکھا ہے۔ اور یہ بات احمد ندیم قاسمی کو پڑھنے والا ہر شخص جانتا ہے۔

اس لئے حوالوں سے گریز کروں گا کیونکہ حوالے علیحدہ اُن پر لکھی کتاب میں تو اس قدر دیئے جاسکتے ہیں چند صفحات کے مضمون میں نہیں۔

دراصل ان کا پیدائشی نام احمد بخش تھا۔ ۲۰۲۰ء جس کا اظہار اُن کی حیات میں شائع ہونے والی اُن کی کتاب ”کیسریاری“ میں ناشر نے کیا اور اس کی تردید احمد ندیم قاسمی صاحب نے نہیں کی۔ کیونکہ اس کتاب کا پیش لفظ قاسمی صاحب نے ”ایک وضاحت“ کے عنوان سے خود لکھا۔ دوسرا اس کا انتساب ”مرشد گرامی حضرت مولانا عبدالجید سالک کی نذر“ انہوں نے اپنے دستخطوں اور فروری ۱۹۹۹ء کی تاریخ کے ساتھ خود ہاتھ سے تحریر کیا۔ یہی نام اُن کے ہم عمر جناب شریف کنجاہی ۲۱ کی تحریر میں بھی لکھا گیا ہے۔ احمد بخش پر اس لئے بھی یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے کہ راقم اسی پٹی کا باشندہ ہے اور اپنی روایات کا ”جانو“ بھی ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی کے بڑے بھائی کا نام محمد بخش تھا۔ لہذا والدین نے اُس نسبت سے ان کا نام ”جوڑواں“ احمد بخش رکھا ہوگا۔ چونکہ کچھ لوگ لاعلمی کے باعث ان کے خاندان کو شاہ (سید) خاندان سمجھتے تھے اس لئے احمد شاہ کہنے لگے اور یہی نام اُن کا معروف ہو گیا۔

یہاں آپ کے سن ولادت کے بارے بھی شکوک کو دور کرتے ہوئے عرض کر دوں کہ جناب احمد ندیم قاسمی کی تاریخ ولادت اسی تو اتر سے ہر جگہ ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء درج ہے۔ اور ابتدا سے آج تک یہی چلی آرہی ہے جبکہ یہاں میں قارئین کی توجہ اُن کی اپنی خودنوشت کی جانب مبذول کرنا چاہوں گا۔ محمد حسن عسکری کو وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے رقمطراز ہیں:

” میں ۱۹۱۵ء میں موضع انگہ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا

(پنجاب) میں پیدا ہوا میرے آباؤ اجداد اپنے علاقے اور سیالکوٹ، گجرات

اور کشمیر میں پیر مانے جاتے ہیں اس لئے نام کے ساتھ پیر زادہ بھی لکھتا

ہوں۔ گو آج کل پیری میرے نزدیک اسلام کے زوال کا سب سے بڑا

باعث ہے۔ چار جماعتیں اپنے گاؤں میں پڑھیں۔ والد صاحب ۱۹۲۳ء

میں وفات پا گئے۔ اپنے حقیقی چاچا خان بہادر وسیم حیدر شاہ مرحوم افسر مال

کے زیر سایہ اٹک، شیخوپورہ اور بہاولپور میں تعلیم پاتا رہا۔ ۱۹۳۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۰ء میں مجھے شعر کہنے کا شوق ہوا اور بغیر کسی راہبر اس میدان میں آگے بڑھتا رہا۔“ ۲۶۲

جناب احمد ندیم قاسمی کی اس تحریر سے اُن کی زندگی کے ابتدائی دنوں پر ایک خاص اور واضح روشنی پڑتی ہے۔ طوالت سے بچنے کے لئے مختصراً کہ کچھ عرصہ سرکاری ملازمت کے بعد مستقلاً صحافت اور ادب کی طرف آگئے۔ سیفٹی ایکٹ کے تحت دوبارہ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۸ء میں آپ کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ صحافت میں آپ درج ذیل رسائل و اخبارات کے ساتھ وابستہ رہے۔ مدیہفت روزہ ”تہذیب نسواں“ لاہور، مفت روزہ ”پھول“۔ ماہنامہ ”ادب لطیف“ لاہور۔ ماہنامہ ”سوریا“ لاہور۔ ماہنامہ ”سحر“ لاہور۔ ماہی ”اقبال“ لاہور۔ روزنامہ ”ہلال“ میں کالم موج در موج۔ روزنامہ ”احسان“ لاہور میں کالم مطاببات۔ روزنامہ ”امروز“ لاہور میں کالم قلمی نام عنقا سے اور علمی و ادبی و تنقیدی مضامین تہذیب و فن کے عنوان سے روزنامہ جنگ کراچی میں کالم ”لاہور لاہور ہے“۔ روزنامہ حریت کراچی میں روزانہ فکاہی کالم موج در موج اور ہفتہ وار کالم لاہوریات۔ روزنامہ جنگ میں کالم ”رواں دواں“۔

مرحوم احمد ندیم قاسمی نے افسانہ، شاعری اور تنقید میں بہت سی کتابیں ہمارے درمیاں

چھوڑیں۔

شعری مجموعے:

- (۱)۔ دھڑکنیں (قطععات) (۲)۔ رم جھم (قطععات و رباعیات) (۳)۔ جلال و جمال (غزل، نظم) (۴)۔ شعلہ گل (غزلیں، نظمیں) (۵)۔ دشتِ وفا (غزلیں، نظمیں، قطععات) (۶)۔ محیط (غزلیں، نظمیں) (۷)۔ دوام (غزلیں، نظمیں) (۸)۔ لوحِ خاک (غزلیں، نظمیں) (۹)۔ جمال (نعتیہ کلام) (۱۰)۔ بسیط (غزلیں، نظمیں) (۱۱)۔ ارض و سما (غزلیں، نظمیں) (۱۲)۔ انوارِ جمال (نعتیہ مجموعہ) اس میں آپ کی وفات کے بعد جمال اور اس کے بعد کی نعتیں ناہید

قاسمی نے ترتیب دیا۔

افسانوی مجموعے:

- (۱) چوپال (۲) بگولے (۳) طلوع و غروب (۴) گرداب (۵) سیلاب (۶) آنچل
(۷) آبلے (۸) آس پاس (۹) درودیوار (۱۰) سناٹا (۱۱) بازارِ حیات (۱۲) برگِ حنا
(۱۳) گھر سے گھر تک (۱۴) کپاس کا پھول (۱۵) نیلا پتھر (۱۶) کوہِ پیا (۱۷) پت جھڑ (پت جھڑ
میں ایک ناولٹ شامل ہے) کل ۱۸۳ افسانے ان مجموعوں میں شامل ہیں۔

تنقیدی کتب:

- (۱) ادب اور تعلیم کے رشتے (۲) تہذیب و فن (۳) پسِ الفاظ (۴) معنی کی تلاش

خاکے:

- (۱) میرے ہم سفر (۲) میرے ہم قدم

ترتیب و تدوین:

- (۱) انگریزیاں (مرد افسانہ نگاروں کا انتخاب) (۲) نقوشِ لطیف (خواتین افسانہ نگاروں کا
انتخاب) (۳) کیسریاں (مضامین، کالم، ڈرامے تراجم) (۴) کیسریاں (منتخب فکاہی کالم) (۵)
منٹو کے خطوط ندیم کے نام (۶) پاکستان کی لوک کہانیاں (ترجمہ) (۷) نذر حمید احمد خان (ترتیب)

بچوں کا ادب:

- (۱) آسمان کے گوشے میں (ڈرامے) (۲) دوستوں کی کہانیاں (کہانی) (۳) نئی
نویلی کہانیاں (کہانی) (۴) تین ٹانگ (ڈرامے)“

احمد ندیم قاسمی کے فن پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ بہت سے رسائل اور جرائد نے ان کی
شخصیت اور فن پر ندیم نمبر شائع کئے۔ جو کتب ترتیب دی گئیں ان کے نام ہیں :

- (۱) ندیم نامہ (محمد طفیل، بشیر موجد) (۲) ندیم کی شاعری (جمیل ملک) (۳) احمد ندیم
قاسمی شاعر اور افسانہ نگار (۴) مٹی کا سمندر (ضیاء ساجد)۔ (۵) گل پاشی (منصورہ احمد) (۶) ندیم

کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ (ڈاکٹر ناہید قاسمی) (۷) احمد ندیم قاسمی ایک لچنڈ (ڈاکٹر شکیل الرحمن) (۸) اردو کہانی کا احمد ندیم قاسمی (نند کشور و کرم، ہندی میں) (۹) ندیم کے افسانوی کردار (غافر شہزاد) (۱۰) افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی (ڈاکٹر افشاں ملک) (۱۱) ندیم نامہ (ڈاکٹر اسلم فرخی) جن رسائل نے ندیم نمبر نکالے:

(۱) ماہنامہ افکار کراچی جنوری فروری ۱۹۷۵ء (۲) سہ ماہی عبارت حیدرآباد اکتوبر ۱۹۹۶ء تا مارچ ۱۹۹۷ء (۳) احمد ندیم قاسمی عالمی سیمینار و مشاعرہ ۱۹۸۸ء ابو ظہبی (۴) جریدہ عالمی اردو ادب ۱۹۹۶ء بھارت (۵) سہ ماہی ادبیات اسلام آباد اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء (۷) سہ ماہی مونٹاج لاہور جنوری تا اگست ۲۰۰۷ء۔ جبکہ ان کے علاوہ بھی کچھ نمبر اور کئی رسائل نے گوشے نکالے۔

جناب احمد ندیم قاسمی ایک لچنڈ تھے اور ساری زندگی ادب کی خدمت میں گزاری سواتنی طویل عمر میں آپ کو بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔ جن کی مکمل تفصیل تو ناممکن ہے بہر حال چند ایک جو ریکارڈ پر آسکے اور میرے علم میں آئے وہ تحریر کر رہا ہوں:

- (۱) کل پاکستان مقابلہ اردو نظم بعنوان ”پیغام عمل“ ۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۷ء گولڈ میڈل
- (۲) اعلان آزادی کے موقع پر ریڈیو پاکستان پشاور نے اپنے پروگراموں کا آغاز ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کو آپ کے نغموں سے کیا۔
- (۳) ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے سیکرٹری جنرل رہے۔ ۱۹۵۴ء میں بین لگ گیا۔

(۴) شعری مجموعہ ”دشتِ وفا“ پر ۱۹۶۴ء میں آدم جی ایوارڈ ملا۔

(۵) شعری مجموعہ ”محیط“ پر ۱۹۷۶ء میں آدم جی ایوارڈ ملا۔

(۶) شعری مجموعہ ”دوام“ پر ۱۹۷۹ء کا آدم جی ایوارڈ ملا

(۷) دو حہ ادبی ایوارڈ (یو، اے، ای)

(۸) غالب ایوارڈ (دہلی)

- (۹) پرائڈ آف پرفارمنس، حکومت پاکستان کی طرف سے ۱۹۷۸ء۔
- (۱۰) ستارہ امتیاز، حکومت پاکستان کی طرف سے ۱۹۸۰ء
- (۱۱) کمال فن ایوارڈ ۱۹۹۷ء۔ ۱۹۹۸ء
- (۱۲) نشان امتیاز۔ ۱۹۹۹ء۔
- (۱۳) اے۔ آر۔ وائی گولڈادبی ایوارڈ ۲۰۰۲ء
- (۱۴) ۲۰۰۱ء میں فیض محمد ٹرسٹ بھکر نے سال کی بہترین تخلیقات پر ”احمد ندیم قاسمی ایواڈ“ کا اجراء کیا۔

احمد ندیم قاسمی نے فیچر فلم ”دوراستے“ پر ۱۹۴۰ء اور فلم ”لوری“ پر ۱۹۶۳ء میں بہترین مکالمہ نگار کے ایوارڈ بھی حاصل کئے۔

ٹی وی پر آپ کے متعدد افسانوں کو ڈرامائی صورت میں پیش کیا گیا۔

احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۶۳ء میں اپنا رسالہ ”فنون“ جاری کیا جو آپ کی زندگی کے آخری مہینوں تک شائع ہوتا رہا۔ آپ نے مجلس ترقی ادب کے ناظم کی حیثیت سے زندگی کا بڑا حصہ گزارا اور پھر انہی خدمات کی ادائیگی میں نشیب و فراز سے گزرتے اور زیروزبر ہوتے ہوئے بالآخر ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کو پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی لاہور میں جہاں آپ زیر علاج تھے وفات پائی اور شاہ المشائخ قبرستان ملت پارک سمن آباد لاہور میں آپ کو دفن کیا گیا۔ راقم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ذات کی اطلاع ملتے ہی ریڈیو پاکستان سرگودھا سے اُن کی شخصیت اور فن پر پہلا پروگرام پیش کیا۔

یاد

کتنا تاریک ہے اس شب کا گھنا سناٹا
چاند نکلا ہے مگر چاند کی ایک ایک کرن نوکِ نشتر کی طرح دل میں اتر جاتی ہے
اور جب حد سے گزر جاتی ہے سینے کی جلن چاند بجھ جاتا ہے اور چاندنی مر جاتی ہے
دشتِ دل سے جو نکلتی ہے گزر گاہِ خیال

اپنے سینے پہ سجائے ہوئے یادوں کے نشاں آج اک زخم کی مانند ابھر آئی ہے
 ایک اک پل میں سمٹ آئی ہیں کتنی صدیاں ایک اک سانس مرا عالم تنہائی ہے
 یوں تو ہر دور میں جذبات کی رت آتی ہے

جب تری یاد سے بھر جاتا ہے پیانہء جاں تیری آہٹ اٹھ آتی ہے مرے خوابوں میں
 سر بسجودہ نظر آتا ہے مرا شعر جواں تیرے پیکر کی دکتی ہوئی محرابوں میں
 یوں تو کاٹے ہیں کڑے کوس تری فرقت کے

درد میں اب جو چمک ہے کبھی پہلے تو نہ تھی آج تو تیرے خیالوں سے بھی آنچ آتی ہے
 آج تو تیرا تصور بھی ہے گلستہء خار آج تو یاد بھی اک ہوک سی بن جاتی ہے
 آج کی شب کہیں وہ شب ہی نہ لوٹ آئی ہو

اٹھ سکی جس میں نہ خود وقت کے قدموں کی صدا جس میں اک عمر سے گم ہے ترا پیمان وفا
 جس میں جب چاند بھی ابھرا تو دھواں پھیل گیا پاس جس کے مری آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا

۲۶۳

غزل

تو بگڑتا بھی ہے خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ پھول کھلتے ہیں تیرے شعلہء آواز کے ساتھ
 ایک بار اور بھی کیوں عرض تمنا نہ کروں کہ تو انکار بھی کرتا ہے عجب ناز کے ساتھ
 لے جو ٹوٹی تو صدا آئی شکستِ دل کی رگِ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگِ ساز کے ساتھ
 تو پکارے تو چمک اٹھتی ہیں میری آنکھیں تیری صورت بھی ہے شامل تیری آواز کے ساتھ
 جب تک ارزاں ہے زمانے میں کبوتر کا لہو ظلم ہے ربط رکھوں گر کسی شہباز کے ساتھ
 پست اتنی تو نہ تھی میری شکست اے یارو پر سمیٹے ہیں مگر حسرتِ پرواز کے ساتھ

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن

یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کی ساتھ ۲۶۳

مضطر دھریموی

ہمارے ہاں پنجابی میں ایک مثل مشہور ہے ”دھریمہ ہر پاسیوں ۹ کوہ اے“ یعنی جدھر سے بھی جائیں دھریمہ ساڑھے چودہ میل کے فاصلے پر ہے۔ خدا جانے اس کے پیچھے کیا منطق ہے۔ لیکن یہاں جس شخصیت کا ذکر مقصود ہے وہ اسی گاؤں دھریمہ میں ۸ جون ۱۹۱۶ء ۲۶۵ کو پیدا ہوئے۔ اس وجہ سے اپنے تخلص مضطر کے ساتھ دھریموی کا لاحقہ استعمال کیا۔

مضطر دھریموی کا اصل نام کریم بخش تھا اور ادبی شخصیات اور ادبی محفلوں کے علاوہ آپ میاں کریم بخش تنگیانہ کے نام سے ہی پہچانے جاتے تھے۔ آپ تنگیانہ خاندان کے ایک کھاتے پیتے زمیندار تھے اور رئیس دھریمہ اور دھریمہ کے ذیلدار ہونے کے باوجود بھی درویش منش اور صوفیانہ صفات کے مالک تھے۔ آپ کو مطالعے کا بہت شوق تھا اور اسی شوق کے باعث ایک لائبریری اپنے ہاں بنا رکھی تھی۔ یہی مطالعہ آپ کو شاعری کی طرف لایا اور آپ نے حافظ یوسف آزاد کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذتہ کیا۔ آپ جہاں سرگودھا کی ادبی محفلوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے وہاں اپنے ہاں دھریمہ میں بھی شعراء کو دعوت دیتے۔ محفلیں سجاتے اور خوب مہمان نوازی کرتے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی کہتے ہیں کہ :

”کردار میں سادگی و بے ساختگی اور محبت و مروت بے مثال ہے۔“

دنیا کے علائق سے یکسر منزہ، صرف ادب دوستی کے تحت شعراء و ادباء کو دھریمہ میں پر تکلف ضیافتیں دینا، آپ کی روایت میں شامل ہے۔ دھریمہ کی اس پرسکون مہمان سرا میں پاکستان کے اکثر نامور شعراء تشریف لائے ہیں۔ ایک نعتیہ مجموعہ ”سبد گل“ کے عنوان سے اور ایک غزلوں کا انتخاب ”نسیم صبح“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ بریں پنجابی میں ”سی“ اور متعدد نظمیں بھی لکھی ہیں۔ کلام میں سچائی، محبت، سوز و گداز، بے ساختگی اور حسن و خیر کا وہی

آميزہ ملتا ہے جو مضطر صاحب کی شخصیت کا جزوِ اعظم ہے۔“ - ۲۶۶

یہ صاف گو، مہمان نواز اور بڑھاپے کے باوجود ادبی ذوق کی راہ میں پنا تھکاوٹ رواں دواں مسافر بالآخر ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ء کو اُس نگر چلا گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ آپ کو دھریہ کی خاک میں ہی دفن کیا گیا۔

نعت رسول ﷺ

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا مدینے کی نکھری نکھری فضا مدینے کی
دل میں ٹھنڈک سی پڑنے لگتی ہے جب بھی آئے ہوا مدینے کی
شاہِ خیرالام کی بستی ہے عظمتیں بے بہا مدینے کی
شوقِ دل میں مرے زیارت کا لب پہ ہے التجا مدینے کی
ہر مرض کا علاج ہے مضطر

خاک ہے کیمیا مدینے کی ۲۶۸

غزل

نقش و نگارِ بزمِ جاناں، شہرِ سخن کی بات چلی
نگری نگری، بستی بستی، رنگِ چمن کی بات چلی
دل کی اجڑی دنیا میں پھر آج کسی کی یاد آئی
صحنِ گلستاں میں پھر جیسے آج پون کی بات چلی
رونقِ محفل جن سے تھی وہ دوست ہمیں یاد آتے ہیں
جب بھی زمین میں ماضی کے اس نقشِ کہن کی بات چلی
گردشِ دوراں سے گھبرا کر لب پہ فسانے آہی گئے
اہلِ ستم کی محفل میں پھر دارورسن کی بات چلی
جب بھی مضطر شعر لکھے ہیں جب بھی گایا گیت کوئی

گلشن گلشن، ڈالی ڈالی، شعرو سخن کی بات چلی ۱۹۶۲ء

شاہر حسین شاہر

شاہر حسین شاہر کا اصل نام عبدالواسع ہے۔ محسن عباس نے ۱۹۶۰ء میں اس کا سابقہ ساتھ لگایا ہے جبکہ بدر منیر ۱۹۶۲ء نے سید کے سابقہ سے نام لکھا ہے۔ میر اور سید کہیں تو یکجا کر دیئے گئے ہیں اور کہیں تاریخ میں ان کو بالکل الگ الگ اقوام کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ نجانے یہ دونوں حضرات میر اور سید کو یکجا کرتے ہیں یا میر و میرزا کے چکر میں ہیں۔ جبکہ شاہر حسین شاہر آپ کا ادبی حوالہ ہونے کے ساتھ مستقل پہچان بن چکا ہے۔

”عبدالواسع ضلع بجنور کے گاؤں حسین پور میں جناب غلام نبی کے ہاں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔“ ۱۹۲۲ء آپ نے پرائمری تک ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی۔ اس کے بعد بجنور میں داخلہ لیا۔ لیکن مڈل ہی کر پائے تھے کہ والد کی ضعیف العمری آڑے آگئی اور زمینداری کا سارا بوجھ آپ پر آن پڑا۔ اس کے باوجود اندر ایک اہل ساتھ اور کچھ کرنے کی خواہش انہیں صحافت کی طرف لے آئی۔ یوں تحریک پاکستان کے دوران آپ مسلم لیگ کا لفظوں سے بھی ساتھ دیتے رہے۔ پاکستان جب معرض وجود میں آ گیا تو ۱۹۵۲ء میں ایک دن والدین اور بہن بھائیوں کو بتائے بغیر ہندوستان کو خیر باد کہا اور پاکستان آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد حالات اگرچہ دگرگوں رہے لیکن آپ گھبرائے نہیں۔ بدر منیر آپ کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے رقمطراز ہیں: ”اگرچہ یہاں آ کر نامساعد حالات سے دوچار رہا لیکن کبھی گھبرایا نہیں۔“ ۱۹۵۳ء جب تھل ڈو پلینٹ اتھارٹی نے کام شروع کیا تو شاہر حسین شاہر کو اس ادارے میں بطور پیواری اشتمال اراضی ملازمت مل گئی۔ اس پورے عرصے میں آپ خاموشی سے شاعری سے لو لگائے رہے اور کبھی کبھی لکھ کر محفوظ کرتے رہے۔ سرکاری ملازمت کی ریٹائرمنٹ ساٹھ سال کی عمر میں ہوتی ہے اس لئے قیاساً یہ کہنا درست ہوگا کہ آپ ۱۹۷۶ء میں ریٹائر ہوئے ہوں گے۔ سو! اس کے بعد اپنے کلام کو یکجا کیا۔ لیکن اس کی اشاعت

کا مرحلہ آپ کی زندگی میں نہ آسکا۔ کیونکہ آپ کی زندگی نے ۳ جنوری ۱۹۸۳ء کو آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۲ء کے بعد آپ نے زندگی جوہر آباد میں ہی گزاری اور یہیں آخری آرام گاہ پائی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی بیٹی محفوظ آرانے آپ کے کلام کو ”شاہِ سخن“ کے نام سے ۲۰۰۳ء میں شائع کروایا۔ اس مجموعہء کلام میں صرف اُن کی غزلیں شامل ہیں ممکن ہے باقیات بھی موجود ہوں۔ آپ کی غزل میں تغزل اور رومانیت کا رنگ تو ہے ہی لیکن اخلاقیات، پند و نصائح اور جمالیات بھی اس میں نمایاں ہے۔

بڑا احسان ہو اس کا کوئی اتنا اگر کر دے مرے مرنے کی جا میرے مسیحا کو خبر کر دے
مجھے دنیائے فانی چین سے جینے نہیں دیتی میرے رہنے کو اک چھوٹا سا اپنے دل میں گھر کر دے
نہیں ہے اور کچھ خطرہ فقط ڈر ہے تو اتنا ہے کبھی آوارگی کوچہ بہ کوچہ در بہ در کر دے
یقین کامل ہے یہ مجھ کو ذر مقصد بھی مل جائے تصور میں جو روتے روتے اپنے چشم تر کر دے

دیا ہے عشق شاکر کو تو پھر آہِ رسا بھی دے

یہ تا کہ خود ہی جا کر حال کی اپنے خبر کر دے ۲۷۵



کو بہ کو پھرتی ہے لے کر چشمِ حیرانی مجھے ماسوا اس کے نہیں کوئی پریشانی مجھے
جامہ سے باہر نکل آتا کبھی کا ذوق و شوق بیٹھ جاتا ہے پکڑ کر فرضِ انسانی مجھے
چاند پر اپنے پہنچ کر میں نے کرنا تھا سلام پر یہیں روکے کھڑا ہے داغِ دامانی مجھے
گو کہ سامانِ تعیش ہو چکے ہیں سب بہم چین سے جینے نہ دے گی فتنہ سامانی مجھے
من میں گر غوطہ لگاتا کیوں نہ پالیتا مراد خاک چھنوتی ہے اکثر میری نادانی مجھے

مان سکتا تھا میں شاکر نیم ملا کی بھی بات

کاش سمجھاتا یہ اندازِ مسلمانی مجھے ۲۷۶

علامہ یوسف جبریل

محمد یوسف نام، جبریل تخلص اور علامہ اپنی علمی استعداد کے باعث کہلائے جاتے ہیں۔ آپ کا ابتدائی نام غلام حسین تھا جسے بعد میں تبدیل کر کے محمد یوسف رکھا گیا۔ آپ ۱۷ فروری ۱۹۱۷ء کو موضع کھبکی وادی سون سکیسر میں اعوان قوم کے ملک محمد خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ اگرچہ آپ کافی ذہین تھے اور آپ کے والد بھی آپ کو تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ لیکن نجانے کیوں اور کن وجوہات کی بنا پر ساتویں جماعت سے سکول چھوڑ دیا اور سترہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اسی یونٹ میں اُن دنوں ایوب خان (بعد میں فیلڈ مارشل اور صدر پاکستان) بھی لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ وزیرستان سے ہوتی ہوئی یہ یونٹ عراق میں پہنچ گئی اور یہیں سے آپ کی زندگی نے رخ بدلا۔ یہ سب کیسے ممکن ہوا؟ انہیں کی زبانی سنئے :

”وہاں ایک اسلامی مسئلہ درپیش آیا۔ میں نے اپنے آپ کو قربانی کیلئے پیش کیا۔ کمان انگریز کی تھی۔ الزام میدان جنگ میں حکم عدولی کا تھا۔ سزا سنگین ہو سکتی تھی مگر اسلام کے لئے سب منظور تھا۔ البتہ شہنشاہ معظم انگلستان کی کمیٹی نے کورٹ مارشل کے ارکان کو جھاڑ پلائی اور میرے لئے نہایت خفیف سزا کا اعلان ہوا“۔ ۱۷۷

اس سزا کے بعد آپ نے سوچا کہ تعلیم کا جو سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اس کو جاری کیا جائے۔ اب سکول و کالج کی عمر تو تھی نہیں۔ کتابیں پڑھ کر علم حاصل کیا جاسکتا تھا۔ جن دنوں آپ کو سزا ہوئی تھی انہیں دنوں آپ کو ایک محیر العقول خواب بھی آیا۔ جو آپ کی زندگی کو بدلنے کا محرک بنا۔ بہر حال ۱۹۴۲ء کے بعد علم کے حصول کے سلسلے میں آپ لکھتے ہیں :

”سالہا سال کی روز و شب کی انتھک اور مسلسل محنت کے نتیجے

میں، میں نے اردو میں ولی دکنی سے اقبال تک، فارسی، اردو کی، سے عصری

تک۔ انگریزی چاسر سے شیلے اور چارلس ڈکنز تک پڑھ ہی نہیں لی بلکہ مشاہیر کی طرز پر طبع آزمائی بھی کر سکتا تھا۔ عربی میں عنتر بن شداد کا معرکہ آرا قصیدہ کویت کی ریت پر بیٹھ کر پڑھنا اور سردی میں ٹھٹھرنا مجھے اب تک یاد ہے۔ یہی نہیں۔ میں نے توریت، زبور، انجیل (انگریزی نسخہ) پڑھے۔ سائنس میں فزکس، کیمسٹری، ریڈیو بائیولوجی، نیچرل سائنس پڑھی۔ سائنس کی تاریخ، فلسفے کی تاریخ، دنیا کی مختلف قوموں کی سیاسی اور ادبی تاریخیں پڑھیں، جملہ مذاہب کو تقابلی نظر سے جانچا۔ تہذیبوں کے تجزیے کئے۔ قرآن حکیم کا خصوصی مطالعہ کیا یہ جدوجہد ۱۹۴۲ء سے ۱۹۸۲ء تک جاری رہی۔ نتیجے میں چودہ جلدیں قرآن حکیم کے لفظ حطمہ کی انگریزی تفسیر اور اتنی ہی جلدیں اردو میں لکھ دیں۔ کئی سومضامین اردو، انگریزی اخباروں رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔“ ۲۷۸

علامہ یوسف جبریل کے بارے راقم نے کئی مقامات پر لکھا اور کئی کتب میں مضامین اس سلسلے میں شامل ہیں۔ اُن سے ملاقاتیں میری زندگی کا حاصل ہیں۔ میں نے خود اُن کی زبانی بہت کچھ سنا۔ اُن کے بیٹے شوکت محمود اعوان سے بہت کچھ حاصل کیا اور علامہ صاحب کی تحریروں سے بھی بہت کچھ لیا۔ شاید اس وجہ سے میرے لئے یہ امر مشکل ہے کہ میں اُنکے تعارف کو مختصر کر سکوں۔ اسی لئے میں ان کے تعارف کو چھیڑنا ہی نہیں چاہوں گا بس سرسری طور پر ایک واقعہ جو اپنی میری شمل سے مناظرہ کی صورت پیش آیا۔ اور ۱۹۶۳ء کے اخبارات میں عرصے تک موضوع بحث رہا۔ اس مناظرے میں علامہ صاحب نے یہ ثابت کر دیا کہ قرآن مجید الہامی کتاب ہے۔ مخلوق نہیں۔ جس پر اپنی میری شمل کو منہ لٹکائے واپس جانا پڑا اور دوباراً آنے پر علامہ صاحب سے درخواست گزاری کہ اُسے کلمہ پڑھایا جائے۔ اور دوسرا ہم کام علامہ صاحب کا اسلامی بم کے حوالے سے دیگر ممالک کے مشاہیر کے ساتھ خط و کتابت ہے جن میں بی ایچ بلیک ویلز لمیٹڈ، سویڈش جوہری توانائی انسٹیٹیوٹ،

مسٹر جیمسن کرین، پوپ جان پال، علامہ اسد، وزیر اعظم جاپان، برٹریڈ رسل اور دوسرے بہت سے رسائل کے مدیران اور اہم شخصیات شامل ہیں۔

علامہ یوسف جبریل کی اردو اور انگریزی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن میں سی کنی شائع ہو چکی ہیں اور بہت سی ابھی تشنہ اشاعت ہیں۔ ان کتب کی اشاعت کا سارا کام ان کے بیٹے شوکت محمود اعوان انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی کتب میں سے ایک سلسلہ "Gabriel's Extinguishing the Atomic Hell Series, I کے نام سے ہے جن میں درج ذیل کتب شامل ہیں:

Vol-I The First Eruption of Gabriel's Argument against the Atomic Hell. (غیر مطبوعہ)

Vol-2. Quran Predicts, Characterizes and averts the Atomic Hell. (غیر مطبوعہ)

Vol-3 Atomic-energy for peace a curse. (غیر مطبوعہ)

Vol-4. Quran versus Atomism, Ancient and Modern. (غیر مطبوعہ)

Vol-5. An Essay on Bacon's life in reference to his philosophy. (غیر مطبوعہ)

Vol-6. Unscientific Philosophy of the scientist and the Quran. (غیر مطبوعہ)

Vol-7. Democritus enkindles, Abraham Extinguishes the atomic hell. (غیر مطبوعہ)

Gabriel's Extinguishing the Atomic hell Series-II

Vol-1. Quran Sounds its unclear warning about the atomic hell (غیر مطبوعہ)

Vol-2 A Quranic Design of the Neutralizer of the (غیر مطبوعہ)

Vol-3 The case of the atomic hell and my mission there in . atomic energy for peace in the court of lord Justice Sciene.

(غیر مطبوعہ)

Vol-4. Atomic hell the logical consequence of Baconian philosophy. (غیر مطبوعہ)

Vol-5. Atomic hell, Baconian philosophy, Anti Christ, Quran and Abraham. (غیر مطبوعہ)

Vol-6. Relation between the Quran and the Bible. (غیر مطبوعہ)

Vol-7. The Quran corrects a philosophy confined to the present day Science.

Vol-8. The Gabriel's Islamic Bomb. (مطبوعہ)

Different Books

1. Accidental birth of earth (غیر مطبوعہ)
2. Gabriel Trumpets the doomsday (مطبوعہ)
3. Mysterious Universe (غیر مطبوعہ)
4. Atomic hell, Baconian philosophy and Christ. (غیر مطبوعہ)
5. Purpose of creation (غیر مطبوعہ)
6. Quran prescribes the nuclear technology. (غیر مطبوعہ)
7. Gabriel's articles about Hotama. (غیر مطبوعہ) Vol-I
8. Gabriel's articles about Hotama. (غیر مطبوعہ) Vol-II ۱۷۹

علامہ یوسف جبریل نے اردو زبان میں کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے چند ایک شائع ہو

چکی ہیں اور باقی منتظر ہیں۔

- ۱۔ معاشیات جلد اول تا چہارم (مطبوعہ)
- ۲۔ نشان منزل (معاشیات کے بارے مضامین) غیر مطبوعہ
- ۳۔ ایٹمی آگ کی قرآنی تشریح (مطبوعہ)
- ۴۔ مزارعت (مطبوعہ)
- ۵۔ مضامین جبریل جلد اول تا ہفتم (تمام مضامین اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں)

- ۶- جہاد کے اخلاقی اصول (مطبوعہ)
- ۷- فتنہء دجال (مطبوعہ)
- ۸- طب یونانی سے ہومیو پیتھی تک (رسالہ مطبوعہ)
- ۹- چڑیا گھر کا الیکشن (مطبوعہ)
- ۱۰- بیکن، دجال، علامہ اقبال، امام مہدی، ابراہیم اور ایٹمی جہنم (مطبوعہ)
- ۱۱- یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا تقابلی جائزہ (مطبوعہ)
- ۱۲- ایٹمی جہنم بھڑکائے دیموقراطیس اور بجھائے حضرت ابراہیم (غیر مطبوعہ)
- ۱۳- ایٹمی جہنم بجھانے والا قرآنی فارمولا (مطبوعہ)
- ۱۴- قرآن حکیم اللہ کی الہامی کتاب نہیں ہے؟ (مناظرہ) (مطبوعہ)
- ۱۵- قدیم و جدید اثنا مزم اور سائنس کی مثلث (مطبوعہ)
- ۱۶- علوی اعوان قبیلہ مختصر تعارف (مطبوعہ)
- ۱۷- فقرِ غیور (مطبوعہ)
- ۱۸- رازِ خلیل اور آتشِ فیل (فارسی کلام، تحریریں اور خطوط) زیرِ طبع
- ۱۹- مضامین جبریل سیریز حصہ اول (مطبوعہ)
- ۲۰- حکمہ کا ابتدائی اظہار (مطبوعہ)
- ۲۱- سوئے منزل (مطبوعہ)
- ۲۲- ایٹمی جہنم: ایٹمی بم اور قرآن (مطبوعہ)
- ۲۳- اسلامی بم (مطبوعہ)
- ۲۴- فلسفہ تخلیق کائنات (مطبوعہ)
- ۲۵- اینی میری شمل (غیر مطبوعہ)
- ۲۶- جہاد کا اسلامی نظریہ (غیر مطبوعہ)

- ۲۷۔ نالہ جبریل (غیر مطبوعہ)
- ۲۸۔ اسلام کا معاشی نظام (غیر مطبوعہ)
- ۲۹۔ جدید سائنس (غیر مطبوعہ)
- ۳۰۔ ایٹمی سائنس اور قرآن کریم کے معجزے (غیر مطبوعہ)
- ۳۱۔ بیکنی جہنم، ایٹمی جہنم اور قرآن کریم (غیر مطبوعہ)

نثر کی ان کتب کے علاوہ علامہ یوسف جبریل کے چار شعر مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ نعرہ جبریل ۲۔ نغمہ جبریل آشوب ۳۔ خواب جبریل ۴۔ سوز جبریل

چند مجموعے زیر ترتیب ہیں۔ جن میں سے نالہ جبریل اشاعت کے لئے تیار ہے۔

علاوہ ازیں علامہ یوسف جبریل کی سوانح کا پہلا حصہ ”علامہ محمد یوسف جبریل حیات

وخدمات“ جسے ڈاکٹر تصدق حسین راجا نے ترتیب دیا ہے شائع ہو چکا ہے اور اس کا دوسرا حصہ وہ

ترتیب دے رہے ہیں۔ آپ نے ”۵ جنوری ۲۰۰۶ء کو واہ میں وفات پائی اور وہیں آپ کی

مدفین ہوئی“۔ ۲۸۰

علامہ یوسف جبریل کی پوری شاعری قومی، ملی اور اخلاقی حوالے سے ہے اور اسے اگر

حضرت علامہ اقبال کا تتبع کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ نمونہء کلام ملاحظہ فرمائیے۔

وہ دور جس کا زمانے کو انتظار ہے آج طلوع شرق کے پردوں میں بے قرار ہے آج

نکل کے ’لا‘ کے اندھیروں سے بن کے ’الا اللہ‘ ہلال بن کے افق پر وہ آشکار ہے آج

تجھے ہو شوق تو منظر مرے ضمیر میں دیکھ زمانہ جس کے تقدس سے گل عذار ہے آج

نہ آئے تجھ کو نظر تو مری نگاہ سے دیکھ جہاں نما میری نظروں میں ذوالفقار ہے آج

مری زباں پہ یہ فردا کی بات ہے ورنہ زمانہ داغِ جہالت سے داغدار ہے آج

سمجھ رہے ہیں جسے گل جہاں کے اہل گماں سمٹ کے میری نگاہوں میں جلوہ کار ہے آج

جہاں ہوا ہے منور جو نورِ مرسل سے نہیٰ امیٰ زمانے کا تاجدار ہے آج

جہاں میں بندۂ مومن کی بندھ رہی ہے ہوا
 اذانِ بندۂ مومن میں ہے جلال و سکون
 جہاں میں جنتِ ارضی کا ہے سماں ہر سو
 پلٹ گئی ہے جو تقدیر اپنی ملت کی
 غریب و سادہ و بدحال تھا جو مردِ فقیر
 فریب و مکر و امارت سے باوقار تھا جو
 زمیں پہ بن کے جو نمرود دغا داتا تھا
 بُرے جہاں میں ہیں بد بخت و نامراد وزبوں
 جو کل ملک تھے تکبر کے آسماں جبریل
 مری یہ بات سمجھ لے خلاف عقل نہیں
 جو بے یقین ہو زمانہ تو کیا قصور مرا
 نظر نواز یہ منظر یہ منظرِ فردا
 یقین نہ ہو تو ادھر دیکھ معجزے کی یہ شان
 ہزار سال یہ عالم رہے بعید اس سے

اگر عزیز مری بات کا یقین کر لیں

عجب نہیں کہ ہلاکت کو انگلیں کر لیں



فلک ہے نوحہ کتاں ۛ لا الہ الا اللہ
 نہاں رہے ہیں جو اسرار اس زمانے سے
 مرے جگر سے جو قرآں کی ہوک اٹھی ہے
 تری ہوس کے سلاطم کو پھونک دے شاید
 زمیں ہے ۛ فغان لا الہ الا اللہ
 ہوئے ہیں مجھ پہ عیاں لا الہ الا اللہ
 سنیں گے اہل بیباں لا الہ الا اللہ
 نوائے شعلہ فشاں لا الہ الا اللہ

سمومِ غرب کی آندھی میں مصطفیٰ کا نظام
 نظر فریب ہے دجال و سامری کا فسوں
 خیال و وہم و گماں لا الہ الا اللہ
 طلسمِ جادوگراں لا الہ الا اللہ
 کدھر ہے تیرا دھیاں لا الہ الا اللہ
 وہ علم علمِ قرآن؟ لا الہ الا اللہ
 قرآن کا فکر کہاں لا الہ الا اللہ
 ہوئی نہ رشکِ جنان لا الہ الا اللہ
 ہوئی فلک پہ ازاں لا الہ الا اللہ
 نمازِ عشق کے طالب سنیں صدائے سروش
 ہوس نے زور تو مارا بہت ولے یہ زمیں
 جلا دیا ہے حوادث کی آگ نے جبریل
 کہ بن گیا ہوں دھواں لا الہ الا اللہ ۲۸۲

صادق سہنی

محمد صادق ۱۹۱۷ء میں گلکھڑ منڈی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق سہنی خاندان سے تھا جو ہندومت چھوڑ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اس خاندان کے لوگ آج بھی گجرات اور سرگودھا میں آباد ہیں۔

صادق سہنی نے غربت کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ اسی باعث تعلیم بھی مکمل نہ کر سکے اور محنت مزدوری کر کے گزراوقات کرنے لگے۔ عملی زندگی کی ابتداء لڑکپن سے ہی گاؤں سے شروع ہو گئی تھی اور پھر قسمت انہیں سرگودھا لے آئی۔ یہاں محنت مزدوری کی۔ صرافہ بازار میں زیورات کے ڈبے بنانے کا کام شروع کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اندر ہی اندر جو جذبات پل رہے تھے انہیں لفظوں کی زبان دینے لگے۔ چونکہ فرصت کے لمحات کم ہوتے تھے۔ اس لئے اپنے اشعار لکھ کر اپنے پاس رکھتے اور بہت کم کسی ادبی محفل میں دکھائی دیتے۔ شعر کہنے کا یہ سلسلہ خاموشی سے اور زیست گمنامی میں گزارنے کا عمل جاری رہا۔ کام کی نوعیت اور حالات نے انہیں دمہ کا مریض بنا دیا۔ اور اسی بیماری

میں بالآخر ۲۵ جنوری ۱۹۷۸ء کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ نے اپنے بعد کوئی قیمتی اثاثہ نہیں چھوڑا۔ جو شاعری کی وہ بھی خدا جانے کس کے ہاتھ لگی۔ ”سخنوران سرگودھا“ میں شائع آپ کی تصویر سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں جانباز، ”فائر بریگیڈ یا شہری دفاع وغیرہ میں بھی آپ نے کچھ حصہ ڈالا ہوگا۔ محمود اسیران کے بارے لکھتے ہیں کہ:

”آپ جس قدر حساس تھے۔ اس سے زیادہ اپنے شعروں پر بھاری تھے۔ سرگودھا کی ادبی محفلوں میں گو آپ کی شرکت جزوی تھی مگر یہ سب پر عیاں ہے کہ آپ جیسا میزبان شاعر دوستوں کو کم ہی میسر آیا ہے۔ صاف گو، منکسر المزاج، تصنع سے پاک، خوش اخلاق اور اہل قلم کا پر خلوص مہمان نواز صادق سہنی آخری عمر میں بھی اپنے شعری ذوق کی آبیاری کرتے رہے۔“ ۲۸۴

آپ کے ہاں قدیم رنگِ تغزل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

آپ نے نعت بھی لکھی اور اس میں تقدس عقیدت اور احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے لفظوں کا

چناؤ کیا۔

طوفانِ مکر و فن میں کنارہ تہیٰ تو ہو	جو ڈوبنے نہ دے وہ سہارا تہیٰ تو ہو
خود ذاتِ حق نے وصل کی خاطر بصد نیاز	عرشِ علا سے جس کو پکارا تہیٰ تو ہو
سلطانِ فرش و عرشِ مشیت کے رازداں	ہر بے نوا کے دل کا سہارا تہیٰ تو ہو
جولانگہ حیات کی ہر ایک راہ کو	اپنے لہو سے جس نے سنوارا تہیٰ تو ہو
تخلیق کائنات سے پہلے قریب عرش	جبریل نے جو دیکھا وہ تارا تہیٰ تو ہو

دریائے رنج و غم سے بڑی مدتوں کے بعد

صادق کو جس نے آج ابھارا تہیٰ تو ہو ۲۸۵

غزل

سونا ہے صحنِ گلشنِ رضواں ترے بغیر اک عالمِ بسیط ہے ویراں ترے بغیر
تیرے لئے بہارِ بداماں ہے زندگی میری حیاتِ عشق ہے ویراں ترے بغیر
اے رمزِ زیست، جانِ بہاراں، سرورِ گل مثلِ قفس ہے صحنِ گلستاں ترے بغیر
ہر رات لے کے آتی ہے لاکھوں قیامتیں ہر صبح نو ہے حشرِ بداماں ترے بغیر

اے ربِ کعبہ مالکِ دنیاے گنِ فکاں

صادق ہے اور کس کا ثنا خواں ترے بغیر ۲۸۶

پروفیسر غلام جیلانی اصغر

”پروفیسر غلام جیلانی اصغر کیم جون ۱۹۱۸ء کو تلہ گنگ ضلع کیمبل

پور (بعدہ اٹک۔ موجودہ ضلع چکوال) میں شیخ محمد الدین کے ہاں پیدا

ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم تلہ گنگ میں حاصل کی۔ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج

کیمبل پور سے ۱۹۳۷ء میں ایف۔ اے کیا۔ ۱۹۳۹ء میں اسلامیہ کالج

لاہور سے بی۔ اے کی ڈگری لی اور ۱۹۴۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے

انگریزی زبان و ادب میں ایم۔ اے کیا۔ آپ اپنے علاقے کے واحد شخص

تھے جنہوں نے اس وقت انگریزی میں ماسٹرز کی ڈگری اچھے نمبروں میں لی

تھی جس بنا پر آپ کو لیکچرر شپ مل گئی۔ اور زمیندار کالج گجرات میں تعیناتی

ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ہوا۔ ۲۸۷

پھر ساری زندگی سرگودھا میں گزار دی۔ اس دوران تھوڑے سے عرصے کیلئے گورنمنٹ کالج

جوہر آباد میں بھی تدریسی فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۶۹ء میں گورنمنٹ کالج گوجر خان اور ۱۹۷۰ء میں

گورنمنٹ کالج تلہ گنگ میں بھی چند مہینے گزارے۔ ۱۹۷۶ء میں گورنمنٹ کالج سرگودھا سے ریٹائرمنٹ

لے لی۔ لیکن انہیں دوبارہ اسی عہدے پر لے لیا گیا جہاں سے ۱۹۷۸ء کو باضابطہ طور پر ریٹائر ہوئے۔

پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے شعری و ادبی ذوق کے بارے پر ویز بزمی رقمطراز ہیں:

”ان کے والد گرامی بہت اچھا شعری ذوق رکھتے تھے۔ خود بچپن

ہی سے جیلانی صاحب کو مسدس حالی زبانی یاد تھی۔ ان کے دادا اور نانا بھی

کاروباری ہونے کے باوجود شعری و ادبی ذوق و شوق کے مالک تھے۔ مگر

غلام جیلانی اصغر کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ آٹھویں جماعت

کے طالب علم تھے۔ ان دنوں انہیں ایک جلسہ میں نفیس خلیلی کو سننے کا اتفاق

ہوا۔۔۔۔۔ جیلانی صاحب ان کے اس انداز سے اتنے متاثر ہوئے کہ جلسہ

سے واپسی پر انہوں نے نفیس خلیلی ہی کے رنگ میں ایک نظم کہی اور حسن اتفاق

سے یہ نظم بہ اعتبار وزن درست تھی۔“ ۲۸۸

بعد ازاں کیمبل پور میں کالج کے ماحول نے مہمیز لگائی۔ لیکن ان کے اس ادبی ذوق کو

پذیرائی سرگودھا آمد کے بعد ملی جب ڈاکٹر وزیر آغانے ”اوراق“ کیلئے انہیں باقاعدگی سے لکھتے

رہنے کی ترغیب دی۔ اور انہوں نے بھی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں توازن سے اپنا حصہ جاری رکھا:

”پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ

انگریزی ادب کے استاد کی حیثیت سے گزارا۔ انہوں نے جہاں ایک

استاد کی حیثیت سے عزت پائی وہیں ایک شاعر، ایک انشائیہ نگار، ایک

نقاد، ایک مکتوب نگار، ایک خاکہ نگار، اور ایک کالم نگار کے ساتھ ساتھ ایک

مقرر کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان کروائی۔ آپ جب سٹیج پر بول رہے

ہوتے تو سامعین کو بوریت کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ بات سے

بات نکالنا، بات میں مزاح پیدا کرنا اور بات کو پراثر بنانا آپ کی ایک ایسی

خوبی تھی جسے ان کے جاننے اور سننے والے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ تقریر وہ فی البدیہہ کرتے تھے بلکہ جب ان کو موضوع کا علم نہ ہوتا تو بہتر بولتے تھے۔ صرف تقریر پر ہی موقوف نہیں روزمرہ کی گفتگو میں بھی وہ الفاظ اور جملوں کا استعمال کرتے اور جس سنجیدگی سے بات کرتے سننے والے اس سے بھی بہت محفوظ ہوتے تھے۔“ ۲۸۹

آپ کی تصانیف میں دو شعری مجموعے ”میں اور میں“ اور ”اک ذرا شام سے پہلے“۔ انشائیہ میں ایک مجموعہ ”نرم دم گفتگو“ جبکہ نجمہ منصور کی نثری نظموں کے مجموعے ”اگر نظموں کے پر ہوتے“ کا انگریزی ترجمہ If Poems Had Wings اور حال ہی میں ان کے انگریزی تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ان کی وفات کے بعد پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے شائع کیا ہے۔ آپ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے پرویز بزمی ”خوش کلام۔ غلام جیلانی اصغر“ اور عابد خورشید ان پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ”باتیں جیلانی جی کی“ ترتیب دے چکے ہیں۔ اکادمی ادبیات کی پالیسی کے مطابق ”انور سدید بھی اپنی کتاب غلام جیلانی اصغر پر مکمل کر چکے ہیں۔ آپ کو علمی خدمات کے صلے میں حکومت پاکستان نے تمغہ امتیاز سے بھی نوازا۔

پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے زندگی کو اپنے انداز سے بڑا پر لطف گزارا۔ آخری عمر میں بڑھا پا اور بیماری نے مل کر انہیں زیر کر دیا اور وہ ۲۶ دسمبر ۲۰۰۶ء کو سرگودھا ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کی میت کو لے جا کر تلہ گنگ میں آپ کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

پروفیسر غلام جیلانی اصغر کی شاعری میں جہاں ”میں اور میں“ کا عنصر موجود ہے وہیں ان کی شاعری میں ہم ”اک ذرا شام سے پہلے“ کا وہ عنصر بھی پاتے ہیں جو ”میں اور میں“ کی ہی بازگشت ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں آپ نے قاری کو متاثر کیا ہے۔

اس طرح ہوں شہر کے لوگوں میں اب بکھرا ہوا

اجنبی لوگوں پہ اپنے آپ کا دھوکا ہوا
آنکھ کے نم سے مجھے کچھ غم کا اندازہ ہوا
میں تو سمجھا تھا کہ یہ بادل بھی ہے برسا ہوا
وہ ترے ملنے کی ساعت خون میں رچ بس گئی
آج تک وہ پھول ہے گلدان میں رکھا ہوا
لوگ تنہائی سے ڈر کر جنگلوں میں آ گئے
شہر کی گلیوں میں اب کے ایسا سناٹا ہوا
وہ ترے آنے کا وعدہ وہ میرے ملنے کا شوق
ایک مدت سے ہے دل کے طاق پر رکھا ہوا
وقت نے دھندلا دیئے کیسے شناسائی کے رنگ
جس طرح یہ خواب ہو پہلے کبھی دیکھا ہوا ۲۹۰

تکرار

پرانے موسموں کی چادروں کو دھو کے رکھ لینا
کبھی یہ کام آئیں گی

یہی دو چار دن جو روشنی کے ہیں
انہیں ہم اوڑھ کے بازار میں جائیں
دکانوں میں سچی چیزوں کو دیکھیں
ہراک خوش رنگ چہرے کو

محبت اور حیرت کے ملے جذبات سے آراستہ کر کے
دلوں کے آئینہ خانوں میں رکھ لیں
کسے معلوم کل موسم پہ کیا افتاد پڑنی ہے؟

دھواں ہے، دھند ہے، گرد سفر ہے
 سنا ہے آندھیاں مغرب سے مشرق کی طرف
 پھر چلنے والی ہیں
 ہوا بوجھل ہے، بادل شہر پر منڈلا رہے ہیں
 لپکتی بجلیوں کے رقص میں کتنے چھلاوے ہیں
 وہی لاکھوں زمانوں پر محیط اک خامشی
 گھروں میں، جنگلوں میں، راستوں میں
 پھیل جائے گی
 بس اتنا تم نے کرنا ہے
 پرانے موسموں کی چادروں کو دھو کے رکھ لینا
 کبھی یہ کام آئیں گی ۲۹۱

صوفی فقیر محمد

ع تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد

یہ مصرع صوفی فقیر محمد کی ذات پر پورا منطبق ہوتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر جب ہندی میں کوئی الجھن پیش آتی ہے تو صوفی فقیر محمد یاد آ جاتے ہیں۔ ”سرگودھا کی وجہ تسمیہ“ کے دوران جب سر اور گودھا کی تفہیم کا مسئلہ پیش آیا تو میں نے میرپور خاص میں مقیم تاج قائم خانی کو ٹیلی فون کیا۔ اگر صوفی فقیر زندہ ہوتے تو تفصیل سے مجھے ان دو الفاظ کا مفہوم سمجھا سکتے تھے۔ تو یہ اتنا با علم لیکن بے علم شخص ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہو گیا۔

سنسکرت کا جاننے والا، ہندی اور پنجابی معہ دیوناگری اور گورکھی کا ماہر، یونانی، ہندوستانی اور اسلامی فلسفہ تصوف کا محقق، ہندو دھرم، سکھ دھرم اور دین اسلام کا علم رکھنے والا، اردو اور پنجابی کا

شاعر، عربی زبان کی شد بدرکھنے والا، فارسی زبان کا جانکار، انگریزی میں اے، بی، سی کی سوجھ بوجھ رکھنے والا، علم عروض پر عبور رکھنے والا صوفی فقیر محمد اتا "گنی" تھا کہ اسے اس کا خود علم نہیں تھا۔ زندگی اس انداز سے گزاری کہ وہ گزرگنی اور جس کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے۔

ہر شہر ہر گلی میں میرا گھر ہے دوستو جس شہر جس گلی میں گیا گھر چلا گیا

"صوفی فقیر محمد ۱۱۴ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو لدھیانہ (مشرقی پنجاب) میں

پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حکیم صوفی نبی بخش ایک عالم و فاضل انسان تھے۔

انہوں نے اپنے بیٹے کی تربیت اپنے انداز سے کی۔ جس میں سکولنگ کا حصہ

نہیں تھا۔" ۲۹۲

صوفی فقیر محمد نے اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر کئی علوم کا مطالعہ کیا۔ نیز اردو

ادب، تاریخ، مذہب، ہندی ادب اور فارسی ادب کو بھی بغور پڑھا۔ آپ علم عروض کے ماہر اور سہل

ممتنع کے بادشاہ گئے جاتے تھے۔

صوفی صاحب نے قیام پاکستان پر ۱۹۴۷ء میں ہجرت کی اور کچھ عرصہ نور پور تحصیل

خوشاب میں گزارا۔ بعد ازاں مستقلاً سرگودھا کو مسکن بنایا۔ سرگودھا قیام کے دوران آپ شعر و ادب

کی شخصیات میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مبتدی شعراء آپ سے رہنمائی حاصل

کرتے اور نوآموز شعراء اصلاح اور فن سے آگاہی کے لئے آپ سے ملتے۔ آپ نے اگرچہ

شاعری کی تمام اصناف کو برتا لیکن حمد و نعت نگاری آپ کا پسندیدہ موضوع رہا اور آپ کا اکلوتا شعری

مجموعہ "آداب نعت" حمدیہ و نعتیہ کلام پر مشتمل ہے لیکن کئی پر تمیں کھولنے کے ساتھ ساتھ ان کے

نظریہ فن کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس ضمن میں صوفی صاحب کا نظریہ فن بالکل واضح ہے۔

ان کے عشق رسول اور حضور کے ذکر پاک میں احتیاط اور نعت میں آداب کو ملحوظ رکھنے میں

کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ اقبال کی تصنیف "ارمغانِ حجاز" میں عزت بخاری کا یہ شعر

ادب گاہیست در زریز میں از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

دو الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ یوں رقم ہے:

ادب گاہست زیرِ آسماں از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا
صوفی فقیر محمد کو اگر چہ اس تبدیلی سے اتفاق ہے لیکن وہ مزید بہتری اور ادب کے پیش نظر کہتے ہیں:

”عزت بخاری کے مصرع میں در زیر میں، کچھ اچھا نہیں معلوم

ہوتا تو پھر ”زیر آسماں“ کیوں کہا جائے کیوں نہ اس زیر کو خارج از بحث کیا

جائے اور شایانِ شان ترکیب استعمال میں لا کر مصرع مرصع کیا جائے۔

ادب گاہست برفرش ز میں از عرش نازک تر “ ۲۹۳

اس نظریہ پر وہ قائم ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”نظریہ ادب کو ملحوظ خاطر رکھ کر راقم (صوفی) علامہ اقبال کا

مشہور نعتیہ شعر بہ ادنیٰ تصرف یعنی تبدیلی الفاظ سے پڑھنا جائز جانتا ہے۔

یعنی میرے نزدیک علامہ اقبال کے شعر کے مصرع اول کا نصف اول ”نگاہ

عشق و مستی، کی جگہ، نظر ہو تو حقیقت میں، پڑھنا اور سننا نسبتاً زیادہ قرین

ادیب ہے کہ: ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں:

نظر ہو تو حقیقت میں وہی اول وہی آخر

وہی قرآں وہی فرقاں وہی لیسیں وہی طہ

اور اول و آخر بات وہی ہے جو عزت بخاری نے کہی ہے۔

ہم بھی وہی کہتے ہیں جو کہتا ہے بخاری

ادب گاہے کہ برفرش زمین از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا“ ۲۹۴

آپ کے ادبی مرتبہ سے آپ کے ہم عصر واقف تھے۔ اسی لئے کسی کو آپ کے سامنے

کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ مقبول جہانگیر کے کئی کالموں میں آپ نے اساتذہ کی غلطیوں کو ظاہر کیا۔

احسان دانش، عبدالعزیز خالد وغیرہ کو ان کی غلطیوں پر سرزنش تک کی۔ اور انہیں منوایا۔ اور پھر ان سب کا نچوڑ کچھ اشعار کی صورت میں آپ نے حلقہ ارباب ذوق لاہور کے اجلاس میں تنقید کے لئے پیش کیا۔ وہ اشعار تھے۔

مصرع نہ ہوا میرے موزوں میرے آگے اور غالب و مومن کریں چوں چوں میرے آگے
افسانہ ہوا داغ کا افسوں میرے آگے اور جوش و جگر تھوکتے ہیں خوں میرے آگے
اقبال کی تعریف نہ کریوں میرے آگے اقبال کے ہیں دجلہ و جیحوں میرے آگے
لکھا نہ گیا کام کا سودا سے قصیدہ باندھا نہ گیا ذوق سے مضمون میرے آگے
توڑا نہ گیا فیض سے تنکا میرے ہوتے احسان سے ماری نہ گئی جوں میرے آگے
میں ہوں تو سر بزم حفیظ آ نہیں سکتا آئے تو نظر آئے گا مجنوں میرے آگے
خالد کے ہیں اشعار کہ معجون مرکب مجذوب کی بڑ سے نہیں افزوں میرے آگے
مجہول ہے جو میری فضیلت کا ہے منکر جاہل ہے جو کرتا ہے اکڑ فوں میرے آگے
خوش بخت ہوں شاگرد زمیندار ہے میرا چاول میرے آگے کبھی گیہوں میرے آگے
شاعر تو بنا دوں اسے بندہ نہیں بنتا میں میں کرے بڑی کبھی تو تو میرے آگے
پر قینچ کبوتر ہے کہیں اڑ نہیں سکتا کرتا ہے ذرا رشک غرغوں میرے آگے

صوفی ہوں سمجھتا ہوں تصوف کے مسائل

کیا فلسفہ جھاڑے گا فلاطوں میرے آگے

ان اشعار کے دورِ رخ ہیں اور دونوں ہی قابلِ غور“ ۲۹۵

ان اشعار کی تشریح اور ان میں شامل شعراء کے کلام میں صوفی فقیر محمد نے جو خامیاں نکالیں اور جہاں جہاں گرفت کی یہ تحقیق طلب بھی ہے اور مشکل بھی۔ یہ تفصیل زیادہ وقت اور اوراق کی خواہاں ہے۔ صوفی صاحب کے سہل ممتنع اور ادب میں آداب کے علاوہ شائستگی اور شگفتگی کی وضاحت کیلئے ان کی ایک نعت کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھ کو توفیق یہ من جانب رب ہو جائے
 میرا موضوع سخن میرے رب ہو جائے
 سرنگوں ہو کے قلم وقفِ ادب ہو جائے
 ان کے روضے کی زیارت مجھے کب ہو جائے
 وہ جو فرمائیں وہی علم و ادب ہو جائے
 وہ طلب گار مدینے میں طلب ہو جائے
 کیا عجب کر لیں طلب مجھ کو کبھی شاہِ عرب
 نام ان کا ہے، نسب ان کا ہے، باقی سب کا
 شمس بھی ٹوٹ کے آجائے قمر بھی شق ہو
 نعت لکھنے کا میسر مجھے ڈھب ہو جائے
 ان کی مدحت میری بخشش کا سبب ہو جائے
 ان کی خدمت میں زباں مہر بلب ہو جائے
 ہونے والی ہے بشارت مجھے جب ہو جائے
 اور امی انہی دانا کا لقب ہو جائے
 جس کے سینے میں مدینے کی طلب ہو جائے
 کیا تعجب ہے کبھی یہ بھی عجب ہو جائے
 ان کی نسبت سے بڑا نام و نسبت ہو جائے
 ان کی انگلی کے اشارے پہ یہ سب ہو جائے

ان کا ہو جاؤں ہمیشہ کیلئے میں صوتی

ان کی چوکھٹ پہ مرا سر ہو کہ شب ہو جائے ۲۹۶

”یاران نو“ میں تحریر ہے کہ: فنِ شعر میں آپ استادِ شاگردی کے قائل ہیں لیکن
 جہاں تک آپ کی اپنی شاعری کا تعلق ہے۔ اس کے فنی پہلو کی تکمیل آپ نے علمِ عروض اور صنائع
 بدائع کی کتب سے کی ہے۔

کس شکر نے بگاڑی ہے یہ گھر کی صورت
 کاش پیدا ہو دعاؤں میں اثر کی صورت
 بے خطر عشق رو دارورن سے گزرا
 شمع جل بھجتی ہے جل مرتے ہیں پروانے بھی
 خیر کا کام نہیں نام نہیں نیکی کا
 نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
 ڈھونڈ پاؤں غمِ دوراں سے مفر کی صورت
 عقل ہر گام پہ تکتی تھی سفر کی صورت
 کہ نظر آئے کسی طرح سحر کی صورت
 شر کی صورت سے عبارت ہے بشر کی صورت

تیرے اوصاف کا مظہر بھی کئی بار ہوا

کس کی صورت ہے الہی یہ بشر کی صورت ۲۹۷

عبدالغنی جوہر

شاہ پور جب تک ضلع کی حیثیت سے قائم رہا تو اپنی ضلعی اہمیت کو ہر حوالے سے برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ ادب کے میدان میں بھی اپنی پسماندگی کے باوجود بہت سے لوگ پیدا کئے۔ انہی لوگوں میں عبدالغنی جوہر بھی تھے۔ انہوں نے پندرہ فروری انیس سو انیس (۱۵ فروری ۱۹۱۹ء) میں شاہ پور صدر میں آنکھ کھولی۔ مقامی سکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور پھر ملازمت اختیار کر لی۔ پاکستان کے مختلف مقامات پر قیام رہا اور پھر ۱۹۷۹ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد سرگودھا میں رہائش اختیار کی۔

عبدالغنی جوہر ایک یار باش اور رکھ رکھاؤ والی شخصیت کے طور پر اپنے ہم عصروں میں اپنی پہچان کا باعث بنے رہے۔ آخری عمر میں بیماری کے باعث گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ وفات پائی۔ محمود اسیر نے اُن کے خدو خال، گفتگو، چال ڈھال اور مہمان نوازی کے علاوہ ان کی شاعری پر بھی بات کی ہے۔ اُن کی غزلوں کو پیش کرنے سے پہلے وہ اپنے تبصرے میں کہتے ہیں :

”ان کی غزل داخلی احساسات کے باوجود غم دوراں کی تلخیوں

سے خالی نہیں بلکہ کہیں کہیں تو ماحول کی بھرپور عکاسی بھی ملتی ہے۔ وہ اپنے

اندرونی کرب کو چھپانا بھی چاہتے ہیں اور نہیں بھی۔ اپنی ہی ذات کے گرد

گھومتے ہوئے گوانہوں نے ایک عمر صرف کی ہے۔ مگر اس سے جو آگہی

انہیں حاصل ہوئی ہے۔ اُسے پا کر وہ مستقبل کی تلخیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے

خود کو تیار کر چکے ہیں۔ اُن کی غزل کی زبان جتنی ہلکی ہے اتنی میٹھی بھی ہے۔

جہاں وہ اپنی ذات کے دائرے میں مقید ہیں۔ وہاں اس دائرے سے نکلنے

کیلئے بھی پرتول رہے ہیں۔ اُن کی حد سے زیادہ کم گوئی کے اعتبار سے اُن کی

شاعری اُن کے احساسات و جذبات سے پوری طرح بیدار ہے“۔ ۲۹۸

پھر دل میں ایک سوزِ نہاں پا رہا ہوں میں پھر جذبہء جنوں کو جواں پا رہا ہوں میں

پھر اُن کے سبِ در پہ جھکی ہے جبینِ شوق پھر اُن کا نام وردِ زباں پا رہا ہوں میں
 حسنِ نظر سے طور کا عالم نظر میں ہے خود رنگیء کون و مکان پارہا ہوں میں
 فرزانگی میں طے نہ ہوئی منزلِ حیات دیوانگی میں دونوں جہاں پا رہا ہوں میں
 جوہر جنونِ عشق کہاں لے گیا مجھے

بیگانگی سود و زیاں پارہا ہوں میں

اپنا بھی تھا فلک پہ گزر کل کی بات ہے شاید ہیں اس کے شمس و قمر کل کی بات ہے
 پابہ رقبہ ہم بھی ہوئے ہیں سوئے قمر ہم نے بھی یہ کیا ہے سفر کل کی بات ہے
 ہر چیز تھی ہماری پسندیدہ جہاں ہم سے تھا کسبِ علم و ہنر کل کی بات ہے
 تھا منتظر جمالِ سحر اپنا بھی ندیم ہم بھی تھے نازشِ گلِ تر کل کی بات ہے
 جو ہر وہ دیکھ صبح درخشندہ سامنے

جائے گی کالی رات گزر کل کی بات ہے

شبلی پانی پتی

مولانا الطاف حسین حالی کے شہر پانی پت کی شہرت کی وجہ وہاں لڑی جانے والی پانی پت
 کی لڑائیاں بھی ہیں جو تاریخِ برصغیر کا ایک حصہ ہیں۔ اور پھر اسی نسبت سے پانی پت میں پیدا ہونے
 والے خواجہ اولیس احمد المتخلص شبلی نے اپنی جنم بھومی کو نام کا حصہ بنا لیا۔ ”آپ یکم جولائی ۱۹۱۹ء کو خواجہ
 صوفی اقبال احمد کے ہاں پیدا ہوئے“ اس ابتدائی تعلیم مکتبہ رحمانیہ سے حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر
 میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اگلے ہی سال یعنی ۱۹۳۲ء میں آپ کے والد صاحب وفات پا گئے تو آپ
 کے تایا خان بہادر خواجہ لطیف احمد انیس انہیں اپنے ساتھ امراتوی (سی پی) لے گئے وہاں آپ نے
 مڈل کا امتحان پاس کیا اور دوبارہ پانی پت آ گئے جہاں حالی مسلم ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس
 کیا۔ ۱۹۳۳ء میں آپ ٹیلی فون کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد ملک کے مختلف

حصوں میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۷ء میں سرگودھا میں مستقلاً رہائش اختیار کی جس کی وجہ سے آپ کے خاندان کے باقی افراد کا ہجرت پر ہی یہاں آ کر مقیم ہو جانا تھا۔ ”آپ ۱۹۸۲ء میں بطور اکاؤنٹ اسٹنٹ اپنی ملازمت سی سکدوش ہوئے۔“ ۳۰۲

شبلی پانی پتی نے ۱۹۳۵ء میں شعر کہنا شروع کیا

”آپ کے تایا خواجہ لطیف احمد بھی شاعر تھے اور جرتج تخلص

کرتے تھے وہ مولانا الطاف حسین حالی کے شاگرد تھے آپ نے ان سے

اصلاح لی۔ ۱۹۶۶ء میں آپ نے بزمِ حالی قائم کی ان دنوں آپ لاہور میں

تھے اس کے صدر حمید احمد خان وائس چانسلر اور نائب صدر خواجہ افضل حسین

نبیرہ مولانا حالی تھے۔ پھر ڈاکٹر عبادت بریلوی صدر ہوئے آپ جنرل

سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے اور جب تک لاہور میں قیام رہا تقریبات

منعقد ہوتی رہیں۔“ ۳۰۳

شبلی پانی پتی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کو بھی وقت دیتے رہے اخبارات میں آپ

باقاعدگی سے کالم لکھتے رہے۔ آپ کے قطعات اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ کئی ادبی تنظیموں کی

ساتھ بھی وابستہ رہے۔ ”بزمِ حالی“ کو آخری عمر تک جوانوں کے سے جذبے کے ساتھ چلاتے

رہے۔ ”آپ کی خدمات کے صلے میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے آپ کو ٹیٹولکٹ اور سند اعتراف

سے نوازا گیا۔“ ۳۰۴

خواجہ اولیس احمد شبلی پانی پتی نے ۲۷ مئی ۲۰۰۶ء کو سرگودھا میں ہی انتقال فرمایا ۳۰۵ اور

دوسرے دن ۲۸ مئی کو مرکزی قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ نے زندگی کے آخری دنوں میں اپنا

نعتیہ مجموعہ کمپوز کروالیا تھا لیکن اس کی اشاعت کا موقعہ نہ مل سکا۔ اور تشنہ رہ گیا۔

غزل

ترے آنے کے وعدے اب تو شب بھر رقص کرتے ہیں

نظر کے سامنے دن کے مناظر رقص کرتے ہیں
 کبھی بجھتی نہیں الفت کی چنگاری جو لگ جائے
 یوں جسم و روح بھی ہر لمحہ جل کر رقص کرتے ہیں
 صراحی، میکدہ، ساقی و ساغر کی ضرورت کیا
 پلا دے جن کو نظروں سے وہ پی کر رقص کرتے ہیں
 لگاتا ہوں میں یوں غوطہ تلاطم خیز لہروں میں
 کہ اس کی نیلی آنکھوں میں سمندر رقص کرتے ہیں
 خدا کے جو ولی ہوتے ہیں تہلی مست رہتے ہیں
 شراب معرفت پی کر وہ اکثر رقص کرتے ہیں



دل کے گلدان سے نکال کے پھول
 میں نے درد و الم کے دھاگوں میں
 باغ الفت سے کتنی چاہت سے
 باندھ کر آرزو کے دامن میں
 یاد میں پھر تری سجاؤں گا
 گلشن زندگی سے اب یارو
 جھڑتے جاتے ہیں ماہ و سال کے پھول
 رکھ لئے میں نے وہ سنبھال کے پھول
 ہیں پروئے ترے خیال کے پھول
 جن کے لایا ترے جمال کے پھول
 دیکھ لایا بڑے کمال کے پھول
 یہ ترے حسن اور جمال کے پھول
 جھڑتے جاتے ہیں ماہ و سال کے پھول
 جیسی کرنی ہے ویسی بھرنی ہے
 تہلی اپنے ہیں یہ مآل کے پھول ۲۰۶

خلیل بدایونی

خلیل الرحمن، خلیل بدایونی ولد حضور الرحمن بدایوں کے مقام پر ۳ نومبر ۱۹۱۹ء ۲۰۷۷ء میں پیدا

ہوئے۔ آپ کے والد قاضی خاندان سے تھے اور شاعری کو ورثاً لے کر چل رہے تھے۔ ان کا تخلص مختار تھا۔ اور قصائد مومن (مطبوعہ ۱۹۶۵ء لکھنؤ) آپ کی تالیف ہے۔ آپ کی والدہ مقبول بیگم بھی شعر و سخن کا عمدہ ذوق رکھتی تھیں اور دادا قاضی حبیب حسن اثر بدایونی صاحب دیوان شاعر تھے۔ چچا قاضی عطاء الرحمن عطا بدایونی کے علاوہ پھوپھی زاد نجمہ یا سمین یوسف ("دست دعا" اور "سیپ سمندر موتی" کی شاعرہ) نے بھی نام کمایا۔

خلیل بدایونی نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہو گئے۔ تقسیم ہند پر ہجرت کی اور لاہور آ گئے جہاں چار سال قیام رہا اور پھر ۱۹۵۱ء میں مستقلاً سرگودھا کو مسکن بنایا۔ اور گورنمنٹ کالج سرگودھا شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۳ء میں جب ایم۔ اے اردو کا آغاز ہوا تو آپ اس کے پہلے شعبہ صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں آپ نے پنشن پائی اور کالج کے احاطے میں اپنی رہائش کو ترجیح دی۔

خلیل بدایونی نے شاعری کو بچپن ہی سے اپنے اندر بسالیا تھا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ آپ کے ہمراہ چلتی رہی۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں بھی آپ نے طلباء میں شعری شعور پیدا کرنے اور اسے ابھارنے کی طرف توجہ دی۔ بزم ادب قائم کی۔ بعد ازاں "مجلس اردو" کے نام سے آپ نے ایک تنظیم بنائی۔ جنہوں نے کالج کی سطح پر ابتدائی حوالے سے بہت کام کیا۔ آپ چونکہ خوش گلو بھی تھے۔ آپ کی آواز میں ترنم تھا۔ لہذا مشاعروں میں جب کلام سناتے تو مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔ صوفی فقیر محمد نے ان کے اسی انداز کے بارے اپنے الفاظ میں کہا ہے کہ:

"ادیب و عالم و شاعر، طبیب روحانی خلیل نام ہے پیچھے سے ہیں بدایونی
گلے کے زور سے کرتے ہیں سامعین کو ہلاک "گلا" دیا ہے خدا نے انہیں بڑا خونی" ۳۰۸

شاعری، موسیقی، ڈرامہ کے علاوہ آپ کو باغبانی، طب، دست شناسی، نجوم، جوتش، جغرافیہ اور ریل سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ جبکہ ای استاد، صحافی اور ادیب بھی تھے۔ آپ نے کچھ عرصہ بیمار رہ کر ۹ مئی ۲۰۰۹ء کو وفات پائی۔ ۳۰۹

خلیل بدایونی صاحب کے تین مجموعے ”بوستان خلیل“، ”گلستان خلیل“ اور ”گلزار خلیل“ شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مجموعے بالترتیب غزلی، نظم اور حمد و نعت پر مشتمل ہیں۔

آپ کے بیٹے قاضی مجیب الرحمان نے تدریس کے حوالے سے تو آپ کی جگہ یونیورسٹی آف سرگودھا میں لے لی لیکن شاید آپ کی ادبی جگہ خالی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ جو سلسلہ صدیوں سے وراثتاً چلا آ رہا تھا۔ یہاں آ کر دم توڑ دے گا۔

غزل

سانس لینے کی کبھی چین سے مہلت نہ ملی
اس طبیعت سے کبھی اپنی طبیعت نہ ملی
ساری چیزیں تو کسی کو کبھی ملتی ہی نہیں
ہم تو تصویرِ صنم دل میں لئے پھرتے رہے
کیا کہوں کس طرح یہ عمر گزاری میں نے
فاتحہ پڑھنے وہ جب قبر پہ آئے میری
طاق جو علم و ہنر میں تھے وہ گننام رہے

یوں تو سب کچھ ہی ملا جینے میں لذت نہ ملی
دل کے بہلانے کی آخر کوئی صورت نہ ملی
جس کو صورت ملی اچھی اسے سیرت نہ ملی
اس کی صورت سے کسی اور کی صورت نہ ملی
آپ کا حکم بجا لانے کی فرصت نہ ملی
اس کو کہتے ہیں مقدر اسے تربت نہ ملی
ان کو دولت نہ سہی عزت و شہرت نہ ملی

دل نہیں ملتا تو ملنے کا مزا کیا ہے خلیل

ان سے مل کر بھی اگر وصل کی لذت نہ ملی ۱۰۱۰



زباں پر حرفِ مطلب ہم سے اب لایا نہیں جاتا
ہمیں سننے کی عادت ہے بہت کچھ سنتے رہتے ہیں
تسلی جھوٹی دے دے کر بہت دھوکے دیئے دل کو
خوشی میں تکلم ہے، مگر کچھ کہہ نہیں سکتے
صحیح داموں میں سودا کوئی ٹھہرایا نہیں جاتا
سمجھ لیتے ہیں وہ خود، ہم سے سمجھایا نہیں جاتا
ہمارے بارے میں کیا ہے جو فرمایا نہیں جاتا
کسی صورت سے یہ کم بخت بہلایا نہیں جاتا
زباں سے کوئی کلمہ اب تو دہرایا نہیں جاتا
صحیح داموں میں سودا کوئی ٹھہرایا نہیں جاتا

عجب حالت ہے میری ان دنوں فقدانِ فرصت ہے کہیں آیا نہیں جاتا، کہیں جایا نہیں جاتا
 زمانے سے ملا جو کچھ، سر آنکھوں پر اسے رکھا کسی کی پیشکش کو ہم سے ٹھکرایا نہیں جاتا
 کوئی کچھ بھی کہے لیکن حقیقت پھر حقیقت ہے حقیقت کو کسی صورت میں جھٹلایا نہیں جاتا
 بہت چکر زمانے نے خلیل ہم کو دیئے لیکن
 یہ پختہ طبع بہکانے سے بہکایا نہیں جاتا ۱۱۱

افضال ناز گنگوہی

سید افضال احمد ناز گنگوہی ۵ جنوری ۱۹۲۰ء کو گنگوہ ضلع ہوشیار پور ۱۲۲ میں پیدا ہوئے۔
 تحریک پاکستان نے جب زور پکڑا تو آپ جوان تھے۔ علامہ اقبال اور قائد اعظم سے آپ کو عقیدت
 تھی۔ اس تحریک میں آپ کے خاموش حصہ لینے کی کئی وجوہات ہیں۔ اور جب پاکستان معرض وجود
 میں آ گیا تو آپ نے وہاں ٹھہرنا کارِ فضول سمجھتے ہوئے بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور پاکستان آ کر سرگودھا
 میں قیام کیا۔ یہاں آپ نے اپنا کاروبار شروع کیا۔

شعر نجانے کب آپ کے اندر وارد ہوا۔ لیکن آپ اگرچہ کم گو تھے پھر بھی یہاں کے چند
 دوستوں نے جنہوں نے آپ کو تلاش کر لیا تھا شعر و شاعری کی محفلوں میں مصروف کر دیا بلکہ آپ کے
 گھر میں بھی بیٹھک ہوا کرتی تھی جس میں تمام دوست اکٹھے ہوتے اور ایک دوسرے سے کچھ شعر
 سنتے اور سناتے۔ یوں شاعری کو بھی فروغ ملا اور مل بیٹھنے کا بھی بہانہ مل گیا۔ آپ نے اپنی کچھ غزلوں
 کو ترتیب بھی دیا تھا اور ”ناز و بیان“ کے عنوان سے اسے شائع کروانا چاہتے تھے۔ لیکن فرصت نہ مل
 سکی اور مصروفیت کے اسی عالم میں آپ نے ۱۳ مئی ۱۹۹۸ء کو جانِ جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔
 محمود اسیر رقمطراز ہیں:

”کلام انتہائی سادہ اور رواں ہوتا ہے۔ وہ فرقت کے لمحات کو
 اپنے لئے انتہائی مفید سمجھتے ہیں مگر قربت کی آگ بھی انہیں گراں نہیں

گزرتی۔ اپنے ہم عصر شاعروں میں ان کی مقبولیت کا باعث ان کا انداز
 بیاں بھی ہے۔ اور شوقِ ترنم بھی۔ نئی نئی تراکیب و الفاظ کے ساتھ وہ اپنے
 قدیم رنگ میں بھی فنِ شاعری کے جوہر دکھاتے نظر آتے ہیں۔ جب تک
 داد ملتی رہے خوب پڑھیں گے ورنہ دو چار شعروں پر ہی یادداشت کے خاتے
 کا اعلان کر دیں گے۔“ ۳۴

غزل

کوئی بھولے سے جو راحت کی گھڑی آتی ہے وہ بھی تڑپاتی ہوئی سن سے گزر جاتی ہے
 آپ سے شکوہِ بیداریء شب کیا کیجئے نیند آتی ہے تو کانٹوں پہ بھی آ جاتی ہے
 ڈوبنے والا تلاطم تو سکوں بخش گیا اب کوئی موج تڑپتی ہے نہ بل کھاتی ہے
 امتیازات کے عنوان بدل جاتے ہیں آہ جب گلبِ افلاک سے ٹکراتی ہے
 ناز ان کانٹوں کی تقدیس کو تم کیا جانو

جن کے پہلو میں کلی نشوونما پاتی ہے

نہ ہو ہم کو میسر گر سکونِ دل نہیں ہوتا بجز گردشِ مہِ نو بھی مہِ کامل نہیں ہوتا
 میرے ہمراہیوں کو میری بربادی مبارک ہو بلا سے میں اگر آسودہ منزل نہیں ہوتا
 مری ہستی تری ذاتِ گرامی کی شہادت ہے جہاں داتا نہیں ہوتا وہاں سائل نہیں ہوتا
 کوئی آنسو ہماری آنکھ سے ایسا نہیں گرتا کہ جس میں آرزوئے دل کا خون شامل نہیں ہوتا
 محبت موت کا چولا پہن کر رقص کرتی ہے غرورِ حسن کا پردہ جہاں حائل نہیں ہوتا
 ہر اک الفت زدہ کو قیس کا رتبہ نہیں ملتا ہر اک ناقہ برائے صاحبِ محفل نہیں ہوتا

کسی صورت بھری محفل سے ویرانی نہیں جاتی

سراپا ناز جب تک رونقِ محفل نہیں ہوتا ۳۵

دوست محمد محبت

دوست محمد نام اور محبت آپ کا تخلص تھا۔ آپ ۱۶ اپریل ۱۹۲۰ء کو موضع چٹہ (وادی سون تحصیل خوشاب) میں حافظ محمد بخش کے ہاں پیدا ہوئے۔ پرائمری تک تعلیم اچھالی سے حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ مڈل سکول کفری سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور پھر غیر تربیت یافتہ مدرس کے طور پر تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ آپ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء تک Untrained teacher رہے تاہم بعد میں ۱۹۸۰ء تک جے وی ٹیچر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اور ۶۰ سال کی عمر پر پہنچ کر ۱۵ اپریل ۱۹۸۰ء کو ریٹائر ہوئے۔ ۳۱۶

شعر و سخن سے آپ کی دلچسپی موروثی ہے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے قوال تھے۔ دوست محمد محبت نے شاعری کا بہت مطالعہ کیا انہیں فارسی شعراء سعدی،

حافظ اور جامی کا بہت سا کلام یاد تھا۔ دیوان غالب بھی انہیں از بر تھا۔ بدر منیر کے مطابق:

”دوست محمد محبت روایت دوست شاعر ہیں۔ ان کا کلام کلاسیکی

غزل کی روایات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے لیکن بغور مطالعہ سے ان

کے ہاں ہم عصر سماجی شعور کا عکس ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے اسلوب کی تراش

خراش اور فنکارانہ باریک بینیوں کی بجائے احساسات کو شستہ اور سلجھے ہوئے

انداز میں شعر کا پیرایہ عطا کیا ہے“۔ ۳۱۷

لیکن علامہ یوسف جبریل اُن کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ :

”ان کا اتنی نستعلیق اور سکہ بند اردو میں شعر کہنا بڑا تعجب ہوتا

ہے۔۔۔ محبت کی محبتوں کا محور و مرکز ختمی مرتبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

ذاتِ گرامی ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ سرد اردو عالم صلی اللہ علیہ

وسلم کے حضور نذرانہ عقیدت پر مشتمل ہے۔۔۔ اُن کے کلام میں متصوفانہ

افکار بھی جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔“ - ۳۱۸

ہر ناقد کا اپنا خیال ہوتا ہے جو کسی بھی قلم کار کی نگارشات سے نکال لیتا ہے۔ دوست محمد محبت کے کلام میں باقاعدہ حمد و نعت اور مناقب یا متصوفانہ مضامین اگرچہ نہیں ہیں لیکن اُن کی غزلوں میں بہر حال صوفیانہ اور نعتیہ اشعار کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اُن کا شعری مجموعہ ”عقابوں کا سلسلہ“ شاید ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کے ۶۱ صفحات تھے۔ جبکہ اسی کا دوسرا ایڈیشن ”کرب دروں“ کے نام سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا جس کے ۹۳ صفحات ہیں۔ یوں ”عقابوں کا سلسلہ“ سے تقریباً ۲۵ غزلیں زائد ”کرب دروں“ میں شامل ہیں۔

دوست محمد محبت کا ادبی اور زندگی کا سفر یکم نومبر ۲۰۰۰ء کو پورا ہو گیا۔ یہ سفر آپ کا اپنے گاؤں پٹھ میں اختتام پذیر ہوا اور وہیں آپ کو دفن کیا گیا۔

شوقِ بے حد نے آرزو کی ہے جستجو تیری چار سو کی ہے
 جستجو میں مٹا کے ہستی کو ہم نے تکمیلِ آرزو کی ہے
 کس قدر ناز ہے مصور کو کیسی تشکیلِ خوب رو کی ہے
 لا کے اس شوخ کو تصور میں کس بہانے سے گفتگو کی ہے
 ہم تو رسوا ہوئے زمانے میں فکر بس تیری آبرو کی ہے
 گلستاں، کے گلوں میں سرگوشی اے حسین تیرے رنگ و بو کی ہے
 چاک داماں ہے جس کے ہاتھوں سے اس نے پھر زحمتِ رفو کی ہے

اُس محبت کی حیاتِ کار آمد !

جس نے جاں وقفِ تارِ خو کی ہے



جادو بھری نگاہ سے مسحور ہو گیا دلِ دامِ زلفِ یار میں محصور ہو گیا
 یادِ رُخِ حضور سے پر نور ہو گیا دلِ اشکِ کعبہ، مسجد و کوہ طور ہو گیا

دیرو کلیسا، کعبہ کی عظمت کے باوجود دل کوئے یار جانے کو مجبور ہو گیا
 رازِ انا کے فاش پر بس یہ سزا ملی ترکِ ادب سے دار پہ منصور ہو گیا
 دونوں جہاں میں اس کو ٹھکانہ نہ مل سکا تیری نگاہ سے جو بھی ذرا دُور ہو گیا
 اپنوں کی بے وفائی کے صدمات سے محبت
 رس رس کے زخمِ دل مرا ناسور ہو گیا ۲۱۹

سیف زبیری

سیف زبیری کا اصل نام حامد حسین تھا۔ آپ یکم دسمبر ۱۹۲۰ء کو ضلع مراد آباد ۲۲۰ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے لیکن اخلاقِ عارف کے بقول علی گڑھ ۲۲۱ آپ کی جنم بھومی ہے۔ آپ نے بانس بریلی میں زندگی کا ایک حصہ گزارا۔ آپ ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس لئے بچپن اور جوانی بے فکری کے عالم میں گزرے۔ تعلیم اگرچہ میٹرک تک حاصل کی تھی لیکن مطالعہ وسیع تھا۔ آپ نے تحریکِ پاکستان میں بھی حصہ لیا اور علامہ اقبال اور قائد اعظم سے ملاقات کا شرف بھی پایا۔ قیامِ پاکستان کے فوراً ہجرت کی اور سکھر میں رہائش پذیر ہوئے۔ جہاں شادی کی اور پھر خیر پور کا رخ کیا۔ اس سیاحتی زندگی کے بارے ہارون الرشید لکھتے ہیں کہ:

”خیر پور میں قالین کا کارخانہ بنایا جسے سیلاب بہا لے گیا۔ خیر

پور سے پشاور منتقل ہو گئے۔ ان کے برادرِ اکبر ابرار حسین زبیری شوگر مل کے

منیجر تھے۔ بھائی کی بروقت امداد نے وقتی سہارا عطا کیا۔ پشاور کے بعد سیف

زبیری فکرِ روزگار کے لئے کراچی چلے گئے۔ کراچی ٹھیکیداری شروع کی۔

پہلا ٹھیکہ ”کوٹری“ میں نہر کی کھدائی اور تعمیر کا حاصل ہوا۔۔۔

کراچی میں کچھ وقت گزارنے کے بعد سرگودھا میں رہائش پذیر ہو گئے اور

پھر اسی شہر سے رسمِ دوستی استوار کر لی۔

سرگودھا میں ایم ای ایس کے بڑے محکمہ میں آکشنرز رہے۔ ٹھیکیداری ان کا
اضافی کام تھا۔“ ۲۲۲

محمود اسیر آپ کی شاعری پر یوں تبصرہ کناں ہیں :

”سیف زبیری زندگی کے مسائل پر پوری نظر رکھتے ہیں۔ مگر
کلام میں قدیم اور روایتی رنگ نمایاں ہے۔ سادگی پسند ہیں۔ شعروں
میں زیادہ تر سادگی کا عنصر غالب ہے۔ مگر اس انداز سے کہ انکی شخصیت
اپنی تمام تر عنایتوں کے ساتھ ابھرتی ہے۔ پختہ گو شاعر ہیں۔ اپنے ہم
عصروں میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اندازِ بیاں انتہائی شستہ اور
خوبصورت ہے۔ انسانیت کے دردِ مشترک کو خوب سمجھتے ہیں مگر وہ اپنی
شاعری کا رومانی مزاج نہیں بدل سکے۔ جگہ جگہ محبت سے محرومی کا احساس
ان کی شاعری میں اپنے رنگ بکھیرتا نظر آتا ہے اور یہی چیز ان کی شاعری
میں سوز و گداز کا سبب بنی ہے۔“ ۲۲۳

ہوش ہی میں کب ہیں جوشِ اضطرابِ دل سے ہم
منزلِ مقصود پر بھی دور ہیں منزل سے ہم
پھر سمجھ لیں گے کبھی صیادِ آدابِ قفس
آ کے بیٹھے ہیں ابھی پھولوں بھری محفل سے ہم
دھجیاں ہے دامنِ ہستی، گریباں تار تار
اک تماشہ بن کے نکلے ہیں تری محفل سے ہم
اب اسے دیوانگی سمجھے کوئی یا مصلحت
ہاں تصور میں ترے کرتے ہیں باتیں دل سے ہم
سیف شاید اس طرح نکلے رہ آسودگی

دیکھ لیں بیگانہ ہو کر ہوش کی منزل سے ہم



شمع تجھ کو راز کی اک بات سمجھانا بھی ہے
 جلنے والوں کا ترے نام ایک پروانہ بھی ہے
 شوق سے پردہ کریں لیکن وہ اتنا سوچ لیں
 ایک دن اُنکو ہمارے سامنے آنا بھی ہے
 تیری جنت سے ہے زاہد میکشوں کو اتفاق
 اتنا تو کہہ دے کہ اس کا نام مے خانہ بھی ہے
 سوچنے کا اور سمجھنے کا سلیقہ چاہیے
 داستانِ عشق ورنہ ایک افسانہ بھی ہے
 میرے ساتی تیرے اندازِ تغافل کی قسم
 مجھ کو پینا ہی نہیں، پی کر بہک جانا بھی ہے
 دیکھئے کیا رنگ لائے جذبہء دیوانگی
 آج فرزانوں میں شامل ایک دیوانہ بھی ہے
 یوں تو کہنے کو سخنور لوگ کہتے ہیں مجھے
 شاعری میں سیف نامِ سیف چمکانا بھی ہے ۳۳

نذیر چودھری

نذیر احمد چودھری ولد چودھری فضل احمد ۱۰ جنوری ۱۹۲۱ء کو چک نمبر ۹۵ جنوبی تحصیل ضلع
 سرگودھا ۳۵ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش کے بارے اختلافاً موجود ہیں مثلاً زاہد حسین
 انجم کے مطابق ۱۰ جنوری ۱۹۲۳ء ۳۶ راجا رسالو کے مطابق ۲۱ جنوری ۱۹۲۳ء ۳۷ طارق گجر کی

تحریر میں ۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء اور پروفیسر ریاض احمد شاد کی لکھت میں ۱۰ جنوری ۱۹۲۲ء ہے۔
لیکن میں نے جس یقین کے ساتھ بات کی ہے وہ میرے پاس نذیر چودھری کے اپنے ہاتھوں کی لکھی
ہوئی تاریخ موجود ہے۔

نذیر چودھری کے دادا چودھری سلطان احمد شاد یوال ضلع گجرات سے آ کر چک نمبر ۹۵
جنوای میں آباد ہوئے تھے۔ آپ نے بچپن اور جوانی کے دن اسی گاؤں میں گزارے ”میٹرک تک
تعلیم حاصل کی اور پھر فاضل ادیب کی سند حاصل کی“ ۳۰ اسی عرصے میں دو شادیاں کیں۔ اور پھر
تھل ڈوپلمنٹ اتھارٹی کے ذریعے آباد کاری کے سلسلے میں چک نمبر ۱۳۳ ٹی ڈی تحصیل لیہ میں آپ
نے کچھ زمین حاصل کر کے ۱۹۵۹ء میں لیہ میں جا کر رہنے کو ترجیح دی۔ لیہ میں آپ نے ”ادبی محفل“
کی بنیاد رکھی۔ شہباز نقوی اس کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ جس کے تحت ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۷ء
تک کئی پروگرام منعقد کروائے اور شعرو سخن کیلئے کام کیا۔

نذیر چودھری ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو اس دنیا سے چلتی پھرتی حالت میں رخصت ہو
گئے۔ آپ نے اردو اور پنجابی ہر دو زبانوں میں بہت کچھ لکھا۔ پنجابی زبان میں اُن کے شعری
مجموعے ”ساخجے دکھ“، ”چانن دا کھڑکار“ اور ”سوچاں دے انگارے“ شائع ہو چکے ہیں۔ جو شعری
مجموعے ترتیب دیے جا چکے تھے۔ اُن کے نام تھے۔

ساخجے روگ (پنجابی)۔ مٹے سہرے (پنجابی)۔ لوڑاں (پنجابی)۔ صدائے نو (اردو)
اور سوزِ وفا (اردو) لیکن شاید ان میں سے کوئی مجموعہ اشاعت پذیر نہیں ہو سکا۔ سنا ہے کہ یہ کلام شہباز
نقوی کے پاس تھا۔

ڈاکٹر خیال امر و ہوی اُن کی اردو شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

”نذیر چودھری نے زندگی کے مختلف زاویوں کو بیان کرتے وقت عجزِ بیاں
سے کام نہیں لیا۔ اور نہ ہی پنجاب کی روایتی زندگی کے حوالے سے بات کہی
ہے۔ بلکہ وہ شاعری کے میدان میں بے باک اور بے لاگ نقاد کی حیثیت

سے آتے ہیں اور فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔۔۔

نذیر صرف نذیر نہیں بلکہ عدیم النظیر ہے۔ ان کی پنجابی شاعری کی تشبیہات میں ثریا کی آب و تاب، مشتری کی چمک اور زہرہ و ناہید کا شباب شامل ہے۔ ماہتاب کی خنکی اور خورشید درخساں کا التہاب ملتا ہے۔“ ۳۳۲

چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

ہر لمحہ انکشاف کی زد میں ہے زندگی
دنیا نے کسی نام کو رکھا ہی نہیں یاد
سلگتی ہیں یقین و عزم کی راہیں تو کیا غم ہے
چھین لی فطرت نے اس سے پھر متاع اختیار
شاخ پر بیٹھا ہوا غمگین پنچھی دیکھ کر
اہل چمن کو آج بھی ان کی تلاش ہے

پھر بھی حقیقتوں پہ ہے پردا پڑا ہوا
سو نام لئے میں نے ترے نام سے پہلے
چمن کے پتے پتے کی حفاظت ہم نہ چھوڑیں گے
جب کوئی انسان انساں کا خدا ہونے لگا
میرے ہاتھوں سے جو زخمی تھا پرندہ اڑ گیا
جو لوگ آندھیوں میں جلاتے رہے چراغ

غزل

حالات کو اب درد کا احساس پکارے
دیوار کا سایہ بھی جہاں توبہ شکن ہے
ڈھونڈے گے کسی روز خدا کو بھی یقیناً
حیراں ہیں انہیں دیکھ کے پھولوں کے طلب گار
یاد ان کو دلانا نہ وفاؤں کے تقاضے
یہ اہل بصیرت کو بھی سمجھانا پڑے گا

پھیلے ہوئے ہر سمت ہیں جذبات ہمارے
اس شہر بچلے ہم بھی خدا خیر گزارے
انسان کی زد میں ہیں ابھی چاند ستارے
جیتے ہیں گلستاں میں جو کانٹوں کے سہارے
پتھر پہ لگے چوٹ تو نکلیں گے شرارے
ہیں چشم بصیرت میں بھی فطرت کے اشارے

اتری ہے کوئی چیز تو لہروں میں نذیر آج

بیٹھے ہوئے کچھ لوگ ہیں دریا کے کنارے

اقبال منظر

محمد اقبال المتخلص منظر ۱۱ اگست ۱۹۲۱ء کو انبالہ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بابو مشتاق تقسیم سے قبل محکمہ ڈاک میں ملازم تھے۔ اقبال منظر نے تقسیم ہند کے بعد ہجرت کی اور سرگودھا شہر میں رہائش پذیر ہوئے چونکہ بالکل واجبی سی تعلیم تھی لہذا دکانداری سے گزر اوقات کرنے لگے۔ لیکن گہر مشاہدہ پایا تھا۔ اور ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ اس پر طرہ کہ آواز بھی اچھی تھی اور ترنم سے مشاعرہ پڑھا کرتے تھے۔ اور ان کا شعر کہنے کا یہ انداز اپنے استاد حافظ یوسف آزاد سے ملتا تھا۔ مرتبین ”نقوش سرگودھا“ لکھتے ہیں:

”موسیقی سے گہرا لگاؤ ہے۔ اولاد نرینہ نہیں ہے۔ ابھی تک کوئی شعری مجموعہ نہیں چھپا۔ اب آپ کی عمر استاد کہلوانے کی ہے۔ ان کی شاعری میں روایت پسندی زیادہ ہے۔ چھوٹی بڑی بحر میں خوبصورت شعر کہتے ہیں۔“ ۲۲۳

”نقوش سرگودھا“ ان کے حیات میں شائع ہوئی تھی۔ اور یہاں یہ بتاتا چلوں کہ بڑھاپا استاد ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ احترام کی جاء ضرور ہے۔ آپ سرگودھا رائٹرز کلب کے ممبر بھی تھے۔ اور اجلاسوں میں بھی شریک ہوتے۔ جبکہ بزم شبلی کے اجلاسوں میں بھی حاضری دیتے تھے:

”آپ کی اہلیہ ۲۴ نومبر ۱۹۹۹ء کو ساتھ چھوڑ گئیں تو دل برداشتہ ہو گئے۔ چونکہ ایک ہی بیٹی تھی جو شادی کے بعد کراچی منتقل ہو گئی تھی۔ لہذا وہیں بیٹی کے ساتھ رہنے لگے۔ جہاں ۳۰ جنوری ۲۰۰۳ء کو جمعہ کے دن اڑھائی بجے سہ پہر وفات پائی۔ عید قربان کا موقع تھا۔ لیکن کوشش بسیار کے بعد رات کو اقبال منظر کی میت اس کی بیٹی۔۔۔ سرگودھا لے آئیں جہاں ۳۱ جنوری ۲۰۰۳ء کو سپرد خاک کیا گیا۔“ ۲۲۳

اقبال منظر نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نعت، ترانہ، غزل، نظم وغیرہ۔
آپ کی زیادہ تر شاعری سہل مُتَمَع میں تھی۔ خدا جانے اب کچھ کلام مختلف کتب میں شامل کے علاوہ
باقی ہے بھی یا نہیں۔

جستجو میں تیری اے دوست یہاں تک پہنچے ہوش اتنا نہ رہا ہم کو، کہاں تک پہنچے
ذات پہ تیری کیا جب سے بھروسہ میں نے وسوسے پھر نہ مرے وہم و گماں تک پہنچے
ظلم سہہ کر بھی مرے صبر کا عالم یہ ہے شکوے میرے نہ کبھی میری زبان تک پہنچے
جب گرمی برق گلستاں کو جلانے کے لیے کھیلنے موت سے ہم برق تپاں تک پہنچے
دشمنی اور عداوت کو مٹانے کے لیے ”میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے“

ان کے دیدار کی حسرت لئے دل میں منظر

کوچے کوچے میں پھرے کوئے بتاں تک پہنچے ۳۳۵

اشارے جب سے ہوئے ہیں تری نظر کے مجھے رقیب کہتے ہیں سب لوگ تیرے گھر کے مجھے
خمار جس کا کبھی عمر بھر نہ اترے گا پلا دیا ہے وہ ساقی نے جام بھر کے مجھے
حسین اُن کے سوا اب کوئی نہیں جچتا نظر جو آئے کچھ ایسے وہ بن سنور کے مجھے
ستم رسیدہ ہوں ڈرتا ہوں اپنے سائے سے تو کیوں ڈراتے ہیں سائے ہی میرے گھر کے مجھے
میں گہری نیند کے عالم میں محو تھا منظر
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے ۳۳۶

سید واحد حسین نشان

سید واحد حسین نام اور نشان تخلص تھا۔ آپ سید دلاور حسین زیدی کے بیٹے اور سید سجاد
حیدر یلدرم کے خاندان میں سے تھے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۲۲ء ۳۳۷ کو نہپور ضلع بجنور (انڈیا) میں پیدا
ہوئے۔ آپ کی ریٹائرمنٹ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی پیدائش ۱۹۲۱ء کی ہوگی۔ ابتدائی

تعلیم آپ نے اپنے گاؤں نہپور سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان آپ نے ڈیرہ دون سے پاس کیا۔ سید واحد حسین نشان نے تقسیم ہند پر ۱۹۴۷ء میں ہجرت کی اور مانسہرہ (اتک) میں مہاجرین کی آبادکاری میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء میں آپ سرگودھا منتقل ہوئے اور یہاں پی۔ اے۔ ایف کیڈٹ کالج سے وابستہ ہو گئے۔ تھوڑا عرصہ ہی اس ادارے میں کام کیا کہ آپ کو ایئر فورس میں بحیثیت سویلین ملازمت مل گئی۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں آپ نے زمینی اہلکار کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۸۱ء میں آپ ایک مدت گزارنے کے بعد سویلین گراؤنڈ سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ تب سے آپ نے خود کو خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا۔ ۱۹۹۳ء میں آپ کی کوششوں سے ایڈمی فاؤنڈیشن سرگودھا کی بنیاد رکھی گئی اور آپ نے اس میں سماجی کارکن کے طور پر خود کو گم کر دیا۔ لیکن اسکے باوجود ادبی سرگرمیوں کو فراموش نہیں کیا۔ اگرچہ پہلے جس ذوق و شوق سے شعری محفلوں میں حصہ لیتے تھے اس میں کمی آگئی مگر لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی زمانے میں آپ نے اپنا شعری مجموعہ بھی ترتیب دیا۔ جس کا نام ”درد دل“ رکھا۔ لیکن بوجہ وہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا:

”واحد حسین نشان کی مادری زبان اردو تھی اور یہی زبان آپ نے اظہار خیال کے لئے استعمال کی۔ ادب آپ کی گھٹی میں پڑا تھا۔ آپ کی گفتگو میں سے بھی اس کے اثرات جھلکتے تھے۔ آپ بڑی شائستہ اور نستعلیق اردو بولتے تھے۔ خلق و مروت سے آپ ہمیشہ پیش آتے اور پھر۔۔۔ ایک دن یہ شیریں مزاج اور خدمت خلق میں خود کو مشغول رکھنے والا شخص اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔“ اس دن ۱۷ مئی ۲۰۰۰ء کی تاریخ تھی۔“ ۲۳۸

غزل

تم ابر کرم بن کے بھی اب آؤ کسی دن مقصد ہی برسا ہے برس جاؤ کسی دن
اتنا ہی نہ دو دکھ کہ نہ ہو جس کا مداوا ایسا بھی نہ ہو بعد میں پچھتاؤ کسی دن

ایمان سے مانوں گا محبت کو تمہاری اک بار مرے سر کی قسم کھاؤ کسی دن
 بحرِ غم ہستی کے تھپیڑے میں بہت تیز یہ ڈوب ہی جائے نہ بھری ناؤ کسی دن
 میرا بھی جہاں میں ہو کوئی ہمد و دم ساز اللہ کرے تم مرے بن جاؤ کسی دن
 کس کس کو نشاں اپنا بناؤ گے جہاں میں
 یہ مفت کا غم ہے اسے نمٹاؤ کسی دن

کوئی خواہش تو ایسی ہے کہ جس کو پال رکھا ہے عجب سے مخمضے میں دل کو اس نے ڈال رکھا ہے
 پنپ سکتی نہیں نسلیں ہماری رہتی دنیا تک کہ ان کا باندھ کر قرضے میں اک اک بال رکھا ہے
 ہزاروں الجھنوں نے رکھ دیا ہے مجھ کو الجھا کر خرد کا نام میں نے اس لئے جنجال رکھا ہے
 کبھی سوچا بھی ہے تم نے وطن کو لوٹنے والو فنا کا ہر طرف کس نے بچھا کر جال رکھا ہے!
 پگھل جاتا ہوں میں ہر آنچ پر تم جانچ کر دیکھو ہر اک سانچے میں میں نے زندگی کو ڈھال رکھا ہے

نہ چھوڑا صبر کا دامن نشاں اس دار فانی میں

ہمیشہ خرمی سے دل کو مالا مال رکھا ہے ۲۳۹

بشیر احمد بشیر

بشیر احمد المتخلص بشیر "۸ مارچ ۱۹۲۲ء کو کالہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔" ۲۳۰ پاکستانی
 اہل قلم کی ڈائریکٹری نے ۸ مئی ۲۳۱ء کی جو تاریخ لکھی ہے۔ اسے "شہرِ غزل" ۲۳۲ء۔ "ہمارے اہل
 قلم" ۲۳۳ء اور راقم کے نام لکھے گئے جناب قمر حجازی نے اپنے ایک مکتوب ۲۳۴ء میں بھی رد کر دیا ہے۔
 اور سب سے بڑا حوالہ مرحوم بشیر احمد بشیر کا شعری مجموعہ "بات تری ورق ورق" ۲۳۵ء ہے۔ آپ کا
 آبائی وطن ساہیوال ضلع سرگودھا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کالہ سے حاصل کی۔ قمر حجازی اس سلسلے
 میں کمال مہربانی سے راقم (شاگردان) کو آگاہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ :

"آپ نے تین کلاسیں اپنے گاؤں سے اور چوتھی منگلوری

(ساہیوال) سے کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول منگمیری میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں میٹرک کیا۔ میٹرک کا آخری سال تھا کہ اس سکول میں ممتاز مفتی بحیثیت ٹیچر آ گئے۔ اُن سے انگریزی پڑھی۔ ایف ایس سی پری میڈیکل گورنمنٹ ڈگری کالج فیصل آباد سے کیا اُن دنوں وہاں سری کرشن کپور پرنسپل تھے۔ یہاں پروفیسر رام بھیجا مل سیٹھ، پروفیسر مسٹر دتہ اور پروفیسر دارو والا جیسے قابل استاد میسر آئے۔ ایف ایس سی کرنے کے بعد نائب تحصیل دار منتخب ہو گئے۔ ادھر Joining سے قبل کمشن (آرمی) کیلئے Select کر لئے گئے۔ بعد میں سرکاری ملازمت کا خیال چھوڑ کر اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا جہاں دل محمد پرنسپل تھے۔ لاہور میں دل نہ لگا تو پھر فیصل آباد گورنمنٹ ڈگری کالج میں آ گئے اور یہاں سے ۱۹۴۳ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اکنامکس میں آپ کے استاد پروفیسر پنڈت سریندر موہن دتاتریہ تھے جو کہ مشہور شاعر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کے بیٹے تھے۔“ ۲۲۶

جناب بشیر احمد بشیر نے گریجوایشن کے بعد ذاتی کاروبار کئے اور پھر آباد کاری کے سلسلے میں آپ کے دادا سلطان احمد کو چک نمبر ۶-آ/۸۲ میں جو زمین ملی تھی اور جسے آپ کے والد عطا محمد نے بڑی محنت سے آباد کیا تھا آپ نے اسی جائیداد کو مزید بہتر بنانے میں اپنی صلاحیتیں استعمال کرنا شروع کر دیں۔

۱۹۵۰ء میں آپ نے شاعری شروع کی۔ اس سے قبل ۱۹۴۶ء میں آپ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہو چکے تھے اور حاجی آپ کے نام کا حصہ بن چکا تھا۔ جب شعر کہنا شروع کیا تو پہلے امر او مرزا فیروز پوری اور پھر مولانا عطا اللہ جنون کی شاگردی اختیار کی۔ کچھ عرصہ سیاست کا حصہ بھی رہے اور مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی کے ضلعی صدر رہے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ نے شاعری کی طرف بھر

پور توجہ دی اور اجل کے آنے یعنی جولائی یا اگست ۲۰۰۲ء تک اس شغف کو برقرار رکھا۔ آپ کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اور ان چاروں کتابوں کو یکجا کر کے کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ آپ کے چاروں مجموعے ہائے کلام کے نام ہیں۔ قوسِ خیال، بات تری ورق ورق، اور زحمتِ نوا، اردو کلام اور اپنے ساتھ داسیک بزبانِ پنجابی ہے۔

غزل

کوئی فقیر بھی کنجِ رضا میں رہتا ہے پتہ اُسے بھی ہے اپنی ہوا میں رہتا ہے
 ہتھیلیوں پہ ہی آکر شفق کھلاتا ہے حنا کا رنگ جو برگِ حنا میں رہتا ہے
 بدل رہی ہیں یہاں موسموں کی ترتیمیں تجھے خبر ہی نہیں۔ کس خلا میں رہتا ہے؟
 ملے فراغ تو کرتا ہے سو افقِ تخلیق وہ اک خیال سا جو ابتدا میں رہتا ہے
 نہ لاسکے تری خوشبو ہی اُس طرف سے اگر تو کیا صبا سے غرض، کیا صبا میں رہتا ہے؟
 کہیں بھی جائے کوئی اُس سے بدگماں ہو کر اسی کے حلقہء قدرو قضا میں رہتا ہے

نہیں زبان پہ لاتا بشرِ حرفِ طلب

غریبِ سادہ ہے بس چپ حیا میں رہتا ہے ۳۳۷

بجا تھا خوفِ دلوں کا ہوا ہی ایسی تھی نہ گھر بچے نہ گھر وندے بلا ہی ایسی تھی
 بتا دیا تھا تجھے شہرِ صبر کا انجام تجھے تو آپ خبر ہے بنا ہی ایسی تھی
 طلسم تھا نہ وہ جادو مگر کشش تھی عجب رہا گیا نہ کسی سے صدا ہی ایسی تھی
 مری نظر میں تھی نا محکمی تعلق کی میں غیبِ داں تو نہیں ابتدا ہی ایسی تھی
 افق سے تا بہ افق دشتِ جاں میں جل تھل تھا جو راتِ روح پہ برسی گھٹا ہی ایسی تھی
 شفا ہوئی نہ ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا مرض ہی ایسا تھا یا پھر دوا ہی ایسی تھی

یہاں تو بے گنہی بھی ہے لائقِ تعزیر

بشرِ تیری تو پیارے خطا ہی ایسی تھی ۳۳۸

ڈاکٹر وزیر آغا

وزیر آغا بن آغا وسعت علی خان ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو وزیر کوٹ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ پاکستانی اہل قلم کی ڈائریکٹری میں ۱۹۲۳ء کا سن جو تحریر کیا گیا ہے وہ اس لئے بھی غلط ہے کہ کسی بھی اور تحریر میں یہ سن پڑھنے میں نہیں آیا۔ اور نہ ہی ڈاکٹر وزیر آغا نے کبھی غلط تاریخ پیدائش بتائی ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم چک نمبر ۳۴ جنوبی میں حاصل کی۔ جو سکھوں کا گاؤں تھا۔ کچھ عرصہ منگمری میں زیر تعلیم رہے۔ واپس آئے تو سرگودھا شہر کا سفر کرنا پڑا جہاں گورنمنٹ ہائی سکول سے ۱۹۳۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ کالج جھنگ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے انٹر کیا۔ اسی دوران آپ کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا کالج کے مجلہ ”چناب“ کی ادارت سے حوصلوں کو مزید تقویت ملی۔ ۱۹۳۹ء میں آپ لاہور چلے گئے اور گورنمنٹ کالج سے ۱۹۴۳ء میں معاشیات میں ایم اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۵۶ء میں آپ نے ”اردو ادب میں طنز و مزاح“ کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ آپ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک ماہنامہ ”ادبی دنیا“ کے شریک مدیر رہے۔ مولانا صلاح الدین احمد کے انتقال کے بعد آپ نے ادبی دنیا کی ذمہ داری چھوڑ دی۔ اور پھر ۱۹۶۶ء میں ”اوراق“ کا اجراء مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں کیا۔ جو تقریباً ۴۰ سال تک جاری رہا۔ اور وفات سے چند سال پہلے ان کی بیماری کے باعث تعطل کا شکار ہوا اور پھر دو بارانہ شائع ہو سکا۔ آپ نے ۷ ستمبر ۲۰۱۰ء/۲۸ رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ رات بوقت ساڑھے گیارہ بجے لاہور کے ایک ہسپتال میں وفات پائی جبکہ آپ کی میت کو اپنے گاؤں وزیر کوٹ میں لا کر دوسرے دن دفن کیا گیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی بہت سی ادبی جہات ہمارے سامنے ہیں۔ وہ محقق، نقاد، انشائیہ نگار، مدیر، مؤلف، مترجم، مضمون نگار، اور شاعر تھے۔ ان تمام جہات میں وہ ایک Trend Setter کے طور پر سامنے آئے آپ کا مطالعہ بھی ہر موضوع کے حوالے سے بہت وسیع تھا۔ اور آپ نے مطالعہ کو ضائع بھی نہیں ہونے دیا۔ اسے استعمال کیا ہے۔ اردو، انگریزی اور پنجابی پر سہ زبانوں میں آپ کی خدمات

اہل ادب پر عیاں ہیں۔ آپ کی شخصیت اور فن کے بارے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اُن کی تصانیف اور اُن پر کئے جانے والے کام پر روشنی ڈالوں۔ آپ سے ایک انٹرویو میں جب میں نے آپ کی کتب کے بارے پوچھا تو فرمانے لگے کہ چالیس سے زائد کتب ہو جائیں تو یاد نہیں رہتیں۔ بہر حال آپ کی تصانیف کی فہرست ملاحظہ فرمائیے:

انشائیہ

- (۱) خیال پارے (۱۹۶۱ء) (۲) چوری سے یاری تک (۱۹۶۶ء)
 (۳) دوسرا کنارہ (۱۹۸۲ء) (۴) سمندر اگر میرے اندر گرے (۱۹۸۹ء)
 (۵) پگڈنڈی سے روڈ رولر تک (کلیات) (۱۹۹۵ء)

تنقید

- (۱) اردو ادب میں طنز و مزاح (۱۹۵۹ء) (۲) نظم جدید کرکروٹیس (۱۹۶۳ء)
 (۳) اردو شاعری کا مزاج (۱۹۶۵ء) (۴) تنقید اور احتساب (۱۹۶۷ء)
 (۵) تخلیقی عمل (۱۹۷۰ء) (۶) نئے مقالات (۱۹۷۲ء)
 (۷) تنقید اور مجلسی تنقید (۱۹۸۱ء) (۸) تصوراتِ عشق و خرد، اقبال کی نظر میں (۱۹۷۷ء)
 (۹) نئے تناظر (۱۹۷۹ء) (۱۰) دائرے اور لکیریں (۱۹۸۶ء)
 (۱۱) تنقید اور جدید اردو تنقید (۱۹۸۹ء) (۱۲) انشائیہ کے خدو خال (۱۹۹۰ء)
 (۱۳) مجید امجد کی داستانِ محبت (۱۹۹۱ء) (۱۴) ساختیات اور سائنس (۱۹۹۱ء)
 (۱۵) غالب کا ذوقِ تماشا (۱۹۹۷ء) (۱۶) معنی اور تناظر (۱۹۹۸ء)
 (۱۷) امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر (۲۰۰۷ء) (۱۸) کلچر کے خدو خال (۲۰۰۹ء)
 (۱۹) اردو ادب میں عورت کا سماجی کردار

متفرق کتب

- (۱) مسرت کی تلاش (فکر و فلسفہ) (۱۹۵۳ء) (۲) شامِ دوستاں آباد (یاد نگاری) (۱۹۷۴ء)

- (۳) شام کی منڈیر سے (خودنوشت) (۱۹۸۶ء)
 (۴) دستک اس دروازے پر (فکر و فلسفہ) (۱۹۹۳ء)
 (۵) تین سفر (سفر نامہ) (۱۹۹۶ء)
 (۶) The Symphony of existence (۱۹۹۵ء)

ترتیب / تدوین / انتخاب

- (۱) ۱۹۵۸ء کی بہترین نظمیں
 (۲) ۱۹۵۹ء کی بہترین نظمیں
 (۳) ۱۹۶۰ء کی بہترین نظمیں
 (۴) ۱۹۶۱ء کی بہترین نظمیں
 (۵) عبدالرحمن چغتائی - شخصیت اور فن (۱۹۸۰ء)
 (۶) انتخاب جدید نظم (۱۹۸۱ء)
 (۷) مولانا صلاح الدین احمد شخصیت اور فن (۱۹۹۰ء)
 (۸) پوٹری اور اوراق انتھالوجی (اردو، انگریزی) تین حصے (۱۹۹۶ء-۱۹۹۸ء-۱۹۹۹ء)

شاعری

- (۱) شام اور سائے (نظمیں) ۱۹۳۶ء
 (۲) دن کا زرد پہاڑ (نظمیں - غزلیں) ۱۹۶۹ء
 (۳) غزلیں (۱۹۷۳ء)
 (۴) نردبان (نظمیں) ۱۹۷۹ء
 (۵) آدھی صدی کے بعد (طویل نظم) ۱۹۸۱ء
 (۶) گھاس میں تتلیاں (نظمیں) ۱۹۸۵ء
 (۷) اک کتھا انوکھی (نظمیں، غزلیں) ۱۹۹۰ء
 (۸) چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (کلیات نظم) ۱۹۹۱ء
 (۹) یہ آواز کیا ہے (نظمیں) ۱۹۹۵ء
 (۱۰) عجب اک مسکراہٹ (نظمیں) ۱۹۹۷ء
 (۱۱) چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (غزلیں) ۱۹۹۸ء
 (۱۲) چناہم نے پہاڑی راستہ (نظمیں) ۱۹۹۹ء
 (۱۳) ہم آنکھیں ہیں (نظمیں) ۲۰۰۱ء
 (۱۴) دیکھ دھنک پھیل گئی (نظمیں) ۲۰۰۳ء
 (۱۵) چٹکی میں روشنی (نظمیں) ۲۰۰۵ء
 (۱۶) ہوا تحریر کر مجھ کو (۲۰۰۹ء)
 (۱۷) چٹکی میں روشنی (نظمیں) ۲۰۰۵ء
 (۱۸) چھج تاریاں دا (پنجابی شاعری) ۲۰۰۰ء
 (۱۹) وا جاں باجھ و چھوڑے (پنجابی شاعری) ۲۰۰۳ء
 (۱۷) کاسے شام (۲۰۱۱ء)

آپ کی نگارشات کے دوسری زبانوں میں تراجم

- ۱۔ Selected Peoms of Wazir Agha (انگریزی) ۱۹۷۸ء
- ۲۔ آدھی صدی کے بعد از: ش۔ ک۔ نظام (ہندی) ۱۹۸۳ء
- ۳۔ Half a Century Later از: راجندر سنگھ ورما (انگریزی) ۱۹۸۹ء
- ۴۔ A Tale so strange از: ڈاکٹر وزیر آغا (انگریزی) ۱۹۹۲ء
- ۵۔ A Tale so strang از: ڈانے پاپاسیٹرانٹو (سویڈش) ۱۹۹۳ء
- ۶۔ A Tale so strang از: ایوا۔ ایم۔ ایلینڈر (سویڈش) ۱۹۹۵ء
- ۷۔ اردو شاعری کا مزاج از: سیمانت پرکاش (ہندی) ۱۹۸۷ء
- ۸۔ بارہواں کھلاڑی مترجم: موہن لال (ہندی) ۱۹۸۵ء
- ۹۔ ادھی صدی پچھوں مترجم: راز سنتو کھسری (پنجابی) ۱۹۹۳ء
- ۱۰۔ چونٹرویاں نظماں سرانسیکی ۱۹۸۰ء
- ۱۱۔ Winds of Fire مترجم: مظفر اے غفار (انگریزی) ۱۹۹۳ء
- ۱۲۔ Seven Poems of Wazir Agha مترجم آزاد گلاٹی (انگریزی) ۱۹۹۵ء
- ۱۳۔ Mild and Mellow مترجم: ستیہ پال آنند (انگریزی) ۱۹۹۷ء
- ۱۴۔ Selected Light Essay مترجم: جے رتن (انگریزی) ۱۹۹۵ء
- ۱۵۔ Peoms and Haiku Poems از: وزیر آغا (انگریزی) ۱۹۹۹ء
- ۱۶۔ Is any one out there، از وزیر آغا (انگریزی) ۲۰۰۰ء
- ۱۷۔ Half a century Later مترجم: نصیر ملک (ڈینش) ۱۹۹۸ء
- ۱۸۔ Lat the Strings Vibrate از وزیر آغا (انگریزی) ۲۰۰۱ء
- ۱۹۔ Haiko از زوسوینا (یونانی) ۲۰۰۲ء
- ۲۰۔ Siserive از برنورومی (اطالوی) ۲۰۰۲ء

- ۲۱۔ Late Showers۔ از وزیر آغا (انگریزی) ۲۰۰۳ء
- ۲۲۔ Selected Poems & Haiko۔ از افضل عباس / پال ایرک نارن (ناروئیکین) ۲۰۰۲ء
- ۲۳۔ Qnros۔ از زوسوینا (یونانی) ۲۰۰۵ء
- ۲۴۔ Babilonia۔ از برنورومی (اطالوی) ۲۰۰۵ء

تخلیقات پر مرتبہ کتب

- ۱۔ وزیر آغا کے دیباچے مرتبہ: ڈاکٹر احسن زیدی (۱۹۹۰ء)
 - ۲۔ پہلا ورق (اوراق کے ادارے) مرتبہ: حیدر قریشی، راغب شکیب (۱۹۹۰ء)
 - ۳۔ وزیر آغا کے خطوط مرتبہ: ڈاکٹر انور سدید (۱۹۸۵ء)
 - ۴۔ مکالمات (وزیر آغا سے) مرتبہ: ڈاکٹر انور سدید (۱۹۹۱ء)
 - ۵۔ منتخب نظمیں مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین اظہر
 - ۶۔ وزیر آغا کے خطوط اکبر حمیدی کے نام مرتبہ: اکبر حمیدی (۱۹۹۵ء)
 - ۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین مرتبہ: سجاد نقوی (۱۹۹۵ء)
 - ۸۔ اوراق کے ادارے مرتبہ: اقبال آفاقی (۲۰۰۰ء)
 - ۹۔ میراجی بحوالہ ڈاکٹر وزیر آغا، طارق حبیب (مشمور ماہنامہ شیبہ خوشاب جنوری تا جون ۲۰۰۷ء)
 - ۱۰۔ کشف ذات کی آرزو کا شاعر، طارق حبیب (۲۰۱۰ء)
 - ۱۱۔ نئے مکالمات، شاہد شیدائی / عابد خورشید (۲۰۱۰ء)
- ### فکروفن پر مبنی کتب و رسائل
- ۱۔ وزیر آغا ایک مطالعہ از ڈاکٹر انور سدید (۱۹۸۲ء)
 - ۲۔ شام کا سورج۔ مرتبہ: ڈاکٹر انور سدید (۱۹۸۹ء)
 - ۳۔ اردو شاعر کا مزاج معاصرین کی نظر میں۔ مرتبہ: سجاد نقوی (۱۹۸۷ء)

۴۔ دن ڈھل چکا تھا (نظموں کا تجزیاتی مطالعہ) ناصر عباس نیر (۱۹۹۳ء)

۵۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ہمارا عہد۔ رشید نثار (۱۹۹۸ء)

۶۔ وزیر آغا کی امتزاجی نظریہ سازی از مناظر عاشق ہرگانوی (۱۹۹۶ء)

۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت۔ حیدر قریشی (۱۹۹۶ء)

۸۔ Presented to Wazir Agha (۲۰۰۱ء)

۹۔ بیاض شب و روز (نظموں کا تجزیاتی مطالعہ) ارمان نجمی (۲۰۰۱ء)

۱۰۔ امتزاجی تنقید کی شعریات۔ رفیق سندیلوی (۲۰۰۳ء)

۱۱۔ آفتاب ادب، پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم (۲۰۱۱ء)

۱۲۔ وزیر آغا اہل قلم کی نظر میں، گل بخشالوی (۱۹۹۷ء)

۱۳۔ وزیر آغا شخصیت اور فن، رفیق سندیلوی (۲۰۰۶ء)

۱۴۔ وزیر آغا کی بائیس نظمیں، مرتبہ: عابد خورشید (۲۰۰۷ء)

۱۵۔ تنقید اور وزیر آغا کی تنقید، شازیہ عمر (۲۰۱۰ء بھارت)

۱۔ الزبیر (وزیر آغا نمبر) بہاولپور

۲۔ آوازِ جرس (وزیر آغا نمبر) لاہور

۳۔ تخلیقی ادب مرتبہ مشفق خواجہ (خصوصی گوشہ)

۴۔ سکائی لارک انٹرنیشنل (انگریزی) وزیر آغا نمبر۔ انڈیا

۵۔ طلوع افکار۔ کراچی (خصوصی گوشہ)

۶۔ چہار سو۔ راولپنڈی (خصوصی گوشہ)

۷۔ تسطیر، لاہور (یہ آواز کیا ہے) خصوصی گوشہ

- ۸۔ تسطیر، لاہور (خصوصی مطالعہ۔ نظم)
- ۹۔ ادبِ معلیٰ (وزیر آغا نمبر) لاہور
- ۱۰۔ کاغذی پیرہن (وزیر آغا نمبر) لاہور
- ۱۱۔ شعر و سخن، مانسہرہ
- ۱۲۔ اخبارِ اردو، اسلام آباد (گوشہ)
- ۱۳۔ کاغذی پیرہن، لاہور
- ۱۴۔ مخزن، لاہور (خصوصی گوشہ)
- ۱۵۔ اسالیب، سرگودھا
- ۱۶۔ ادبِ معلیٰ، لاہور
- ۱۷۔ نالہ، بھیرہ
- ۱۸۔ جدید ادب، جرمنی
- ۱۹۔ تجدید نو، لاہور
- ۲۰۔ قومی زبان، کراچی (گوشہ)
- ۲۱۔ سہل، راولپنڈی
- ۲۲۔ اجراء، کراچی (خصوصی گوشہ)
- ۲۳۔ الحمراء، لاہور
- ۲۴۔ رنگ و بو، حیدرآباد (بھارت) (گوشہ)
- جامعات میں خصوصی تحقیقی کام

- (۱)۔ وزیر آغا کافن۔ بہار یونیورسٹی بھارت (پی ایچ ڈی کا مقالہ)
- (۲)۔ وزیر آغا کی انشائیہ نگاری۔ مارواڑی کالج بھاگلپور بھارت (پی ایچ ڈی کا مقالہ)

- (۳)۔ وزیر آغا کی تنقید۔ پٹنہ یونیورسٹی۔ بھارت (پی ایچ ڈی)
- (۴)۔ وزیر آغا کی تنقید نگاری۔ جے پور بھارت (ایم فل)
- (۵)۔ وزیر آغا کا اسلوب نثر۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ (ایم۔ اے)
- (۶)۔ وزیر آغا کی شاعری۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ (ایم۔ اے)
- (۷)۔ وزیر آغا کی تنقید۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور (ایم اے)
- (۸)۔ وزیر آغا کی مضمون نگاری۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور (ایم۔ اے)
- (۹)۔ وزیر آغا کے انشائیے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔ (ایم۔ اے)
- (۱۰)۔ وزیر آغا کی انشائیہ نگاری۔ پشاور یونیورسٹی (ایم۔ اے)
- (۱۱)۔ وزیر آغا کی اقبال شناسی۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔ (ایم۔ اے)
- (۱۲)۔ وزیر آغا کی نظم نگاری، نمل اسلام آباد (ایم فل)
- (۱۳) وزیر آغا بحیثیت نقاد، پنجاب یونیورسٹی لاہور (ایم اے)
- (۱۴) ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت شاعر، پنجاب یونیورسٹی (ایم اے)
- (۱۵) وزیر آغا کی نظموں کے انگریزی تراجم، پنجاب یونیورسٹی (ایم اے)
- (۱۶) ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید جہات، یونیورسٹی آف سرگودھا (ایم اے)
- (۱۷) ڈاکٹر وزیر آغا کی علم و ادبی خدمات، نمل اسلام آباد (پی ایچ ڈی)

ان کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں سکالرز کو مقالے دے دیے گئے ہیں۔ جن پر وہ کام کر رہے ہیں۔

دراصل ڈاکٹر وزیر آغا ایک ایسی شخصیت ہے جس نے ساری زندگی ادب کے لئے گزار دی۔ ادب کی خدمات میں نئے خیالات اور نئے رجحانات میں انہوں نے خود بھی کام کیا اور کام کرنے والوں کی پذیرائی بھی کی۔

وزیر آغانے شاعری میں زمین سے اپنے تعلق کو اور فطرت سے قرب کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نظم کو اگرچہ آپ نے ترجیح دی لیکن غزل میں بھی خود کو کمزور ثابت نہیں ہونے دیا۔ اُن کی غزل کے بارے میں مصور سبزواری کا کہنا ہے کہ

”یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ وزیر آغا ذات کی گم شدگی اور اس کی بازیافت کے سراب کی زد پر بالکل نہیں آئے۔ خارجی مظاہر سے جو تشخص انہوں نے اپنی نئی غزلوں سے برآمد کیا ہے وہ داخل اور خارج کے غیر منقسم نقطہء تقسیم کا ایک قبول ترین عمل ہے۔۔۔“

ان غزلوں کے بین السطور میں سب سے بڑا وصف یہ نظر آتا ہے کہ شدید فکری، ذہنی اور اعصابی تناؤ کی فضا ہوتے ہوئے بھی موضوع، مواد، ہیئت اور فطرت پرستی کا روحانی نظام قائم رہتا ہے۔ کسی جس کو اس طرح جگانا کہ تمام تار ایک ساتھ بج اٹھیں اور آوازوں کے وجدان کا سماں پیدا ہو جائے

معر کے کا کام نہ سہی مشکل ضرور ہے“۔ ۳۳۹

اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغانے کی نظم میں ایک ایسی زندگی ہے۔ جو خود بول اٹھتی ہے۔ اور قاری اس کی قرأت نہیں کرتا بلکہ وہ نظم خود پڑھانے پر اکساتی ہے۔ اور کائنات کے راز اور دانش کی گتھیاں سامنے آتی جاتی ہیں۔ اور جب آدمی ان پر فرصت نکال کر غور کرے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ ان تہوں سے آج تک پردہ کیوں نہ سرکا۔ بہر حال غزل اور نظم بطور نمونہ حاضر ہے۔

آنسو بھری مسکان

بس اک

آنسو بھری مسکان ہے

جس کے سہارے جی رہے ہیں
 وگرنہ چھت پہ کنکر بھی گرے
 تو اک دھماکہ
 سارے تن کو کپکپی کا دان دیتا ہے
 سحر دم، دودھیا اخبار کے پرتوں
 کے ٹکرانے سے
 خبریں پتیاں بن بن کے گرتی ہیں
 ”تبرک“ مٹھیوں میں بھر کے
 خالی جھولیوں میں دم بہ دم
 تقسیم کرتی ہیں
 ہوا جھونکوں میں بٹ کر
 شہر کی گلیوں میں
 ہم کو ڈھونڈنے نکلی ہوئی ہے
 مقفل کھڑکیوں پر دستکیں دیتی
 ہماری کھوج میں پاگل ہوئی ہے
 نہ جانے کس جگہ ہم آگئے ہیں
 جہاں خوشیاں
 زو جا رو ب کھاتی پھر رہی ہیں
 بس اک آنسو بھری مسکان ہے
 جس کے سہارے جی رہے ہیں ۳۵۰



غزل

کل رات میری چاند سے پھر گفتگو رہی اک جوئے غم ہمکتی ہوئی سوبہ سُو رہی
 کاٹی گلوں کی بیج پہ کب ہم نے زندگی میٹھی سی اک چبھن تھی، سدا مشکبو رہی
 اک عمر ہم بندھے رہے خوشبو کی ڈور میں تلوار بن کے موجِ ہوا روبرو رہی
 اے گل بدن سحر یہ بتا کس کی یاد میں آنسو کی گرم بوند میں محصور تو رہی
 ہم خود کو برف ہوتے ہوئے دیکھتے رہے سینے میں سانس روکے ہوئے گرم لُو رہی
 پلکوں سے کیسے پھوٹیں گی خوابوں کی پیتاں آنکھوں میں یوں ہی خشک اگر آ بجو رہی
 بادِ شمال کچھ تو مرا بھی خیال کر
 کیا میں رہوں گا تو جو مرے چار سو رہی ۳۵۱

محمد انور گوندی

سرگودھا شہر میں ادب کے فروغ میں ادبی رسالے اور مشاعرے کے حوالے سے جس شخص نے ابتداء بہت اہم کردار ادا کیا وہ تھے محمد انور گوندی۔

”محمد انور گوندی ۸ ستمبر ۱۹۲۲ء کو متراں والی سیالکوٹ میں پیدا

ہوئے۔۔۔ آپ شیخ امام دین گوندی کے بڑے بیٹے تھے۔ بچپن میں انور

پاشا کے نام سے مشہور تھے“۔ ۳۵۲

ابھی آپ بچے ہی تھے کہ والدین کے ساتھ سرگودھا آ گئے۔ کچھری بازار میں آپ کے والد کی تین دکانیں تھیں۔ انور گوندی نے واجبی تعلیم حاصل کی اور والد کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے۔ سکول کے زمانے میں آپ کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ موسیقی کی شدبُد حاصل کی، فوٹو گرافی کا شوق اپنایا۔ آپ ۱۹۴۰ء میں خاکسار تحریک میں شامل ہوئے اور بڑے جوش و خروش سے اس میں حصہ لیتے رہے لیکن تحریک پاکستان نے جب زور پکڑا تو مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

محمد انور گوندی نے ۱۹۴۰ء میں مشاعروں کی ابتداء کی۔ مقامی اور دیگر شہروں کے شعراء ان مشاعروں میں بھرپور حصہ لیتے اور سامعین بھی ٹکٹ خرید کر مشاعرہ سننے کے لئے آتے جو ایک بالکل الگ روایت تھی۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۷۰ء تک یہ سلسلہ جاری رہا اور انہیں کامران مشاعروں کا نام دیا گیا۔ جن شعراء نے اس سارے عرصے یعنی تیس سال میں یہاں شرکت کی۔ ان میں محمد حسین شوق۔ الطاف مشہدی۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر۔ علامہ رشک ترابی۔ مولانا اختر سرحدی۔ خواجہ محمد حنیف۔ میر عبدالرشید اشک۔ اصغر مشہدی۔ حافظ محمد یوسف آزاد۔ میاں محمد انور۔ سید عابد علی عابد۔ رشید قیصرانی۔ پیر فضل حسین فضل۔ ظہور نظر۔ رابعہ نہاں۔ محمودہ سوز۔ خورشید راٹھور۔ اکرام اللہ شرر۔ مشتاق اسلام آبادی۔ سرور مجاز۔ شفقت بٹالوی۔ حشمت آرا حجاب۔ طالب جالندھری۔ اظہر جاوید۔ اختر واصفی۔ جعفر طاہر۔ محترمہ حفصہ طور بہار۔ جوہر نظامی۔ عبد الحمید عدم۔ منظور احمد منظور۔ شیر افضل جعفری۔ غلام حسین عادل۔ مرزا مامول انور۔ غلام حسین قیصر۔ رفعت سلطان۔ عبدالغنی جوہر۔ جمیل اطہر۔ مصطفیٰ صادق۔ مظفر حسن منصور۔ راجہ علی گوہر۔ محسن احسان۔ مرزا محمود سرحدی۔ محترمہ نجم السحر۔ بسمل صابری۔ رشیدہ سلیم سیمیں۔ ادا جعفری۔ حفیظ جالندھری۔ احمد ندیم قاسمی۔ وزیر آغا۔ جگر مراد آبادی۔ سیما اکبر آبادی۔ شاکر نظامی۔ خدا سوز۔ منور سلطانہ لکھنوی۔ قمر لدھیانوی۔ نگہت پروین رعنا۔ مظفر وارثی۔ مس صنوبر مصور۔ شارب انصاری۔ بشیر احمد تارڑ۔ خورشید رضوی۔ فیض لدھیانوی۔ حافظ لدھیانوی۔ بیدل پانی پتی۔ کنول فیروز۔ نسیم سید۔ میاں کریم بخش مضطر۔ ضامن علی حیدری۔ خاور لدھیانوی۔ شریف کنجاہی۔ عصمت علیگ اور انور گوندی (میزبان) کے علاوہ کئی دیگر شعراء کے نام شامل ہیں۔

محمد انور گوندی کا دوسرا بڑا کارنامہ ایک ادبی مجلے ”کامران“ کا اجراء تھا۔ یہ پرچہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء تک باقاعدگی سے جاری رہا۔ ۱۹۷۰ء میں انہیں دل کی بیماری لاحق ہوئی تو یہ پرچہ بھی بند کرنا پڑا۔ ۱۷ مئی ۱۹۷۱ء کو ان کے بہت ہی قریبی دوست محمد حسین شوق فوت ہوئے تو تین دن بعد انہیں دل کا دورہ پڑا اس سے بچ گئے لیکن کچھ عرصہ بعد فالج ہوا اور بائیں حصہ کو مفلوج کر گیا۔

بالآ خراسی حالت میں ۱۰ ستمبر ۱۹۷۴ء کو وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ شاعری سے آپ کو محبت تھی۔ جس کا اظہار اُن کے منعقدہ مشاعروں اور کامران رسالے سے ہوتا ہے۔ خود بھی لکھا لیکن وہ جمع نہ کر سکے۔ آپ کی وفات کے کافی عرصہ بعد ہارون الرشید تبسم نے اُن کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کچھ کلام کو ”نوائے انور“ کے نام سے ترتیب دیا۔

غزل

میں رندِ خرابات ہوں رہتا ہوں نشے میں سن غور سے وہ بات جو کہتا ہوں نشے میں
اللہ رے تری مست نگاہی کا یہ افسوں پُر کیف سی اک لہر پہ بہتا ہوں نشے میں
واعظ کا ہے اندازِ بیاں مصلحت آمیز لیکن میں جو دل میں ہو وہ کہتا ہوں نشے میں
کچھ غم بھی غلط ہوتے ہیں مینا و سبو سے کچھ دکھ بھرے لمحات بھی سہتا ہوں نشے میں

سہتا ہوں میں انور بڑی ہشیار ہے دنیا

اور میں ہوں کہ ہر وقت ہی رہتا ہوں نشے میں

غزل

میں رازِ فنا و بقا پا گیا ہوں جہاں سے چلا تھا وہیں آ گیا ہوں
میں اب زندگی کو سمجھنے لگا ہوں میں اب موت کے راز کو پا گیا ہوں
نظر بھی حجابِ نظر بن گئی ہے میں اس درجہ تیرے قریب آ گیا ہوں
نہیں رغبتِ ماسوا مجھ کو لیکن تری آرزو سے بھی اکتا گیا ہوں
میر زندگی جس نے ترتیب دی تھی اسی جذبہٴ دل سے گھبرا گیا ہوں

قریبِ نظر کو سمجھتے ہوئے بھی

میں انور فریبِ نظر کھا گیا ہوں ۲۵۳



عزیز انبالوی

عزیز انبالوی کا نام عبدالعزیز اور ولدیت محمد صدیق تھی۔ آپ مارچ ۱۹۲۳ء ۳۵۴ میں موضع جگادھری ضلع انبالہ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ۴ جماعت تک تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی۔ پھر حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور محنت مزدوری کرنے لگے۔ قیام پاکستان کے تین ماہ بعد یعنی نومبر ۱۹۴۷ء میں ہجرت کی اور خوشاب ضلع سرگودھا میں رہائش پذیر ہوئے۔ لیکن چند دنوں بعد آپ کا خاندان سرگودھا شہر میں منتقل ہو گیا۔ یہاں خلیل چکوالی سے آپ کی ملاقات ہوئی جنہوں نے آپ کے ذوق کو دیکھتے ہوئے آپ کو شعر و سخن کی طرف راغب کیا۔ اور یہی ذوق آپ کو حافظ یوسف آزاد کے ہاں لے گیا۔ جن کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذتہ کیا اور باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ چونکہ دکانداری کرتے تھے۔ جس مصروفیت کے باعث آپ کی زندگی محدود رہی جسے گوشہ نشینی کا نام دیا گیا۔ اس کے باوجود کبھی کبھی کسی مشاعرے میں حاضری دے دیتے۔ بزمِ فکرِ اقبال سرگودھا کی جانب سے آپ کو ادبی ایوارڈ بھی دیا گیا۔ آپ انقلابِ نو، اوراق، شعلہ اور اردو زبان میں کبھی کوئی غزل بھیج دیتے جو شائع ہو جاتی تھی لیکن زیادہ تر گنماہی میں رہے۔

عزیز انبالوی سے ۲۰۰۳ء میں میری ملاقات ہوئی جس پر آپ نے اپنی بیاض بھی دکھائی اور نثر میں آپ نے کچھ یادیں بھی اکٹھی کر رکھی تھیں وہ بھی دکھائیں۔ بیاض شاعری اور یادداشتیں دو کتابوں کی صورت میں شائع کی جاسکتی ہیں۔ جو آپ کی زندگی میں تو نہیں ہو سکیں۔ اگر آپ کی اولاد یہ کام کر دے تو خاص طور پر نثری کام ایک عمدہ اضافہ ہوگا۔

جناب عزیز انبالوی جو ضلع انبالہ کی نسبت سے انبالوی لکھتے تھے وگرنہ ہجرت سے پہلے ساری زندگی جگادھری میں اور ہجرت کے بعد سرگودھا میں گزارے (خوشاب کے چند دن نکال کر)۔ آپ شریف النفس، تنہائی پسند اور کم گو شخص تھے۔ آخری عمر میں بینائی بہت کم ہو گئی تھی۔ اور لکھا ہوا نہیں پڑھ سکتے تھے۔ آپ نے ۸۱ سال کی عمر میں ۲۴ مئی ۲۰۰۴ء کو سوموار کے دن، سہ روزہ بیماری کے

بعد سول ہسپتال سرگودھا میں وفات پائی۔

بڑی پر پیچ راہوں سے ہیں اپنے رابطے اب بھی
 نظر کے سامنے ہیں کوہِ غم کے سلسلے اب بھی
 اگرچہ سوچ کے دریا کا طوفان تھم گیا لیکن
 نکلنے ہی نہیں دیتے بھنور کے دائرے اب بھی
 وہ آنکھوں کے مکاں میں رہ رہے ہیں ایک مدت سے
 سمٹنے میں نہیں آتے دلوں کے فاصلے اب بھی
 مرے قلب و جگر سے کھیلتے ہیں کھیلنے والے
 مرے خوں کے اڑاتے ہیں فضا میں بلبلے اب بھی
 عزیز اہل بصیرت نے مجھے دیکھا تو فرمایا
 لگے ہیں تیرے دل میں رنج و غم کے جگمگے اب بھی ۲۵۵



وابستہ سازِ دل سے ہے سارے جہاں کا رقص
 جب دل ہی ٹوٹ جائے تو کیسا کہاں کا رقص
 آتو ہی دیکھ لے مرے دردِ نہاں کا رقص
 قابل ہے دیکھنے کے ترے نیم جاں کا رقص
 شعلے بھٹک رہے ہیں گلستاں میں آج تک
 اک بار ہو گیا تھا جو برقی تپاں کا رقص
 پہلے تو آشیانہ جلا ڈالا برق نے
 اب دیکھتی ہے جلتے سجوئے آشیاں کا رقص
 اس دردِ دل نے خون کا پانی بنا دیا

پلکوں پہ دیکھئے مری اشکِ رواں کا رقص
یہ وقت جاں کنی ہے ذرا ٹھہر جائے
ہونے کو ختم ہے مری عمرِ رواں کا رقص
اک برق سی گرا گیا دل پر مرے عزیز
ہنس ہنس کے، مسکرا کے وہ جادو بیاں کا رقص ۳۵۶

مرزا محمد منور

ممتاز ماہر اقبالیات، ادیب، شاعر، ماہرِ تعلیم، دانشور، مزاح نگار، سابق استاد، چیئر مین شعبہ اقبالیات جامعہ پنجاب لاہور، ڈائریکٹر اقبال اکادمی لاہور اور بہت سی کتابوں کے مصنف پروفیسر مرزا محمد منور کی تاریخ پیدائش تاریخ بھیرہ، ۳۵۷ ہمارے اہل قلم، ۳۵۸ روزنامہ نوائے وقت، ۳۵۹ وفیات ناموران پاکستان، ۳۶۰ سخنوران سرگودھا، ۳۶۱ اور نعت گویان سرگودھا، ۳۶۲ میں ۲۷ مارچ ۱۹۲۷ء درج ہے۔ لیکن اخبارِ اردو، ۳۶۳ نے ان سے ہٹ کر ۲۷ مارچ ۱۹۲۳ء کا جو فیصلہ لکھا ہے میرے خیال میں یہ درست ہے۔ کیونکہ پروفیسر محمد منور نے جناب اخلاق عارف کو ایک خط میں جو تاریخ و مقام پیدائش لکھا ہے وہ ۲۷ مارچ ۱۹۲۳ء ۳۶۳ ہے۔ آپ کے والد مرزا ہاشم الدین ایک با علم اور با عمل شخصیت تھے۔ اس گھر کا ماحول ایسا تھا کہ گھر میں کتابوں کی، علم کی اور پڑھنے کی باتیں ہر وقت دہرائی جاتی رہتی تھیں۔ اور اس کا اثر تھا کہ ”چار پانچ سال کی عمر میں مرزا محمد منور نے یوسف زلیخا، کونج و چھوڑا، معراج نامہ وغیرہ سن سن کر یاد کر لئے تھے۔ ابھی تیسری جماعت کے طالب علم تھے کہ شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔“ ۳۶۵ چونکہ پنجابی شاعری آپ کے ذہن میں چپکے چپکے جگہ بنا چکی تھی لہذا آپ نے پنجابی میں ہی شعر کہنے کی ابتدا کی۔ جماعت نہم کے امتحان میں ایک مضمون ”تیری غفلت سے چمن وقفِ خزاں ہوتا ہے“ لکھنا تھا۔ آپ نے مقررہ وقت میں تمام سوالات کے جوابات بھی دیئے اور دو صفحے کا یہ مضمون نظم میں لکھا۔

مرزا محمد منور نے چھ سال کی عمر میں مولانا ظفر علی خان کی تقریر سنی تو تمام عمر ان کے کہے پر عمل کرتے گزار دی۔ علامہ اقبال کو پڑھا تو انہیں پڑھتے ہی رہے اور فرصت ملی تو لکھنا بھی شروع کر دیا۔ یوں آپ نے سکول کے زمانے سے مضامین وغیرہ لکھنے شروع کر دیئے تھے لیکن باقاعدہ اس میدان میں داخلہ ایم اے کی کلاسز کے دوران ہوا۔ آپ علامہ اقبال کے علاوہ قائد اعظم کے بھی بڑے مداح تھے اور گھنٹوں ان پر بلا تھکن بولا کرتے تھے۔ پاکستانیت آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ ایسی جامع العلوم شخصیت تھے کہ ان کے ہم عصر ان کی فکر یا سوچ اور علم تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہ شعر و ادب، تاریخ و تہذیب، فلسفہ، فکر، تصوف، سیاست، تفسیر، پاکستانیت، اقبالیات، وغیرہ پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔

بہر حال اقبال شناسی میں ان کی ادبی حیثیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر محمد صدیق شبلی کا یہ کہنا حرف بہ حرف صحیح ہے کہ:

”مرزا صاحب کی تمام علمی حیثیتیں اپنی اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن ان کی غالب حیثیت بطور اقبال شناس ہی ہے انہوں نے اپنی بیشتر توانائیاں فکر اقبال کو عام کرنے میں صرف کی ہیں۔ اس موضوع پر اردو، انگریزی اور تراجم کی شکل میں فارسی میں متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اقبال کا مطالعہ فکر اسلام کے وسیع تناظر میں ذہن مستقیم اور قلب مسلم کے ساتھ کیا ہے اور اسلام کو درپیش مسائل کا حل بھی فکر اقبال کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ وہ اقبال کو حالاتِ حاضرہ سے مربوط رکھتے ہیں اور اسی طرح اس کی تازگی کو برقرار رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب اقبال کے ساتھ حد درجہ عقیدت رکھتے تھے۔ میں ۲۸ سال ان کی خدمت میں رہا لیکن ایک بار بھی انہیں اقبال کہتے نہیں سنا وہ عام طور پر حضرت علامہ اقبال کہتے یا حضرت علامہ“ ۲۶۶

پروفیسر محمد منور نے ۱۹۵۲ء میں ایم اے اردو، ۱۹۵۳ء میں ایم اے عربی اور ۱۹۶۷ء میں

ایم اے فلسفہ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں جبکہ آپ کو اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور پنجابی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اور ان زبانوں میں لکھا کرتے تھے۔ آپ کی جو تصانیف منظر عام پر آئیں ان میں سے چند ایک کے نام ہیں۔

- (۱)۔ برہانِ اقبال (۲)۔ میزانِ اقبال (۳)۔ ایقانِ اقبال (۴)۔ دیوارِ برہمن
- (۵)۔ حصارِ اسلام (۶)۔ علامہ اقبال کی فارسی غزل (۷)۔ مشاہدہ حق کی گفتگو
- (۸)۔ قرطاسِ اقبال (۹)۔ ہندو ذہنیت (۱۰)۔ الاخبار الطوال (ترجمہ)
- (۱۱)۔ الفتنہ الکبریٰ (ترجمہ) (۱۲)۔ اولادِ آدم (مزاحیہ مضامین) (۱۳)۔ انتخابِ غزلِ آتش
- (۱۴)۔ سیاست نامہ نظام الملک طوسی (ترجمہ) (۱۵)۔ تین مسلمان فیلسوف (ترجمہ)
- (۱۶)۔ غبارِ تمنا (شعری مجموعہ) (۱۷)۔ تحریک پاکستان: تاریخی خدو خال
- (۱۸)۔ پاکستان: حصارِ اسلام (۱۹)۔ انتخابِ کلیاتِ آتش معہ مقدمہ
- (۱۹)۔ انتخابِ کلیاتِ آتش معہ مقدمہ (۲۰)۔ ادیب (ترجمہ)

Dimension of Iqbal (۲۱)

Iqbal Poet Philosopher of Islam (۲۲)

Dimension of Pakistan Movement (۲۳)

Iqbal and Quranic Wisdom (۲۴)

Iqbal on Human Perfection. (۲۵)

کتابچے

- | | |
|--------------------------------------|--|
| ۱۔ دیوارِ برہمن اور دیوارِ برہمن | ۲۔ بابر کی مسجد |
| ۳۔ وفاع پاکستان اور ہندو مسلم مفاہمت | ۴۔ تحریک پاکستان اور خالصہ سیاست |
| ۵۔ بندے ماترم کا شاخسانہ | ۶۔ ہندو معاشرے میں اچھوتوں کا حالی زار |
| ۷۔ ہندو ذہن | ۸۔ نظریہ پاکستان کا ارتقاء |

وہ کتب جو مسودوں کی صورت موجود تھیں

۱۔ تجزیے اور جائزے (تنقیدی ادبی مضامین) ۲۔ کرم فرما (احباب کی شخصیات)

۳۔ حفیظ جالندھری (فن اور شخصیت) ۴۔ حمید نظامی

۵۔ انتخاب کلام بیدل ۶۔ تاریخ اسلام اور اخلاقیات کے موضوع پر مقالات

۷۔ تحریک پاکستان اور معاشرتی احوال پر مبنی مضامین

۸۔ تحریک پاکستان اور دیگر موضوعات (انگریزی میں مضامین)

۹۔ غالب کی فارسی غزل

منور مرزا کو ان کی علمی و ادبی خدمات پر کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ ستارہ امتیاز اور قومی اقبال ایوارڈ بھی آپ کے حصے میں آئے۔

آپ کی وفات کے بارے میں بھی دو تاریخیں سامنے آئیں۔ ماہنامہ اخبار اردو نے ۲ فروری ۲۰۰۰ء ۳۶۷ وفات کی تاریخ لکھی ہے جبکہ ماہنامہ سیارہ نے ۷ فروری ۳۶۸ رقم کی ہے اور سات فروری اس لئے درست تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیم نے یہی تاریخ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی کی ۸ فروری ۲۰۰۰ء کے اخبار سے نقل کی ہے۔ جو صاف ظاہر ہے کہ وفات کے دوسرے دن ہی اخبار میں شائع ہوئی تھی۔

مرزا محمد منور کی شاعری کا اگرچہ صرف ایک مجموعہ شائع ہوا ہے لیکن ان کا کلام رسائل و جرائد میں اتنا بکھرا پڑا ہے کہ اسے یکجا کر کے منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

کس کس کے لئے جانے کس کس نے دعا کی
جب ضرب لگاتی ہے دکھائی نہیں دیتی
ہو جب بھی پکڑ ہے میرے مولا کی بڑی سخت
ذروں میں بکھر جاتی ہے بندوں کی خدائی

آ جاتی ہے آخر گھڑی پاداش و سزا کی
آواز بھی ہوتی نہیں لٹھی میں خدا کی
تنبیہ قدیمی ہے یہ قرطاس ہدیٰ کی
نمرود بھی خاک کی ہے تو فرعون بھی خاک کی !

جب تک نہ مدد خاکِ لحد کی ہو میسر
 اک ذرہ زر کے لئے چاہے جو زمیں کو
 اک بازی عجب اہل خیانت نے جمائی
 اس طرح کی نکبت سے خداوند بچائے
 ہر دیدہ ارباب یقین دیکھ رہا ہے
 لاتی ہے ابھی مژدہ کوئی موج ہوا کی

ایماں کے سوا منزلِ ایماں کا خضر کون

بیشک کسی انساں میں ذہانت ہو بلا کی ۲۰۰

قطعات

زیت کا ذوق رکھنے والوں کو
 عاقلوں کو بنا کے دیوانہ
 حسرت آشامیوں نے مار دیا
 عقل کے حامیوں نے مار دیا
 ہاں یہی میری کائنات سہی
 میہ بھی مجبوریء حیات سہی
 مسکراؤں تو دل سے کہتا ہوں

○

بے صدا دل نظر اداس اداس
 ولولہ ماند راہ بے پایاں
 اک سکوں ہے مگر اداس اداس
 زندگی کا سفر اداس اداس

○

آرزو سے ہے گرمیء خاطر آرزو ہے چراغِ سینے کا

آرزو خام ہی سہی اے دوست

آرزو آسرا ہے جینے کا ۲۰۰

☆

سید محمد حسین نیلوی

سید محمد حسین ولد سید گل محمد ۱۳۳۱ھ/۱۹۲۳ء کو بمقام نیلہ ضلع جہلم (حال ضلع چکوال) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے دینی تعلیم اپنے چچا مولانا سید محمد شاہ جہلمی کے علاوہ مولانا ولی محمد انہی شریف اور مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی سے حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ امینیہ دہلی میں سات سال پڑھایا۔ اس دوران مطالعہ کے علاوہ فتویٰ نویسی، تجوید و قرأت اور کتابت کا فن بھی سیکھا۔ آپ کی شادی بھی وہیں ہوئی۔ آپ کی پہلی کتاب ”انوار المطالع“ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اسی طرح صرف، نحو، منطق، میراث، معانی، اور عقائد کے شجرہ جات بھی دہلی میں شائع ہوئے۔ آپ اپنی کتابوں کی کتابت بھی خود کیا کرتے۔ اتفاقاً ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو جب تراویح میں قرآن مجید ختم کر چکے تھے اسی روز پاکستان معرض وجود میں آیا۔ آپ پندرہ دن کی چھٹی پر بھگوال (ضلع جہلم) عید ملنے آئے اور واپس نہ جاسکے۔ آپ کے سر حافظ محمد حسین قریشی کا دہلی سے میانوالی تبادلہ ہو چکا تھا۔ جن کی کوشش سے گورنمنٹ ہائی سکول موچھ میانوالی میں عربی ٹیچر ہو گئے۔ سات سال کے بعد اپنے استاد اور چچا مولانا سید محمد شاہ جہلمی کے حکم پر سکول چھوڑ کر کچھ عرصہ اشرف المدارس لاکپور، اور مدرسہ سراج العلوم سرگودھا میں تدریسی خدمات انجام دیں اور پھر مدرسہ دار الہدیٰ چوکیہ (ضلع سرگودھا) چلے گئے۔ جہاں گیارہ سال تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۶۵ء میں دوبارہ سرگودھا شہر میں آ گئے۔ اب آپ بمعہ اہل و عیال سرگودھا میں منتقل ہوئے۔ اور جامعہ ضیاء العلوم میں عرصہ ۳۸ سال تک شیخ التفسیر والحدیث اور مفتی کے مناصب پر فائز رہے۔

مولانا سید محمد حسین نیلوی نے سو سے زائد کتب تحریر کیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

انوار المطالع، فیض المغیث فی اصول الحدیث، فتح الرحمان فی قیام رمضان، شفاء الصدور (عربی)، رق منشور فی احکام الموتی والقبور، ندائے حق (تین جلد)، تبیین القرآن (قرآن مجید کا

مربوط و تشریحی ترجمہ۔ کل چار حصے)، مرآة القرآن (مضامین قرآن کی فہرست)، خلاصۃ البیان من کلام الرحمن، مواہب رحمانی در مسائل قربانی، تفسیر بدر منیر بر حاشیہ تفسیر بے نظیر، الفجر المستطیر، الادلۃ المنصوہ فی صفات اللہ المخصوصہ، الکلمات الصادقہ فی حکم الزنادقہ، الصراط المستقیم، اعدل الکلام فی حکم الفاتحہ خلف الامام، خیر الکلام فی تقبیل الالبہام، رد منکرات حیات الاموات، القول المرعی فی القبر الشرعی، القول الاتم فی حیات عیسیٰ ابن مریم، قدرت الرب فی ولادت عیسیٰ من غیر اب۔۔۔ عید میلاد النبیؐ کی شرعی حیثیت، معراج النبیؐ قرآن و حدیث کی روشنی میں، المعارف فی تحریم المزامیر و المعارف، الرائی الصائب فی الصلوٰۃ علی الغائب، عقد العقیان فی عنق جواہر القرآن، التبعیر لمن اجاز التصویر، عورتوں کا سر کے بال کٹوانا، کلمہ طیبہ اور نماز کا تشریحی ترجمہ، رسالہ درود و سلام، رفع الاشتباہ عن آیتہ، ماہل بہ لغیر اللہ، غسلِ رجلین، حق الاظہار فی تحقیق معنی اشغار، اظہار الزین فی المصافحہ بالیدین، عورت کی سربراہی، الکیسہ فی تحقیقات النفسیہ، شفاء العی فی بیان خبر من صل علی، رسالہ بشریت نبوی، فی المستغاث فی حکم الطلقات الثلاث، الفائض فی الدعاء بعد الفرائض، الطیب الکلام فی نکاح یوسف۔ وغیرہ۔

آپ کی غیر مطبوعہ کتب کی تعداد بھی درجنوں کے حساب سے ہے جن میں سے چند ایک

کے نام ملاحظہ ہوں :

نظم اللغات فی مسلک الابیات (عربی اردو منظوم لغت)، ظریف اللغات، وفيات المشاہیر، الاظہار الناظرہ فی فروق المتناثرہ۔۔۔ القائد فی العقائد (عربی) تفسیر تسہیل التنزیل۔۔۔ فتح المغیث شرح تحریرات حدیث، تحقیق معانی القرآن، دفع اوہام الباطلہ، رد مذاہب باطلہ، مناسک حج،

فتاویٰ حسینیہ۔ ۲۷۲

”رد مذاہب باطلہ کے موضوع پر آپ کی ایک تقریر اور بعض غیر

مرتب یادداشتیں ”مظلوم شہید کر بلا۔ امامانی الدین سیدنا امام حسین رضی اللہ

عنه“ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ جس میں کمپوزر کے

سہو و تساہل کو ان کے سردے دیا گیا۔ اور انہیں حضرت امام حسینؑ کی شان میں بے ادبی کا مرتکب قرار دے کر کتاب ضبط کر لی گئی اور آپ کو مع مرتبہ و ناشر جو کہ آپ کے بیٹے (مولانا حافظ سید احمد حسن واسطی) ہیں کے ساڑھے چار سال قید کی سزا ہوئی۔ انہیں سرگودھا جیل اور بعد ازاں اڈیالہ جیل (راولپنڈی) میں قید رکھا گیا۔ جہاں ۲۰ محرم ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۸ فروری ۲۰۰۶ء کو دروان قید ہی بیماری کی حالت میں سول ہسپتال راولپنڈی میں زیر علاج ہونے کی صورت میں وفات پائی۔ آپ کی نماز جنازہ دارالعلوم تعلیم القرآن راجا بازار راولپنڈی میں پڑھی گئی۔ جس میں ملک بھر سے آپ کے ہزاروں معتقدین اور شاگردوں کے علاوہ کثیر تعداد میں علماء و مشائخ نے شرکت کی اور وہیں عید گاہ قبرستان میں مدفون ہوئے۔“ - ۳۷۳

آپ کے بیٹے سید محمد حسن واسطی نے تاریخ وفات لکھی۔

نیلوی شہ خادم الوحیین مفتی باعمل
چل دیئے دارالبقا کو چھوڑ کر دارالعمل
فروری کی تھی اٹھارہ (۱۸) عیسوی سن تھا وہ چھ (۲۰۰۶ء)
اور محرم کی تھی بیس ہجری ستائیس (۱۳۲۷ھ) سن بنے
درمیانی رات تھی وہ ہفتہ و اتوار کی
توڑ کر زنجیر ظالم روح نے پرواز کی
جیل سے اٹھا جنازہ شاہ جی کا جس گھڑی
دائیں بائیں ساری خلقت ایک دم سے روپڑی
تھا جنازہ آپ کا مسجد غلام اللہ میں

دین کی خاطر ہی دی ہے جاں خدا کی راہ میں ۳۷۴
 مولانا سید محمد حسین نیلوی نے عربی، اردو، فارسی میں بہت کچھ لکھا۔ جن میں منظوم کتب
 بھی شامل ہیں ان میں سے ایک طویل نظم شان صحابہ کرام سے چند اشعار اور بعد ازاں ”سبحان اللہ
 تعالیٰ کے تشریحی معنی حاضر ہیں۔

شان صحابہ کرام (سے اقتباس)

نبیؐ سورج صحابہ سب ستارے
 اٹھائیں دین کی خاطر تکالیف
 چلے پیدل تو کی دیں کی اشاعت
 سمندر اور دریا اور جنگل
 منادی دین کی، کی کونے کونے
 نہ تھا ان میں ریا، بخل و تکبر
 صحابہ سب ہدایت یافتہ تھے
 حقیقی منبع تھے وہ مصطفیٰ کے
 امین و صادق و معیار حق تھے
 شہید و صالح و صدیق ان میں
 خدا نے ان کے ایمان و وفا کی
 رسول اللہ کے ایسے ہیں اصحاب
 قرآن میں ”مومنین حقا“ کہا ہے
 کہا ”خیر الامم“ اور ”مستقیم“ بھی
 خدا نے ”فائزین“ ان کو کہا ہے
 کہا ”مستغفرین“ و ”قانتین“ بھی
 وہ ہادی رہنما رہبر ہمارے
 نہ تھی مقصود ان کو اپنی تعریف
 پہاڑوں کی اٹھائی سب نے کلفت
 سفر دشوار کرتے تھے وہ چل چل
 چلے آئے وہ مسلم تھے جو ہونے
 نہ تھا کینہ عداوت اور تہور
 وہ اقلیم ہدیٰ کے بادشہ تھے
 جو دیکھا وہ بنا، معمول لیتے !
 وہ راشد، مومن و مختار حق تھے
 نہ تھا مرتد نہ تھا زندیق ان میں
 شہادت دی قسم مجھ کو خدا کی
 جنہیں رب نے دیئے ہیں اونچے القاب
 لقب ”خیر البریہ“ کا دیا ہے
 ”مصلین“ ”صابرین“ و ”صادقین“ بھی
 خدا نے ”راشدین“ ان کو کہا ہے
 ”مزکیں“ ”خاشعین“ و ”صائمین“ بھی

قسم، رب نے ہے قرآن میں اٹھائی صحابہ کی خطا ہر ہر مثالی
ہیں ”حق کل یار“ حزب اللہ سارے خدائے پاک کے ہیں سب پیارے ۳۷۵

سبحان اللہ تعالیٰ کے تشریحی معنی

اونگھ، غفلت، نیند، جہل و سہو، نسیان و خطا
ظلم و کذب و عہد شکنی، انکساری و بداء
بخل و حسرت، فقر و مکر و مسخری، ٹھٹھا، حیا
نیز بیماری، پریشانی سے ذاتِ کبریا
والدین، اولاد، جورو، اور وزیروں سے ہے پاک
رشتہ، ناتا، احتیاجی، اور ظہیروں سے ہے پاک
ہے شریکوں سے، معینوں سے، نظیروں سے بھی پاک
منشیوں سے اور وکیلوں سے، مشیروں سے بھی پاک
خورد و نوش و حرص و لالچ، جلد بازی سے بھی پاک
عجز و موت و خوف و سستی، عشق بازی سے بھی پاک
دکھیا ہونے، دھوکا کھانے اور ندامت سے بھی پاک
گم رہی، مغلوبی، غالب کی شفاعت سے بھی پاک
وہ نہیں ہے عرض و جوہر، جسم اور محدود بھی
پاک ہے ہر عیب سے سبحانہ رب النبیؐ ۳۷۶

صاحبزادہ رفعت سلطان

خانوادہ حضرت سلطان باہو کے چشم و چراغ صاحبزادہ رفعت سلطان یکم مارچ ۱۹۲۳ء کو
دربار حضرت سلطان باہو مصلح جھنگ کے مقام پر صاحبزادہ سلطان احمد بخش کے ہاں پیدا ہوئے۔ بی

اے تک تعلیم حاصل کی اور ۱۹۵۲ء میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۲۸ سال تک اس خدمت پر مامور ہے اور پھر ۱۹۸۰ء میں ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر تھے جب کہ ریٹائرمنٹ لے لی اور جھنگ میں رہائش اختیار کی۔ ملازمت کے دوران تین سال تک فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں سرگودھا میں مقیم رہے۔ آپ کے بھائی عاقل شاہ تحصیل شاہ پور میں رہائش پذیر تھے۔ وہ یہیں فوت ہوئے صاحبزادہ رفعت سلطان کی اکلوتی بیٹی کی شادی عاقل شاہ میں ہی ہوئی تھی۔ لہذا آپ نے ۲۸ دسمبر ۲۰۰۷ء بروز جمعہ کو جب وفات پائی تو آپ کے دوہتے صاحبزادہ من سلطان آپ کی میت جھنگ سے عاقل شاہ لائے اور اسی دن عشا کے وقت تدفین ہوئی۔

صاحبزادہ سلطان احمد المعروف رفعت سلطان نے ۱۹۴۰ء میں شعر کہنا شروع کیا اور سڑسٹھ سال تک اس ذوقِ شعرو سخن میں مصروف رہے۔ اس دوران آپ کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے۔ جن میں ایمین، آواز، اظہار، انداز، آفاق، الفاظ، ارمان، انتخاب اور التماس شامل ہیں۔ آپ کے تمام شعری مجموعوں کے نام الف کے حرف سے شروع ہوتے ہیں اور الف کا مفہوم کسی نے پوچھنا ہو تو منصور حلاج سے پوچھے۔ جس نے الف پڑھنے کے بعد ب پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن یہاں یہ تمام نام اپنے جد امجد حضرت سلطان باہو کے مصراع: ”الف اللہ چلبے دی بوئی میرے من وچ مرشد لائی ہو“ کی نسبت سے ہیں۔

خیرالدین انصاری نے پوری ذمہ داری سے جناب رفعت سلطان کی غزل کو اردو ادب میں نہایت دلکش اور دلپذیر اضافہ لکھا ہے۔ اُن کا کہنا ہے:

”جہاں رفعت سلطان کی غزل کے بارے میں اتنی خوبصورت

اور حوصلہ افزا آراء ملتی ہیں وہاں نجی محفلوں میں اُن کے خلاف باتیں بھی سنی جاتی ہیں۔ کسی کو اس کے شخصی رویوں پر اعتراض ہے اور کسی کے نزدیک اس کے شعر میں فکری گہرائی نہیں ہوتی۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے میں اس کا جواب دینے کا حق نہیں رکھتا لیکن جہاں تک اس کے شعر میں فکری عنصر

کی موجودگی کا تعلق ہے اس کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ وہ میر کے اسلوبِ سخن کو پسند کرتا ہے۔ جس طرح میر کے ہاں فکری عنصر موجود ہے اسی طرح رفعت سلطان کے ہاں فکری گہرائی موجود ہے۔ نیز عصری حسیت بھی اُس کے ہاں ملتی ہے۔ رفعت سلطان بڑے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے شعر نہیں کہتا اُس کی نگاہ میں ہمیشہ وہ لوگ رہتے ہیں جن سے زندگی اچھا سلوک نہیں کرتی۔“ ۳۷۷

کیا خبر اُن کو جو بیٹھے ہیں گھنی چھاؤں میں
سبز کھیتوں کی جگہ دھول ہے تاحدِ نظر
واپس آیا تو بہت دور سے دیکھا میں نے
اٹھ کہ اب وعدہ فردا پہ یقین باطل ہے
اب تو ہر صاحب زر یوسفِ کنعاں کہلائے
یہ مرا حسنِ سماعت ہی تو ہے رہِ حرم

گرنے والا ہی نہ ہو خاک پر ہر کاخِ بلند

ذکر آیا ہے غلاموں کا جو آقاؤں میں ۳۷۸



سو پشت سے فقیر ہوں یہ جانتے ہیں لوگ
مرعوب کر سکا نہ مجھے کوئی آج تک
دولت مری نگاہوں میں کمتر ہے خاک سے
جھک کر سلام کرتا ہے سورج مجھے تو کیا
میں نے کبھی کسی کا سہارا نہیں لیا
میں نے محبتوں کے خزانے لٹا دیے
میں آج بھی امیر ہوں یہ جانتے ہیں لوگ
میں صاحبِ ضمیر ہوں یہ جانتے ہیں لوگ
اخلاص کا اسیر ہوں یہ جانتے ہیں لوگ
میں ذرہٴ حقیر ہوں یہ جانتے ہیں لوگ
آپ اپنا دستگیر ہوں یہ جانتے ہیں لوگ
میں کس قدر امیر ہوں یہ جانتے ہیں لوگ

میں کہہ رہا ہوں عہد مسرت قریب ہے میں وقت کا بشیر ہوں یہ جانتے ہیں لوگ
 رفعت ہے قتلِ نوعِ بشر منصبِ یہود
 میں امن کا سفیر ہوں یہ جانتے ہیں لوگ ۳۷۹

سید مہدی مدنی

اردو زبان میں ماہیا کا باقاعدہ کتابچہ (کتاب) جو شائع ہوا وہ مسعود ہاشمی (راولپنڈی) کا
 ”ساقیا“ ۳۸۰ ہے اس کتابچے میں ۱۹۷۷ء میں شامل ہیں۔ دوسری کتاب یا کتابچہ بعنوان ”اردو ماہیا“ ۳۸۱
 سید مہدی مدنی کا ہے لیکن ماہیا کے محققین کو آج تک اسے تلاش کرنے کی نہ ہمت ہوئی نہ توفیق۔

”ساقیا“ پر بہت سے مضامین لکھے گئے شاید وجہ یہ ہو کہ مسعود ہاشمی نے اسے مصرعی
 بیئت میں دوبارہ پیش کیا اور بحجل کا پی جو ڈیڑھ مصرعی ہیئت میں تھی اُسے چھپا دیا۔ جبکہ مہدی مدنی
 کے ”اردو ماہیا“ کی ہیئت ڈیڑھ مصرعی برقرار ہے۔ اس میں اگرچہ پورا سو ماہیا ہے لیکن چونکہ ماہیا
 کے اجارہ دار سے مصرعی ہیئت کے فروغ میں مصروف ہیں اس لئے ادھر توجہ دینا گوارا نہ کیا۔ دوسری وجہ
 یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس ”اردو ماہیا“ کی کاپی ہے بھی سہی تو وہ سانپ بنے بیٹھے ہیں۔ بہر حال یہ
 تو چلتے چلتے بات نکل آئی۔ کیونکہ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اصل۔۔۔ بتانا تو یہ ہے کہ

”مہدی مدنی کا اصل نام سید غلام حسین ہے۔ آپ سید فرزند علی

کے ہاں ۱۹ ستمبر ۱۹۲۵ء کو چک نمبر ۱۰۔ ایم ایل (مین لائن) تحصیل بھلووال میں

پیدا ہوئے۔ جماعت ششم تک اپنے گاؤں سے تعلیم حاصل کی۔ اور پھر

بھلووال میں داخلہ لیا۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں والد کی وفات پر ساتویں جماعت

سے ہی سکول چھوڑنا پڑا اور زمینداری شروع کر دی۔“ ۳۸۲

سید مہدی مدنی اگرچہ زمینداری کر رہے تھے۔ لیکن اُن کا مطالعہ کا شوق ماند نہیں پڑا تھا۔

انہوں نے اپنی ذاتی لائبریری بنا رکھی تھی۔ پھر پڑھے لکھے لوگوں سے تعلقات تھے۔ جن سے بہت

کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے۔ تاریخ سے بھی آپ کو واقفیت تھی۔ مطالعہ کے علاوہ گاؤں میں جو کھیل ہوتے ہیں ان میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ جن میں والی بال، کبڈی، گھڑ سواری ان کے مشاغل تھے۔ حاجی شاہ سلطان (بچکے والی) کی ایک نیزہ بازی کی ٹیم تھی۔ جو ایک کلب کی صورت میں تھی۔ اس کلب کا نام شاہین حیدر یہ کلب تھا اور مہدی مدنی اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ آپ کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے اختر حسین جو درویشانہ اور فقیری لائین اختیار کر چکے ہیں اور لاہور میں مقیم ہیں۔ چھوٹے بیٹے ظفر گل ہیں۔ جسے سید مہدی مدنی نے سرگودھا شہر میں الیکٹرونک اشیاء کی ایک دوکان بنا دی تھی اسے وہ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۶ء تک چلاتے رہے۔ مہدی مدنی نے بھی اس دوران زمین بیچ دی اور سرگودھا منتقل ہو گئے تھے جہاں آپ نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعری حوالے سے نام کمایا۔ انہیں دنوں میں ابیاتِ مدنی (پنجابی)۔ بارہ ماہ مہدی (پنجابی) اور اردو ماہیا (اردو) آپ کے مجموعے شائع ہوئے۔

”۲ جنوری ۱۹۸۵ء کو آپ اپنے ایک دوست حکیم ہمدانی کے ہاں

ملکوال میں مقیم تھے کہ وہیں ۳ جنوری کو یعنی دوسرے دن آپ کی موت واقع

ہوئی۔ آپ کے خالہ زاد بھائی محمد یوسف بھی ملکوال میں مقیم تھے۔ آپ کی

میت کو وہ اپنے گاؤں ۱۱۰ ایم ایل میں لائے اور ۴ جنوری کو دفن کیا گیا۔“ ۳۸۳

سید مہدی مدنی کے بارے مشہور ہے کہ بہت حاضر جواب تھے۔ پھبتی کہنے میں مہارت

رکھتے تھے۔ پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں اپنے احساسات اور جذبات کے بڑے سادہ انداز میں

اظہار کا بھی انہیں ملکہ تھا۔ شوکت راز ان کے گہرے دوست تھے جب ان سے بات ہوئی تو کہنے لگے:

”سید مہدی مدنی محفل کا آدمی تھا۔ دوستوں کا دوست تھا۔ جس

محفل میں ہوتا وہ زعفران زار بن جاتی۔ گفتگو میں بھی برجستگی تھی۔ بذلہ سنخ

شخصیت تھے۔ لطیفے انہیں بہت زیادہ یاد تھے۔ مشاعرہ میں ترنم سے پڑھتے۔

چونکہ عوامی شاعر تھے اس لئے انہیں محبت اور پیار سے سنا جاتا تھا۔ وہ حسین

و جمیل الفاظ میں بات کرتے اُن کے لہجہ میں نشتر کی چھن اور تلوار کی کاٹ تھی۔

باغباں مل کر بہم سرگوشیاں کرتے رہے اور گلچیں باغ میں من مانیاں کرتے رہے
 ہے مثال ایسی کوئی تاریخِ انسانی کے پاس جو کرم ہم پر ہمارے مہرباں کرتے رہے“ ۳۸۳
 مہدی مدنی کے عوامی پن کی ایک مثال اُن کی اردو میں ماہیانگاری ہے جسے انہوں نے
 لوک صنف کے طور پر متعارف کرایا۔

جب باد صبا آئی
 جب زلف کو سرکایا
 ہم اشک جو پی لیتے
 گر آپ چلے آتے
 جب یاد وہ آتے ہیں
 چہرے پہ نکھار آیا
 بسری ہوئی کچھ یادیں وہ ساتھ اٹھالائی
 تب کالی گھٹاؤں سے اک چاند نکل آیا
 رسوائی سے فحج جاتے آرام سے جی لیتے
 بگڑے ہوئے بھی میرے حالات سنور جاتے
 ارمان مچلتے ہیں ہم اشک بہاتے ہیں
 دل والوں کی دنیا میں اپنا بھی شمار آیا ۳۸۵

غزل

حقیقت اپنی جب تک اس سے پہچانی نہیں جاتی
 تمہاری بزم میں اک شب تمہیں دزدیدہ دیکھا تھا
 اے تضحیک سمجھوں طنز سمجھوں یا کرم سمجھوں
 گلستاں ہو کہ ویرانہ قفس ہو دام ہو یارو
 غزالوں اور دیوانوں نے رونق بخش دی ان کو
 یقیناً تب تلک انساں کی ارزانی نہیں جاتی
 نظر کا جرم ہے دل کی پشیمانی نہیں جاتی
 تمہاری مسکراہٹ مجھ سے پہچانی نہیں جاتی
 مگر رنگیں نواؤں کی خوش الحانی نہیں جاتی
 سنا کرتے تھے صحراؤں کی ویرانی نہیں جاتی
 غم و آلام میں محصور ہے مدنی مگر پھر بھی
 جب آجاتا ہے محفل میں دُرافشانی نہیں جاتی ۳۸۶



انور حیدری

ادبی دنیا کے انور حیدری طب کے میدان میں اپنے اصل نام سید منور حسین سے پہچانے جاتے تھے۔ آپ ۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو دوسا ہا ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر سے حاصل کی کچھ عرصہ لکھنؤ میں زیر تعلیم رہے اور پھر لاہور سے طب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نوجوانی میں ہی پریکٹس شروع کر دی۔ آخر کار سرگودھا میں اقامت اختیار کی اور بلاک نمبر ۲۳ میں ”سادات بیت الشفاء“ کے نام سے اپنا مطب بنایا۔

اوائل عمری میں ہی آپ نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ عاشقِ اہل بیت ہونے کی وجہ سے اُن کے کلام میں سلام اور مرثیہ بہ نسبت دیگر اصنافِ فکر سے زائد ہے۔ لیکن آپ نے حمد، نعت اور غزل بھی کہی۔ آپ کے سلام پڑھنے کا انداز بھی بقول ہارون الرشید تبسم اپنے ہم عصر شعراء سے منفرد تھا۔ محافلِ نعت اور محافلِ مسالمہ میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ پروفیسر ہارون الرشید تبسم کا کہنا ہے کہ

”انور حیدری کے کئی مریض اُن کے روحانی کلام سے ہی صحت

یاب ہو جایا کرتے تھے۔ جن احباب نے انہیں نہیں دیکھا وہ چشمِ تصور سے

اُن کی شخصیت کا احاطہ یوں کر سکتے ہیں کہ وہ شاعرِ اہل بیت اور محبت کا برگد

تھے۔ مسکرانا، سنجیدہ ہونا، پُر نَم ہونا، حیران ہونا اور دوسروں کے لئے بے چین

ہونا کوئی اُن سے سیکھے۔“ ۳۸۷

انور حیدری بڑی شستہ زبان استعمال کرتے تھے۔ روایات کے پابند تھے اور کلام میں پختگی

تھی۔ سرگودھا کی ادبی محافل میں شرکت کرتے تھے۔ فی البدیہہ بھی کہتے تھے۔ اُن کی غزل میں بھی

رٹائی رنگ پایا جاتا تھا۔ آپ نے ۱۹۸۵ء میں وفات پائی اور دوستوں کا ایک بہت بڑا حلقہ پیچھے چھوڑ

گئے جن میں سے اکثریت ایک ایک کر کے وہیں چلی گئی ہے جہاں وہ گئے۔

میں خود جلوں گا نہ کوشش کرو جلانے کی رکھی ہے برق پر بنیاد آشیانے کی

تمہارے نام کی تاثیر کا ہے یہ اعجاز بڑھی ہے اور بھی شہرت میرے فسانے کی
 کسی کے جو رو تغافل کا کیا گلہ کیجیے فلک نے ٹھان ہی لی ہے ہمیں ستانے کی
 فضول آپ نے اس کو مسل کے پھینک دیا کلی سے خونہ گئی پھر بھی مسکرانے کی
 طفیلِ نسبتِ حضرات پنج تن انور
 مٹا سکیں نہ مجھے گردشیں زمانے کی ۳۸۸



تری طلب کے سوا کوئی آرزو نہ رہی سوائے تیرے ہمیں کوئی جستجو نہ رہی
 ریاضِ دہر میں اک مردِ حق کی آمد سے شکوہ محفلِ باطل کی آبرو نہ رہی
 جمالِ یار میں جب سے ہوئے ہیں غوطہ زن نظر میں رونقِ ایوانِ رنگ و بو نہ رہی
 ہمیں تھے باعثِ توقیر محفلِ رنداں ہمارے بعد خمستاں میں ہاؤ نہ رہی
 ہمارے دم سے ہی تھا حسن تیری محفل میں ہمارے بعد تیری بزمِ خوبرو نہ رہی
 بجا ہے خون تیرا پاک و صاف ہے واعظ تیرے لہو میں مگر سرخیء لہو نہ رہی
 مکانِ دل میں اُسے دیکھ کر مکیں انور
 نظر میں منظرِ تفریقِ ماؤ تو نہ رہی ۳۸۹

راجن ادیب

خواجہ محمد بشیر نام اور راجن تخلص ہے جبکہ راجن ادیب قلمی نام ہے۔ لیکن بشیر راجن ادیب
 بھی کبھی کبھی لکھا کرتے تھے۔ آپ کی قبر پر جو کتبہ لگا ہے۔ اُس پر بسم اللہ شریف اور کلمہ پاک کے بعد
 درج ذیل تحریر ہے :

”معروف شاعر و ادیب

خواجہ محمد بشیر راجن

ایڈووکیٹ سرگودھا

پیدائش ۸ جون ۱۹۲۶ء بروز منگل

۲۶ ذی قعدہ ۱۳۴۴ھ

وفات ۱۲ دسمبر ۱۹۹۴ء بروز پیر

۸ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ ۸ بجکر ۱۵ منٹ صبح ۳۹۰

اس سے نیچے دو شعر درج ہیں جو اس کے اپنے نہیں ایک علامہ اقبال کا ہے اور دوسرا عام سا

شعر ہے۔

کتبہ تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ زاہد حسین انجم نے جو تاریخ پیدائش لکھی ہے وہ ۱۱۸ اکتوبر

ہے ۳۹۱۔ جبکہ پروفیسر ہارون الرشید تبسم نے صرف سن ۱۹۲۶ء پر گزارا کیا ہے۔ ۳۹۲

آپ نے بھیرہ میں جنم لیا۔ آپ کے والد کا نام خواجہ محمد سعید تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد

فوج میں بھرتی ہو گئے اور ۱۹۴۶ء میں ریٹائرمنٹ لے لی۔ بعد ازاں محکمہ آبپاشی میں ملازمت اختیار

کر لی اس دوران اردو فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۰ء میں بی اے اور ۱۹۷۲ء میں پنجاب یونیورسٹی

سے نجی حیثیت میں ایم اے اردو کیا۔ ۱۹۸۲ء میں ایل ایل بی کرنے کے بعد وکالت شروع کر دی اور

آخری سانسوں تک اس شعبے سے منسلک رہے۔

بشیر را جن ادیب شاعری اور افسانہ نگاری دونوں سے شغف رکھتے تھے۔ زاہد حسین انجم

نے آپ کی تین تصانیف کے نام گنوائے ہیں جو

”۱۔ اردو نامہ ۲۔ عورت کے آنسو ۳۔ نشاطِ غم“ ۳۹۳ ہیں

لیکن ان میں سے شاید On ground کوئی تصنیف بھی نہیں۔ بلکہ پروفیسر ہارون الرشید تبسم کے

مطابق آخری افسانہ ”عورت کے آنسو“ تھا۔ ۳۹۴

آپ انجمن ترقی اردو کے رکن تھے۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اور اساتذہ کے بے شمار اشعار

یاد تھے اور اسی زور پر شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ آپ کو ”نشانِ سپاس“ سے بھی نوازا گیا۔ پروفیسر ہارون

الرشید تبسم لکھتے ہیں:

”ان کی شاعر عموماً اُن کی طبیعت کی عکاس تھی۔ یعنی بہت خشک شعر کہتے۔ انگریزوں کی طرح اُن کے شعر بھی رومانیت کی فضا سے دور ہوتے۔ غزل کے علاوہ ملی شاعری میں اُن کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔“ ۲۹۵

آپ کی زیادہ تر شاعری موضوعی ہے اور اس میں آپ کو ملکہ بھی حاصل تھا۔

پرچم

خدا نے کر دیا اونچا جو پاکستان کا پرچم
یہ ہوگا ضوفشاں جس دم تو دنیا تھر تھرائے گی
نہ ہوگا ہم نشیں نیچا کبھی ایماں کا پرچم
نہیں طاقت کہ لائے تاب کفرستان کا پرچم
کہ لہرائے گا باعظمت خدا کی شان کا پرچم
ہے کس کی آنکھ میں ہمت جو دیکھے نظر بد سے بھی
مسلمان کا تو ایماں ہے یہ پاکستان کا پرچم

بشیر اس روز کے ہم منتظر ہیں سارے پنجابی

کہ جب دنیا میں لہرائے گا یہ قرآن کا پرچم ۲۹۶

تغیر

شب ہے تاریک تر، مضمحل چاندنی
ظلمتیں ہی بڑھی جاتی ہیں ہر گھڑی
ماہ و انجم ہیں بے نور سے آج بھی
جانے سو جھی ہے قدرت کو کیا دلگی

ہر شب و روز ہے اجنبی اجنبی

اب شب غم کا اپنی سویرا نہیں
گھر میں پہلی سی خوشبو کا پھیرا نہیں
سرخ پھولوں کا گلشن میں ڈیرا نہیں
اور سکوں کا میسر بیرا نہیں

ہم نشیں آج بے کیف ہے زندگی

کارواں بھی نہیں رہنا بھی نہیں
زندگی کی کرن کی ضیاء بھی نہیں
اور راہوں میں روشن دیا بھی نہیں
اہل دل بھی نہیں دریا بھی نہیں

مشعلِ دل بجھی کی بجھی رہ گئی

ہائے مجبوریاں اشک پیتے ہیں آج کچے تاگوں سے زخموں کو سیتے ہیں آج
 بیسیوں رنج و غم ہم پہ بیتے ہیں آج جان باقی نہیں اور جیتے ہیں آج
 کس پرسی کے عالم میں ہے زندگی ۷۹۷

میاں محمد اکرم بھٹی

میاں محمد اکرم مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے قصبہ دسواہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا
 سن ولادت ۱۹۲۶ء ہے۔ آپ کا گھرانہ دینی حوالے سے نمایاں تھا۔ اور علمی حوالے سے بھی اپنی
 پہچان رکھتا تھا۔ تعلیم کے حصول کے بعد اپنے خاندانی پیشے زرگری سے وابستہ ہو گئے اور قیام پاکستان
 کے بعد جب ہجرت کر کے سرگودھا میں قیام پذیر ہوئے تو اپنے پیشے کو ہی ساتھ لے کر چلے۔ جس
 میں آپ نے اپنی سفید پوشی کا بھرم بھی رکھا اور عزت بھی کمائی۔ آپ کو اگرچہ شعر و ادب کا شوق تھا
 لیکن آپ باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔ البتہ اس شوق کی تکمیل کیلئے آپ نے ادارہ شعر و ادب کی بنیاد رکھی
 اور اس کے سرپرست کی حیثیت سے اپنے گھر پر شعری نشستیں منعقد کراتے اس کے علاوہ آپ فلاح و
 بہبود کے کاموں میں بھی اکثر حصہ لیتے۔ ادارہ شعر و ادب کی سرپرستی میں کبھی کبھی آپ شعر کہہ بھی لیا
 کرتے اور پھر مشاعروں میں یا شعری نشستوں میں سناتے۔

میاں محمد اکرم بھٹی صرافہ یونین کے علاوہ دیگر کئی انجمنوں کے بھی سربراہ اور رکن تھے۔
 اللہ رب العزت نے آپ کو حج کی سعادت سے بھی مشرف فرمایا تھا۔ ”آپ ایک عرصہ تک شوگر کی
 بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد ۲۵ رمضان المبارک ۲/ فروری ۱۹۹۶ء کو جب کہ الیکشن کی گہما گہمی تھی
 اس دنیا سے رخصت ہوئے۔“ آپ کی ایک نظم حضرت علامہ اقبالؒ کے حوالے سے پسند کی گئی بلکہ
 حضرت اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اسے سراہا۔

دیدہ وراقبال

شاعرِ مشرق کہوں یا شاعرِ ملت کہوں
بعد مدت کے ہوا پیدا کوئی دانائے راز
اس کی شعر و شاعری ہے اصل میں بانگِ درا
آج یہ خطہ کہ جس کا نام پاکستان ہے
ذہن روشن کر دیئے اقبال کے افکار نے
ایک مردِ راہ داں بھی کر لیا اُس نے تلاش
قائدِ اعظم کو ملت کی قیادت سونپ دی
ایک شاعر نے جو سوچا اس کو سچا کر دیا
حضرتِ اقبالؒ تیری شان و شہرت کو سلام
جانفزا پیغام تیرا زندہ جاوید ہے
دامنِ مسجد میں تیرا آخری ایوان ہے
”آسماں تیری لحد پر شبِ نیم افشانی کرے“

یہ وطنِ اکرم کہ جس کا نام پاکستان ہے

شاعرِ ملت کی سچی سوچ کا فیضان ہے ۳۹۸

غزل

جب دیکھتا ہوں اپنی خطا دیکھتا ہوں میں جو دیکھتا ہوں اُن کی عطا دیکھتا ہوں میں
یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا دیکھتا ہوں میں جو بات ناروا تھی روا دیکھتا ہوں میں
میں خیر خواہِ خلقِ خدا ہوں مرے عزیز سب کے بھلے میں اپنا بھلا دیکھتا ہوں میں

میرے رفیقِ کار بدل دے طریقِ کار

بدلی ہوئی تمام فضا دیکھتا ہوں میں ۳۹۹

عزیز علوی

عزیز علوی کا اصل نام محمد عبدالعزیز تھا۔ آپ ۴ نومبر ۱۹۲۶ کو ہوشیار پور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ جالندھر میں آپ نے پرورش پائی اور وہیں دو آہ کالج سے گریجوایشن کیا۔ انہیں دنوں تقسیم ہند کے باعث آپ نے ہجرت کی اور سرگودھا میں خاندان کے ہمراہ مقیم ہوئے۔ عملی زندگی کا آغاز لاہور میں ایک ملازمت سے کیا اور پھر سرگودھا واپس آ گئے جہاں سرگودھا ٹیکسٹائل ملز میں نئے سرے سے آغاز کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سب سے اعلیٰ عہدے پر پہنچے اس ادارے کی جانب سے انہیں کئی ممالک کی سیاحت کا موقع ملا۔

عزیز علوی نے اپنا تخلیقی سفر جو شعر سے شروع کیا۔ ایک شاعر، مصور، افسانہ نگار اور سفر نامہ نگار کی حیثیت سے جاری رکھا اور آخری لمحوں تک قلم اور موئے قلم کو استعمال کرتے رہے۔ یہ سب کچھ آپ نے شوق کے ہاتھوں کیا اس میں خود نمائی کا عنصر نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کسی ادبی محفل یا شعری نشست میں جانے کا کبھی نہیں سوچا۔ بس خاموشی سے لکھتے رہے اور پھر کتابی صورت میں اسے محفوظ کرتے رہے۔ نثر اور نظم میں آپ کی تقریباً دس کتب ہیں۔ جن میں سے ”لندن میں پھول“ (سفر نامہ)۔ ”ساحل بیٹھ گئے“ (افسانے)۔ ”سائے اور سائبان“ (افسانے)۔ ”سردی اور الاؤ“ (افسانے) نثر میں ہیں جبکہ ”رشتے درد کے“ (شاعری)۔ ”تنہا چاند“ (شاعری)۔ ”جنگل گیت اور غم“ (شاعری)۔ ”موسم پھول اور خوشبو“ (شاعری) اور ”کبھی تو مسکراؤ تم“ (شاعری) منظوم کتب ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے کہ:

”عزیز علوی کو قدرت کی جانب سے جو نغمگی عطا ہوئی ہے اس

نے ان کے کلام میں خوشبو کا خرام اور چاندنی کا فیض عام کر دیا ہے۔ خوشبو

اور چاندنی دونوں کا یہ قرینہ ہے کہ وہ سیلِ رواں کی طرح پھیلتی ہے اور یہی

وصف موسیقی کا بھی ہے کہ وہ بھی بار بار ٹوٹنے اور بننے کے عمل میں مبتلا نہیں ہوتی بلکہ ایک سحر انگیز کیفیت کی طرح ہر شے کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ اس سے یہ کھلا کہ عزیز علوی کے ہاں خوشبو اور چاندنی کو بطور خاص کیوں اتنی اہمیت ملی ہے کہ یہ دونوں نغمگی ہی کے دوروہ ہیں یوں لگتا ہے جیسے عزیز علوی کے دل میں نغمہ سویا پڑا تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ کوئی چشمہ کسی پہاڑی چٹان کے بھیتر کا کھڑا تھا مگر کسی المناک سانحہ کی پہلی ہی ضرب نے چٹان کو توڑ کر چشمہ کو باہر نکل آنے کا راستہ مہیا کر دیا۔“

عزیز علوی نے ۲۱ جنوری ۲۰۰۶ء کو سرگودھا میں وفات پائی اور بڑے قبرستان میں

دفن ہوئے۔ ۲۰۱

غزل

میں مسافر ہوں کڑی دھوپ میں جل جاؤں گا
اپنے احساس کی گرمی سے پکھل جاؤں گا
میں کوئی بت ہوں کہ گر جاؤں تو پھر اٹھ نہ سکوں
ٹھوکریں کھا کے زمانے کی سنبھل جاؤں گا
تیرے پیکر کو سنواروں گا میں اپنے فن سے
خود بھی اس روپ میں اک روز میں ڈھل جاؤں گا
سطح دریا پہ مچلتی ہوئی اک لہر ہوں میں
گردشِ وقت سے لہرا کے نکل جاؤں گا
میں تو خاموش محبت کا سمندر ہوں عزیز
چاند نکلے گا تو ساحل سے اچھل جاؤں گا



تو تھا تو آشنا مجھے چہرے سبھی لگے تو کیا گیا کہ آشنا بھی اجنبی لگے
 اترتا تھا تیرے ساتھ جہاں کاروانِ گل اب اس چمن میں خیمہ زن افسردگی لگے
 لایا نہیں ہوں اس لئے ہونٹوں پہ دل کی بات ایسا نہ ہو یہ بات کسی کو بری لگے
 گو ختم ہو چکی ہے محبت کی داستاں ہو اب بھی تیری بات تو دل کو بھلی لگے
 مدت ہوئی جو وقتِ وداع تو نے دی انہیں آنکھوں میں میری آج بھی وہ ہی نمی لگے
 آسودہ حال رہ کے بھی یہ حال ہے مرا تیرے بغیر زندگی شرمندگی لگے
 تو پاس تھا تو دھوپ بھی تھی چاندنی عزیز
 اب تیرے بعد چاندنی بھی دھوپ سی لگے ۲۰۳

صابر ملک

صابر ملک کا اصل نام محمد صابر ہے۔ اعوان قبیلہ سے متعلقہ شخصیات عموماً اپنے نام کے ساتھ ملک کا سابقہ یا لاحقہ استعمال کرتے ہیں۔ اسی ریت کو نبھاتے ہوئے محمد صابر نے بھی ادب میں آنے کے بعد صابر ملک کو اپنے لئے مخصوص کیا اور ایسا کہ پھر لوگ محمد صابر کو بھول گئے۔

صابر ملک یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کو خوشاب شہر میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور پھر رائل ایئر فورس میں ایئر مین بھرتی ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان ایئر فورس میں آ گئے جہاں ایک مدت گزارنے کے بعد سارجنٹ کے عہدے سے پنشن پائی۔

صابر ملک نے ایئر فورس جوائن کرنے سے پہلے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن عسکری مصروفیات کے باعث کچھ عرصہ یہ شوق تعطل کا شکار رہا۔ ایئر فورس میں جب عنایت اللہ، (ماہنامہ حکایت والے) جاوید سوز (ناول نگار، شاعر) اور محمد سعید (ناول نگار) جیسے رہروانِ ادب سے ملاقات ہوئی تو خفتہ شوق نے پھر انگڑائی لی اور آپ ”فضائیہ“ اور ”ہلال“ جیسے رسائل میں لکھنے لگے۔ آپ کی تمام شاعری وطن اور ملی حوالے سے ہے۔ جسے ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے یکجا کر کے

”تصویرِ وطن“ کے عنوان سے کتابی صورت دے دی۔ جاوید سوز ”تصویرِ وطن“ کے دیباچہ میں صابر ملک کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صابر ملک ایک شعلہ بیاں شاعر ہے۔ جس کے سینے کے اندر حساس دل میں ملت کا درد پنہاں ہے۔ آپ کا قلم تیغِ براں کی طرح تیز ہے۔ جس کے سامنے طاغوتی طاقتیں دم توڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صابر ملک کی رزمیہ نظموں کا مجموعہ حب الوطنی اور عزم و شجاعت کا ایک ٹھانٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے.....

صابر ملک کو اپنے وطن کی ہر چیز میں ایک انوکھا روپ دکھائی دے رہا ہے اس کے جھومتے درخت، اس کے لہلہاتے کھیت، اس کے سرسبز و شاداب اور مہکتے باغات، اس کی جھیلوں کے نیلے نیلے ساغر، اس کے بیٹھے بیٹھے چشمے اور اس کی گنگناہٹ، اس کی نشلی اور طراوت بھری فضاؤں کے میکدے..... دل میں پرستش کا جذبہ ابھارتی ہے۔“ ۲۰۵

صابر ملک اپنی اس دھرتی سے، اس وطن سے اور اسلام سے جی بھر کر محبت کرتا ہے۔ اسے فطرت سے پیار ہے۔ اس ملک کے موسموں سے اُنس ہے۔ اس کی نظر میں جہی، جہی اور ہڈالی کا مرتبہ پیرس سے بڑھ کر ہے۔ اُسے اس وطن کے باشندوں سے، اسلام کے مجاہدین اور مشاہیر سے اور اسلامی ممالک کے شہروں تک سے جہاں محبت ہے وہیں اپنے شہر سرگودھا کو وہ قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور یقین و عزم و عمل کا امام مانتا ہے۔ جس کی تصدیق اُسکے اشعار سے ہوتی ہے۔

یقین و عزم و عمل کا امام سرگودھا	جہاں میں فتح و ظفر کا پیام سرگودھا
خلوص و مہر و محبت کا نام سرگودھا	جبینِ دہر پہ نقشِ دوام سرگودھا
رہے گا جس سے منور چراغِ آزادی	کیا ہے اور کرے گا وہ کام سرگودھا
عدو کے تیرہ نشیمن پہ بجلیوں کی طرح	ہنسا ہے اور ہنسے کا مدام سرگودھا

ترے جلو میں عقابوں نے پرورش پائی تری حسین فضا کو سلام سرگودھا
خدا کے فضل سے جمعیتِ عدو کے لئے اجل کا ایک مکمل پیام سرگودھا
بچا کے ملتِ بیضا کی آبرو صابر

دلوں میں کر گیا پیدا مقام سرگودھا ۲۰۶

صابر ملک نے ایئر فورس سے فارغ ہونے کے بعد خوشاب میں ہی وقت گزارا۔
اس دوران سیاست میں بھی حصہ لینے لگے اور جلسے، جلوسوں میں سیاسی نظموں سے پنڈال کو
گرمایا کرتے۔ ۸ دسمبر ۱۹۸۶ء کو شیر باز مزاری کے جلسے میں سیاسی نظم سنا کر بیٹھے ہی تھے کہ
فرشتہء اجل نے آیا۔

بدر منیر نے ۱۹۸۸ء ۲۰۷ سن وفات لکھا ہے۔ جو درست نہیں کیونکہ وفیاتِ مشاہیر
پاکستان ۲۰۵ میں روزنامہ جنگ لاہور ۹ دسمبر ۱۹۸۶ء کے حوالے سے جو تاریخ دی گئی ہے درست ہے
اور اس کی تصدیق وفیاتِ نامورانِ پاکستان ۲۰۸ میں بھی کی گئی ہے۔

نجات غم سے دلانے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے
وہ بات بگڑی بنانے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے
بساطِ ارضی کی جلوتوں میں، جہانِ بالا کی خلوتوں میں
وہ ہاتھ مشکل سے آنے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے
نظر کی منزل سے دور رہ کر قریب قلبِ بشر ہے ہر دم
نفسِ نفس میں سامنے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے
نظرِ نظر سے گرے ہوؤں کو، مصیبتوں میں گھرے ہوؤں کو
قدم قدم پر بچانے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے
جہاں کی شاداب انجمن میں بدل کے صابر قبائے نوری
وہ اپنے جلوے دکھانے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے

اردو زبان کے بارے میں صابر ملک کا نظریہ بھی جاندار ہے اور نذرانہ بھی۔

نشو و نما حیات میں اردو زبان سے ہے رونق تکلمات میں اردو زبان سے ہے
 حالی و داغ، غالب و اقبال کا کلام مقبول کائنات میں اردو زبان سے ہے
 رس گھولتے ہیں کان میں مصرعے غزل سرا اور لطف نظمیات میں اردو زبان سے ہے
 مفہوم کے نکھار سے لگتے ہیں چار چاند زینت محاورات میں اردو زبان سے ہے

ہر دم بقا کی ترجمان صابر کی شاعری

اقلیم بے ثبات میں اردو زبان سے ہے ۲۰۹

عصمت علیگ

عصمت اللہ نام اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم ہونے کی نسبت سے علیگ لکھتے تھے۔

آپ ۱۹ اپریل ۱۹۲۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عنایت اللہ محکمہ ڈاک میں ملازم تھے اور سرگودھا میں مقیم تھے۔ لہذا عصمت اللہ نے ابتدائی تعلیم سرگودھا میں حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۱ سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں سے بی اے کرنے کے بعد واپس آئے اور کچھ عرصہ بعد ٹریکٹروں کی خرید و فروخت کا ادارہ قائم کر لیا۔ جس میں ممتاز احمد کاہلوں اور صاحبزادہ الماس آپ کے رفقاء کار تھے۔ چونکہ ابتدا سے ہی ادب کا ذوق تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ اور شعر و سخن کی محفلوں کو بھی وقت دیتے تھے۔ سواسی شوق کے تحت ۱۹۶۶ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ مل کر ”اردو زبان“ جاری کیا۔ آپ سرگودھا اکیڈمی کے بھی اولین جنرل سیکرٹری تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا آپ کا احترام کرتے تھے ڈاکٹر صاحب کی کتاب ”چوری سے یاری تک“ کا اغتساب بھی عصمت علیگ کے نام ہے۔

جب انور سدید کا تبادلہ سرگودھا ہوا تو ”اردو زبان“ اُن کے سپرد کر کے لاہور چلے گئے۔

جہاں آپ وزیر اعلیٰ حنیف رامے کے پس پردہ مشیر کے طور پر کام کرتے رہے۔ پروفیسر ہارون

الرشید تبسم لکھتے ہیں کہ:

”سید مسعود زاہدی جب پنجاب کے ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے تو وہ بھی عصمت علیگ کے مشوروں کو اہمیت دیا کرتے تھے۔ عصمت علیگ نے سیاست میں حقیقت کو حرز جاں بنائے رکھا۔ وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران ان کے غلط فیصلوں پر کھل کر تنقید کر لیا کرتے تھے۔“

عصمت علیگ نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن پھر نظم کی طرف آگئے۔ بہت زیادہ نہیں لکھا۔ شاید دیگر مصروفیات آڑے آتی رہی ہوں۔ یا پھر سیمابی فطرت کے باعث کبھی کاروبار، کبھی سیاست اور کبھی ادب وغیرہ میں کسی ایک سمت کا چناؤ نہیں کر سکے اور شاید شادی بھی اسی وجہ سے نہ کر سکے۔ یہ بہت سی خوبیوں کا مالک جو اپنی صلاحیتوں کو ٹھیک طرح سے استعمال نہ کر سکا آخر کار زندگی کی بازی ۱۰ جنوری ۲۰۰۴ء بروز جمعۃ المبارک کولاہور شہر میں ہار گیا۔ ”آپ کی تدفین دوسرے دن سرگودھا میں کی گئی۔“

بکھرتے پیکر

گریز کیسا

قدم ز میں پر کچھ اس طرح رکھ

کہ دل کا ناسور رستے رستے

کبھی تو پیوند ہوز میں سے

کبھی تو یہ برگ و بار لائے

کبھی تو احساس کی کلی پیرہن سے نکلے

برہنہ پیکر جھکی نگاہوں سے داد مانگے

جہانِ نو منتظر ہے میرا مجھے پکارے

پلٹ کے دیکھوں تو دھیان کے غار سے ابھرتا ___ مہیب سایا

سید ناگن کا زہر سینے کی تنگ پہنائیوں میں بھر دے
 کچھ اس طرح کہ نگاہ منزل کے فاصلے
 دوریاں پہاڑوں کی اوٹ، دشوار رگزاریں شکستہ پائی
 قتل احساس، رہ نور دی، کہ لیلیٰ شوق کے سلاسل
 دھواں دھواں خواہشوں کا پیکر بکھرتا جائے
 نہ کوئی لذت نہ کوئی خوشبو نہ شعلہ جسم کی حرارت
 خیال ___ اک سلسلہ ادھورا ہے
 خواب ___ تصویر نامکمل

غزل

تو نہیں تھا نہ تھی تری آواز
 کاش عنوانِ زیت بن جائے
 کیا غمِ مرگِ آرزو کیجئے
 درد نے بڑھ کے چارہ سازی کی
 اک تجلی مگر رہی غماز
 ڈوبتے دل کی ڈوبتی آواز
 اے غمِ دوست تیری عمر دراز
 کون تھا ورنہ مونس و دمساز
 لب ہلاؤ، کوئی تو بات کرو
 دونوں عالم ہیں گوش بر آواز

علی حسنین شیفتہ

علی حسنین نام اور شیفتہ تخلص کے ساتھ پورا نام علی حسنین شیفتہ لکھا کرتے تھے۔ آپ ۱۶
 جنوری ۱۹۲۸ء کو جون پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ پروفیسر ہارون الرشید تبسم ۱۹۲۹ء ۱۳ سن
 ولادت لکھتے ہیں۔ آپ کے والد محمد قیوم ایک مذہبی شخصیت تھے۔
 علی حسنین نے ابتدائی تعلیم جون پور سے حاصل کی۔ جون پور سے ہی ”تام الفاضل“ کی

سند حاصل کی۔ اور پھر مختلف اساتذہ سے فیض پانے کا موقع ملا۔ بالآخر الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے (فارسی) کرنے کے بعد تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۱ء میں ہجرت کی اور پاکستان آ گئے۔ خیر پور میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ پھر لاہور سے ہوتے ہوئے منگمری پہنچے۔ اور اوکاڑا کے ہائی سکول میں مدرس ہو گئے۔ اسی ملازمت کے دوران آپ نے عربی، اردو اور اسلامیات میں بھی ایم اے کئے اور کراچی میں لیکچرار کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۹۷۰ء میں آپ سرگودھا آئے اور یہیں کے ہور ہے۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں اسلامیات کے استاد مقرر ہوئے۔ اور یہاں کے اساتذہ اور ادبی ماحول میں ضم ہو کر رہ گئے۔

پروفیسر علی حسنین شیفتہ نے ۱۹۸۷ء میں ریٹائرمنٹ لے لی اور پھر قلم و قرطاس سے منسلک رہتے ہوئے چار سال بعد ۲۸ فروری ۱۹۹۱ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پروفیسر علی حسنین شیفتہ اردو، انگریزی، عربی اور فارسی زبانیں جانتے تھے۔ نثر اور نظم دونوں میں آپ کی طبع رواں تھیں لیکن آپ کی صرف نثری تصانیف منظر عام پر آئیں۔ جن کے نام ہیں: علم الحدیث۔ حدیث غدیر۔ معقول مذہب۔ کلام ابی طالب۔ اسوۂ حسنہ۔ تحقیق حق۔ مذہب اہل بیت۔ تحقیقی تبصرے۔ کتاب المومن۔ تائید حق اور تردید باطل۔

شاعری میں آپ سلاست اور سادگی کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ بات کو الجھانے کی بجائے بڑے سیدھے سجاؤ فن کا خیال رکھتے ہوئے پیش کر دیتے ہیں۔

غزل

زندگی غم ہے آدمی کے لئے	پھر بھی مرتے ہیں زندگی کے لئے
بڑھ گئی اور دل کی بے تابی	آپ آئے جو دو گھڑی کے لئے
جب سے غم آپ نے دیا ہے مجھے	آرزو بھی نہ کی خوشی کے لئے
یہ کرشمے ہیں عشق کے ورنہ	کون جیتا ہے یوں کسی کے لئے
دل نے کعبہ سمجھ کے ڈھونڈ لیا	آستاں اُن کا بندگی کے لئے

کیا اُسے بھی کہے گا دل کوئی؟ جو تڑپتا نہ ہو کسی کے لئے
 شیفۃ لفظ لفظ میں میرے
 نکتے بکھرے ہیں شاعری کے لئے



تمنا رُو بکار آئے نہ آئے کوئی غفلت شعار آئے نہ آئے
 چلو ہم خود بہارستاں منا لیں خدا جانے بہار آئے نہ آئے
 بیاں کیا کیجئے بے تابِ دل کسی کو اعتبار آئے نہ آئے
 جو ممکن ہو تو اے دل خود بہل جا وہ جانِ انتظار آئے نہ آئے
 میرے ساتی ذرا جام و سبولے
 یہ موسم یہ نکھار آئے نہ آئے

مجید افضل پراچہ

پراچہ فیملی کا چشم و چراغ شیخ مجید افضل ۲۸ فروری ۱۹۲۸ء کو بھیرہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوا۔
 ابتدائی تعلیم بھیرہ سے حاصل کی اور ڈی مونٹ مورسی کالج سے ہوتے ہوئے گورنمنٹ کالج سرگودھا سے
 بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عملی طور پر صحافت سے منسلک ہو گئے۔ اور پھر سرگودھا یونین آف
 جرنلس کے صدر کے علاوہ سینئر وائس پریذیڈنٹ پنجاب نیوز پیپرز سوسائٹی کے عہدے پر متمکن
 رہے۔ جبکہ ”ضرب مجاہد“ کے نام سے آپ ایک مفت روزہ بھی سرگودھا سے نکالتے رہے۔

شیخ مجید افضل نے صحافت میں شرافت کی فضا قائم کی۔ ”شامی پرنٹنگ پریس“ کے نام
 سے پریس کا کام بھی کیا۔ آپ صرف صحافی ہی نہیں بلکہ شاعر بھی تھے۔ یہ الگ بات کہ شاعری کی
 طرف مکمل توجہ نہ دے سکے لیکن صحافت میں البتہ جرات و دلیری کا مظاہر کیا۔ ”تشدد کی داستان“
 آپ کی اس دور کی صحافتی کاوش ہے جب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف زبان سے لفظ ادا کرنے والوں

کی زبان کھینچ لی جاتی تھی۔ تحریک نفاذ نظامِ مصطفیٰ کے دوران سرگودھا شہر کے نہتے مسلمانوں پر بھٹو حکومت کی ظالم انتظامیہ نے جو غیر قانونی اقدامات کئے اور دھاندلیوں کی جو انتہا کی۔ انہیں صفحہء قرطاس پر لانا کسی صورت اُس وقت ممکن نہیں تھا لیکن شیخ مجید افضل پراچہ نے اسے ممکن بنایا اور یہ کتاب ۱۰ جون ۱۹۷۷ء میں شائع ہو کر لوگوں کے ہاتھ میں آگئی اور جب تک بھٹو انتظامیہ اس کتاب کے بارے کچھ سوچتی اس پر اللہ تعالیٰ نے ضیاء الحق کو مسلط کر دیا تھا۔

شیخ مجید افضل جو بھیرہ سے سرگودھا منتقل ہو چکے تھے۔ یہاں سے کراچی چلے گئے اور وہاں کی فضاؤں اور ماحول میں گم ہونے کی کوشش کی لیکن وہ فضا انہیں راس نہ آئی اور حالات انہیں اپنی جنم بھومی کی طرف واپس لے آئے۔ جہاں کچھ عرصہ علیل رہ کر ۷ جولائی ۲۰۰۷ء کو وفات پائی۔ ۱۸؎ ”اشکِ محبت“ اُن کا شعری مجموعہ کافی عرصہ پہلے شائع ہو چکا تھا۔ محمود اسیر کا اُن کے بارے خیال ہے:

”مجید افضل غزل کے فدائی ہیں اور صرف غزل کو ہی اپنایا ہے۔

تحت اللفظ میں پڑھنے کی بجائے ترنم سے پڑھنا زیادہ بہتر گردانتے ہیں۔

شعروں میں الفاظ کی بندش اور اسلوب پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ ان کے اشعار ان کے ترنم کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ قدیم رنگِ تغزل اور

روایتی حسن و عشق کا رچاؤ ان کی شاعری کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان کے

ہاں تغزل بھی ہے، غمِ محبوب اور غمِ دوراں کے تجربات و مشاہدات بھی۔“ ۱۹؎

غزل

نہ ہے تاج و تخت کی آرزو نہ جہانِ زر کی تلاش ہے

جو تمھاری آنکھ سے گر سکے مجھے اُس گہر کی تلاش ہے

میں تمھاری بزمِ شباب میں یونہی بے سبب نہیں آ گیا

مجھے دل کے زخم کے واسطے کسی چارہ گر کی تلاش ہے

جو پیام لے کے بھی جاسکے، جو جواب لے کے بھی آسکے
 دل منتظر کو ابھی تلک اسی نامہ بر کی تلاش ہے
 میں فریب خوردہ راہزن یونہی کھو گیا ہوں ادھر ادھر
 مجھے کارگاہِ حیات میں کسی راہبر کی تلاش ہے
 کہیں اس جہانِ عجیب میں کوئی افضل اپنا نہ بن سکا
 جو مجھے خلوص سے دیکھ لے مجھے اُس نظر کی تلاش ہے



اس جہاں کا نظام بدلے گا زندگی کا پیام بدلے گا
 عشق بدلے گا اب روش اپنی حسن اپنا مقام بدلے گا
 ہمدردی چند روز صبر کرو وقت اپنا امام بدلے گا
 تابہ کے میکشویہ رنگِ قدیم ساقیا دورِ جام بدلے گا
 گنگناتی ہوائیں کہتی ہیں
 اب چمن کا نظام بدلے گا ۲۲۰

محمد نذیر شیرزادہ

محمد نذیر نام اور شیرزادہ سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے والد کا نام محمد شیر احمد شیر
 ، شیر محمد یا اسی طرح کا ہوگا جس کا حصہ شیر ہوگا۔ ”آپ ۲۱ مئی ۱۹۲۸ء کو ناٹھہ (مشرقی پنجاب) میں پیدا
 ہوئے۔ لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ اور پھر الیکٹرونکس
 میں ایسوسی ایٹ انجینئر کا ڈپلومہ حاصل کیا۔“ ۲۱ اگرچہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن آپ کا
 رجوع شروع سے ہی آرٹس کی طرف تھا۔ جس میں شاعری اور مصوری آپ کے شوق کا حصہ بن چکے
 تھے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان ایئر فورس میں شامل ہو گئے اور ۲ سال تک کا عرصہ عسکری پابندیوں میں

گزار کر ۱۹۷۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس دوران آپ نے خود کو صرف فوجی ہی نہیں بنائے رکھا بلکہ شوق کی تکمیل کیلئے ۱۹۶۷ء میں الحمراء آرٹس کونسل لاہور سے فائن آرٹس میں سٹوڈنٹ حاصل کیا۔ دوران ملازمت آپ نے کئی مقامات پر اپنی تصاویر کی نمائش کرائی۔ ۱۹۷۹ء میں انجمن ترقی اردو کے شعری پروگراموں اور ادبی نشستوں میں حاضر ہونے سے خود کو مزید فعال کیا۔ ۱۹۷۹ء میں انہوں نے سرگودھا میں اقراء اکیڈمی کا آغاز کیا۔ جس کے زیر انتظام انہوں نے اپنا شعری مجموعہ "The Musing Spring" شائع کیا۔ جسے اردو میں "شعریات" کا نام دیا گیا۔ اس مجموعہ کلام میں ان کا انگریزی، پنجابی، اردو اور ہندی میں کلام شامل ہے۔ "فن مصوری" کے عنوان سے ان کی تصاویر بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی یہ Painting اور Drawing فن مصوری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ شعریات کے بارے صوفی فقیر محمد نے بڑا مختصر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"شیرزادہ کی اردو شعریات اور پنجابی کوتا کے بارے میں وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ایں کاراز تو آید و مرداں چنیں کنند۔ جس طرح شیرزادہ کی مصوری میں شاعری چھلکتی ہے۔ اسی طرح موصوف کی شاعری میں مصوری چھلکتی ہے اور یہی شیرزادہ کی فنی صلاحیت ہے۔" ۲۲۲

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے نذیر شیرزادہ کی تاریخ وفات کو ایک اور زاویے سے دیکھا ہے کہ :

"وہ ۲۱ مارچ ۲۰۰۲ء کو سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ عجب اتفاق

ہے کہ ۲۱ کا ہندسہ ان کی زندگی کا اہم حصہ ثابت ہوا۔ پیدائش، شادی اور

وصال تینوں ہی ۲۱ تاریخ کو ہوئے۔" ۲۲۳

سلسلہ خیال

قیامِ خطہء جنت محال تھا پیارے خیال خام تھا جو بھی خیال تھا پیارے
جواب ٹھیک نہیں تھا سوال ٹھیک سہی غلط خیال تھا جھوٹا خیال تھا پیارے

وہ دن بھی یاد رہیں گے کہ اجنبی ہم تھے
 کسی کے پاس مرض کا علاج تھا ہی نہیں
 ہم اپنے عہد میں بندوں کا کال کہتے ہیں
 نگاہ تیز تھی جنکی انہیں نظر آیا
 وہ تخت و تاج کا دعویٰ وہ راج کا جھگڑا
 یہی رہا ہے زمانے میں ہر زمانے میں
 طلسمِ خواب سے نکلے تو غور سے دیکھا
 ہم ایک ایسی گزرگاہ ہو کے آئے ہیں
 ترے دیار میں جینا محال تھا پیارے
 یہ اور بات کڑھی کا اہال تھا پیارے
 ہر ایک دور میں قحط الرجال تھا پیارے
 یہ کس کا حسن تھا کس کا جمال تھا پیارے
 وہ آج بھی ہے وہ کل بھی وہاں تھا پیارے
 الم تھا رنج تھا غم تھا ملال تھا پیارے
 فراق و فاقہ و فقر و زوال تھا پیارے
 فساد و فتنہ و قتل و قتال تھا پیارے

خیال و خواب کی باتیں خیال و خواب ہوئیں

”کھلی جو آنکھ تو دشتِ سوال تھا پیارے“

جاگتے سنے

پھر رہا تھا یونہی اک دن وہ اکیلا دشت میں
 صاف ستھرے جھیل کے پانی کے اندر کچھ کنول
 بادلوں کی ٹکڑیاں بھی منعکس تھیں آب میں
 سوچ کے درکھل گئے ماضی میں داخل ہو گیا
 تھا کھڑا تالاب کے ڈوبے کنارے پر کوئی
 پھینکتا پانی میں پتھر ہاتھ بھی تھا مارتا
 برق پاشی ہو گئی ہو جل پری یا خور پر
 ارتعاشِ برق نے بے تاب اس کو کر دیا
 پھول نندی کے کنارے تھے کھلے کچھ طشت میں
 سرخ نیلی رنگوں کے روبرو تھے پھول پھل
 ہو رہا تھا خوش بہت وہ آنکھیں کھولے خواب میں
 سامنے جو بھی تھا فوراً اُس سے اوجھل ہو گیا
 مرتعش لہروں پہ صورتِ نقش تھی اُس کی ہوئی
 کاغذی بیڑے لڑا کر جنگ اپنی ہارتا
 ربِ موسیٰ ضوفشاں ہو جیسے کوہِ طور پر
 اک سہانے خواب سے بے خواب اس کو کر دیا

پھر رہا تھا پھر یونہی آخر اکیلا دشت میں

پھول نندی کے کنارے تھے کھلے کچھ طشت میں

صدر بخاری

محمد صدر جن کا قلمی نام صدر بخاری تھا۔ ۱۹۲۸ء میں بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور پھر واپڈا میں ملازمت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ یہ ملازمت کرنے کے بعد اسے خدا حافظ کہہ دیا اور آسٹریلیا بینک میں کلرک بھرتی ہو گئے۔ اس ادارے میں آپ نے کوشش کی اور پھر بینک یونین کے صدر منتخب ہو گئے۔ لیکن صدر کے جو مسائل ہوتے ہیں وہ یہاں بھی تھے۔ آپ ورکرز کے مسائل کو حل کرنے میں اور ان کے مطالبات منوانے میں محور تھے اور ایک لمحہ ایسا آیا کہ آپ کو ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اور پھر بے روزگاری مقدر بن گئی۔ سخنوران سرگودھا کے مطابق:

”اس سانحہ کے بعد آپ نے تمام عمر نوکری نہ کرنے کا فیصلہ کر

لیا۔ آپ کی شادی منڈی یزمان (بہاولپور) میں ہوئی۔ سانحہ یہ ہوا کہ بیوی آپ کے پہلے بچے کو جنم دینے کے بعد خالق حقیقی سے جا ملی اور ان کے چچا کے بقول آجکل یہ بچہ بڑی کسمپرسی کی حالت میں اپنی خالہ کے پاس بہاولپور میں ’ڈنگر‘ چرانے کا کام کرتا ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد آپ اکثر کھوئے کھوئے رہتے اور تا حیات دوسری شادی نہیں کی۔“ ۲۳۳

صدر بخاری بہاولپور کو چھوڑ کر سرگودھا میں جب قیام پذیر ہوئے۔ تو کچھ عرصہ وہ مسلم بازار میں ایک ہوٹل بنا کر زندگی گزارتے رہے۔ پھر یہاں سے آپ تاجدار دہلوی کے پاس اٹھ آئے اور اُنکے ہوٹل پر تین سال تک بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتے رہے۔ یہاں کسی الزام کی زد میں آگئے اور غلہ منڈی میں اپنا ایک چھوٹا سا ہوٹل بنا لیا۔ ایسے حالات میں شاعری تھی جس سے آپ کو قدرے سکون ملتا۔ لیکن یہ سکون بھی وقتی ثابت ہوتا کیوں کہ پھر حالات اُن کو گھیرے میں آ لیتے اور اسی اچھاڑ بچھاڑ میں آپ نے ۱۱ فروری ۱۹۶۹ء کو سرگودھا میں ہی وفات پائی۔ آپ کی شاعری میں ایک بیباکی اور کھنک سی موجود ہے۔

غزل

دشوار آج کل یوں ایامِ زندگی ہیں سارے ستم جہاں کے انعامِ زندگی ہیں
کوئی بھی ہم سے بڑھ کر مشقِ ستم نہ ہوگا جتنے بھی اس جہاں میں ناکامِ زندگی ہیں
کوئی بھلا کسی سے غم ہائے دل کہے کیا بیگانہء مروت اصنامِ زندگی ہیں
ہم نے جہانِ غم میں کوئی نہ اپنا پایا کہنے کو دوست سارے آرامِ زندگی ہیں
بے چارگی میں صفرِ اپنے ہی ساتھی نکلے
درپیش جس قدر بھی آلامِ زندگی ہیں ۲۲۵



ان کو بھی شکایت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا کیا خوبی قسمت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
چھڑ جائے کہیں ذکر جو انجامِ وفا کا ہاں دوست حقیقت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کل تک جو خفا تھے مرے اظہارِ طلب پر آج اُن کو شکایت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہنے کو تو لاکھوں ہی شکایات میں لیکن مجبوریء الفت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
نت زخم نئے کھا کے بھی احباب کے ہاتھوں احساسِ مروت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
غم کھانے سے دکھ سہنے سے خوں رونے سے صفرِ
کب مجھ کو فراغت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا ۲۲۶

واصف علی واصف

واصف علی نام اور واصف تخلص کے ساتھ واصف علی واصف کے حوالے سے لکھا کرتے
تھے۔ آپ خوشاب کے محلہ کنڈانا نوالہ میں پیدا ہوئے۔ کنڈان دراصل اعوان قبیلے کی Sub caste
ہے۔ جو حضرت قطب شاہ کے بیٹے محمد کنڈلان جسے برصغیر میں کنڈان میں تبدیلی کر دیا گیا کی اولاد
ہے۔ واصف علی واصف کا تعلق بھی کنڈان خاندان سے ہے۔ آپ کی تاریخ ولادت میں اختلاف پایا

جاتا ہے۔ جس کی طرف ثروت طارق حبیب نے توجہ دلائی ہے۔ اُس کا کہنا ہے:

”واصف علی واصف کی تاریخ ولادت میں کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں واصف صاحب کی ہمشیرگان اور بھائی سے رابطہ کیا تو انہوں نے جو تاریخ ارسال فرمائیں ان سب میں اختلاف موجود تھا۔ کسی کی بھیجی ہوئی تاریخ دوسری سے متفق نہیں تھی۔ پہلی تاریخ ۱۹۲۸ء اور دوسری تاریخ ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء ہے۔ تیسری تاریخ یکم جنوری ۱۹۲۹ء اور چوتھی تاریخ ۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء ہے۔ یوں چوتھی تاریخ کو اس لئے حتمی قرار دیتے ہیں کہ واصف صاحب کے شناختی کارڈ اور میٹرک کی سند پر بھی یہی تاریخ درج ہے۔“

یہی تاریخ یعنی ۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء ”ضلع خوشاب۔ تاریخ، ثقافت، ادب“ ۲۲۸ میں ہے۔ یہی تاریخ ”دیدہ خوش آب“ ۲۲۹ میں رقم ہے لیکن جہاں تک میری ذاتی سوچ کا تعلق ہے وہ یہ کہ اُس عہد کو سامنے رکھ کر ہمیں تحقیق کے دائرے کو پھیلا نا چاہیے۔ واصف صاحب نے ۱۹۳۲ء میں مڈل اور ۱۹۳۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ اُس وقت مڈل پاس کرتے ہوئے سکول میں کم از کم ۹ سال لگ جاتے تھے۔ ایک سال کچی پہلی، ایک سال کچی پہلی اور سات سال بعد میں۔ یوں اگر ۱۹۳۲ء سے ۹ کو منہا کیا جائے تو ہمارے پاس ۱۹۳۳ء کا سن نکلتا ہے۔ لہذا یہاں ۱۹۳۱ء والی تاریخ پیدائش کا تو مکمل رد ہو جاتا ہے کہ ۲ سال کی عمر کا بچہ سکول نہیں جاسکتا۔ اس دور میں پانچ سال سے کم عمر بچے کو سکول میں داخل نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی والدین داخل کرواتے تھے۔ یوں ۱۹۳۳ء میں پانچ سال گھر والے نکال دیئے جائیں تو ۱۹۲۸ء کا سن نکلتا ہے اور یہی سن میرے خیال میں درست پاتا ہے۔

واصف صاحب کے والد کا نام محمد عارف تھا۔ ماموں کا نام محمد امین تھا۔ یہ نام بتانے کا مقصد یہ ہے کہ واصف علی واصف کی زندگی کو سنوارنے میں اُن کے ماموں کا کردار ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ میٹرک خوشاب سے اور ایف ایس سی انٹر کالج جھنگ سے کرنے کے بعد لاہور جا کر پڑھائی کو

جاری رکھا۔ خود ٹیوشن پڑھاتے اور خاندان کی کفالت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔
 بیب اتفاق کہ آپ انگلش کالج کے بانی اور ایم اے انگلش کے ٹیوٹر تھے۔ لیکن خود ایم اے نہ کر سکے
 آپ نے گھر میں بھی ”واصف آئیڈیل سکول“ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ کھول لیا۔ جس کا انتظام
 آپ کی زوجہ کے ہاتھ میں تھا۔ یہاں یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ آپ کے بھائی شوکت محمود، آپ سے
 عمر میں بہت چھوٹے ہیں۔ لیکن شوکت محمود کی شادی پہلے ہوئی اور واصف صاحب کی بعد میں۔

واصف صاحب آخری عمر میں بلند فشار خون کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے۔ پاکستان کے
 علاوہ برطانیہ بھی بغرض علاج تشریف لے گئے۔ لیکن افاقہ نہ ہوا۔ بلکہ گردے بھی متاثر ہوئے۔ اور
 پھر اسی حالت میں ۲۴ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ بروز سوموار بمطابق ۱۸ جنوری ۱۹۹۳ء کو وفات پائی۔
 دوسرے دن تمام قومی اخبارات میں بڑی نمایاں خبریں شائع ہوئیں ”The Nation“ نے لکھا۔

"Prominent intellectual, philosopher and poet
 Wasif Ali Wasif died here on Monday after a
 prolonged illness. He was 64.

Wasif Was a philosopher and poet par
 excellence. His works of poetry and philosophy
 make him a towering figure in the field of
 literature and a philosophy."۳۰

آپ کی نماز جنازہ ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز جناب امانت انوار نے پڑھائی اور میانی
 صاحب کے دربار میں آپ کی تدفین ہوئی۔ اب ہر سال اسلامی مہینہ کی ۲۴ رجب کو آپ کا عرس منایا
 جاتا ہے۔

محمد ظہیر بدر کے مطابق واصف علی واصف صاحب دسمبر ۱۹۳۹ء میں خواجہ نظام الدین
 اولیاء کے عرس کی تقریبات میں شرکت کے لئے گئے۔

”ہندوستان سے واپس آنے کے بعد واصف میں ایک واضح

تبدیلی تو یہ آئی کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیئے حالانکہ اس سے پہلے وہ شعر نہیں کہتے تھے۔“ ۲۳۱

جبکہ علامہ یوسف جبریل صاحب کا کہنا یہ ہے کہ
 ”میں نے جب ”نعرہ جبریل“ لکھی اور واصف صاحب کو سنائی
 تو وہ تڑپ اٹھے اور پھر انہوں نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا۔“ ۲۳۲
 لیکن تحریری طور پر جو اس کا ثبوت ملتا ہے وہ ڈاکٹر تصدق حسین راجا کے الفاظ میں :
 ”شاید ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۳ء کا زمانہ تھا۔ جب حضرت واصف علی
 واصف نے حضرت علامہ محمد یوسف جبریل کو بہت سنایہ حقیقت ہے کہ اتنے
 بڑے بولنے والے انسان (ایک سمندر کی مانند ٹھانھیں مارتا ہوا سمندر)
 حضرت علامہ محمد یوسف جبریل کے ساتھ بیٹھتے تو خاموشی سے حضرت علامہ
 صاحب کی گفتگو سنتے رہتے تھے۔ جناب واصف علی واصف کو انگریزی لٹریچر
 سے روحانی لٹریچر کی طرف منتقل کرنے میں جن روحانی شخصیات کا ہاتھ ہے
 اُن میں علامہ صاحب کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ ۲۳۳
 آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ

”نعرہ جبریل“ کی شاعری نے حضرت واصف پر بہت گہرا اثر
 چھوڑا اور انہوں نے بھی شاعری کی جس میں روحانیت اعلیٰ درجے کی موجود
 تھی۔“ ۲۳۴

نعرہ جبریل علامہ محمد یوسف جبریل کا پہلا شعری مجموعہ ہے لیکن جن دنوں کی یہ بات ہے
 تب تک وہ صرف ایک نظم کی صورت میں قلمی مسودہ تھا۔

بہر حال انہوں نے شعر جیسے بھی اور جن حالات میں بھی کہنا شروع کیا۔ جب کہا تو پھر
 روحانیت اور تصوف بھر کر رکھ دیا۔ واصف علی واصف نے نثر، نثر پارے، نظم، کالم غرضیکہ اردو، پنجابی

اور انگریزی میں بہت کچھ لکھا اور اس سے بھی بڑھ کر اُن کی گفتگو کا وہ سلسلہ ہے جس نے بڑے بڑے دانشوروں کو نہ صرف ہلا کر رکھ دیا بلکہ آپ کے قدموں میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ آپ کی جو تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ اُن کے نام ہیں

(۱)۔ کرن کرن سورج (نثر پارے) (۲)۔ دریا دریا سمندر (مضامین)

(۳)۔ قطرہ قطرہ قلم (مضامین) (۴)۔ حرف حرف حقیقت (مضامین)

(۵)۔ بات سے بات (نثر پارے) (۶)۔ گناہ ادیب (خطوط)

(۷)۔ مکالمہ (انٹرویو) (۸)۔ درتے

(۹)۔ ذکر حبیب (نعت) (۸)۔ The Beaming Soul

(۱۱)۔ Ocean in Drop آپ کے انگریزی نثر پاروں کا مجموعہ ہے۔

ان کے علاوہ ۲۸ جلدوں میں سوال جواب کا سلسلہ جو ”گفتگو“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور ابھی تک جاری ہے۔ نجانے کتنے کیسٹس میں گفتگو کا یہ سلسلہ بند ہے جو ایک ایک کر کے سامنے آ رہا ہے۔ مزید یہ کہ پنجابی زبان میں ایک شعری مجموعہ ”بھرے بھڑولے“ اور دو شعری مجموعے بزبان اردو بعنوان ”شب چراغ“ اور ”شب راز“ بھی شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بھی بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ پروفیسر محمد ظہیر بدر کے ایم فل کا مقالہ ”واصف علی واصف۔ احوال و آثار“ بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ ثروت طارق حبیب نے بھی ایم اے کا مقالہ واصف علی واصف کے بارے لکھا ہے جو ابھی تک پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ اُن کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے آپ کی کتب پر، آپ کی شخصیت پر اور آپ کی روحانیت کے بارے تحریری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

واصف علی واصف نے اپنی شاعری میں جن موضوعات پر بات کی ہے۔ اُن میں تصوف،

وطنیت، سیاست، تہذیب، معاشرت، اور خمریات وغیرہ شامل ہیں۔ نمونہ کلام ۔

بارگاہِ صمدیت میں

تو ایک قلمِ رحمت وسیع و بے پایاں
 تراجمال کہ ہے کائنات کی تنویر
 تو ایک راز کہ ظاہر میں ہو تو پُر اسرار
 تو سامنے ہو تو مچھن جائے تابِ نظارہ
 تو لامکاں کا مکیں اپنی ذات میں تنہا
 تو وہ کہ نور سے تیرے ضیائے ارض و سما
 تو خود قریبِ رگِ جاں رہے تو بات الگ
 تو ایک برقی تجلی کہ ہر وجود میں تُو
 تو وہ قدیم کہ آغاز ہے نہ ہے انجام
 تو ہر خیال کی رفعت سے ارفع و اعلیٰ
 تو آسکے تو مرے غم کی کائنات میں آ
 عجب نہیں تو مرے غم کدے میں آجائے
 بجا کہ لطف و کرم بے کنار ہے تیرا
 نگاہِ فکر سے پردے اٹھا مرے مولا
 تجھے ہے واسطہ تیری بقائے مطلق کا
 میں ریگ زارِ تمنا میں تشنہء باراں
 میں اک مسافرِ شبِ تیرگی میں سرگرداں
 میں تیرے راز کا محرم میں تیرے فن کا نشاں
 میں آئینے میں ہوں گم مثلِ دیدہ حیراں
 مری شریکِ سفر کیوں ہو گردشِ دوراں
 میں تیرہ شب میں تمنائے روزِ زنداں
 میں دوری شبِ ہجراں میں شورشِ گریاں
 میں ایک سنگ کہ اپنے وجود میں لرزاں
 میں وہ کہ حادث و فانی و بے خبر انساں
 میں لاؤں کون سے الفاظِ شان کے شایاں
 میں آگیا تری چاہت میں اب کہاں سے کہاں
 عجب نہیں کہ مرے درد کو ملے درماں
 بجا کہ مجھ کو ہے احساسِ تنگی داماں
 سرِ فلک بھی دھواں ہے سرِ نظر بھی دھواں
 مرے وطن کی بقا کا بھی کچھ تو ہو ساماں

تو ہی بتا کہ تجھے کیا کہے ترا واصف

ملے زبان کو دل یا عطا ہو دل کو زباں ۲۳۵

غزل

ظاہر ہے گرچہ جسم مرا بے خراش ہے احساس کا وجود مگر قاش قاش ہے
 تیری نظر ہے مطلعِ انوارِ صبح پر میری نظر میں ڈوبتے سورج کی لاش ہے

آواز دے کے آپ تو خاموش ہو گئے میرے لہو میں اب بھی وہی ارتعاش ہے
سنگِ خزاں سے دستِ صبا نے لیا ہے کام آئینہ جمالِ چمن پاش پاش ہے
انسانیت کی موت ہے وہ دورِ اقتدار جس دور میں ”صحیفہ فطرت“ نراش ہے
واصف یہ کس مقام پہ لایا مجھے جنوں
اب اُن کی جستجو ہے نہ اپنی تلاش ہے ۲۶

نصرت چوہدری

ریاست علی نام کا یہ شخص جسے دنیا نصرت چوہدری کے حوالے سے جانتی ہے ۱۴ اپریل
۱۹۲۹ء کو چک نمبر ۹۹ شمالی ضلع سرگودھا میں پیدا ہوا۔ آپ کے والد چوہدری روشن دین گاؤں کے نمبر
دار اور ایک معتبر شخصیت کے حامل تھے۔

چوہدری ریاست علی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی۔ اور لوئر ٹل کے بعد
چک نمبر ۸۸ شمالی کے فارسی ٹل سکول میں داخل ہوئے۔ ٹل کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ
ساتن دھرم ہائی سکول سرگودھا میں داخل ہو گئے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد فوج میں بھرتی ہو گئے۔ وہاں جی
نہ لگا تو واپس آ کر دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا اور اسی دور میں آپ نے شعر کہنا بھی شروع کر دیا۔
تعلیم کے ساتھ ساتھ سرگودھا شہر کے شعراء سے بھی ملنے کا سلسلہ جاری کیا۔ شاعری پڑھنا اور کچھ کچھ
لکھنا بھی مشغلہ رہا۔ میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لیا تب بھی اس شغل کو جاری رکھا گریجوایشن کیا اور
پھر ملازمت میں آ گئے۔ بھکر قیام کے دوران کچھ ایسا ماحول ملا کہ شاعری کی روح سے اور جدید غزل
کی فطرت سے آگاہی ہوئی۔ یہاں خلیل رامپوری، منشا پانی پتی، شکیب جلالی اور رشک صدیقی جیسے
شعراء کی محفل میں آپ نے غزل کو ایک نیا رخ دینے میں معاونت بھی کی اور محنت بھی۔

ملازمت کے دوران جوہر آباد اور سرگودھا میں بھی قیام رہا تو ادبی حلقوں سے ملاقاتیں،
مشاعرے، مباحثے اور سیکھنے سکھانے کا سلسلہ کہیں بھی ٹوٹنے نہیں پایا۔ آپ کی زبانی ایک واقعہ میں

یہاں بیان کرنا چاہوں گا:

”کچھ لوگوں نے دانستہ آپ کو سامنے نہیں آنے دیا۔ پی ٹی وی والوں نے ان کا پروگرام ریکارڈ کیا۔ لیکن جناب احمد ندیم قاسمی اس کو آن سکرین لانے میں رکاوٹ بن گئے۔ صرف اس لئے کہ نصرت چوہدری کہیں آگے نہ نکل جائے۔“ ۳۷

یہ حقیقت ہے کہ نصرت چوہدری اگر ”زینہء صدا“ جیسی شاعری کو لے کر آگے بڑھتا تو شکیب سے آگے نکل چکا ہوتا لیکن اس ماحول سے کٹنے کے بعد اس کی شاعری میں وہ لطف برقرار نہیں رہ سکا۔ اگرچہ آج بھی آپ کے لاکھ اشعار چونکا دیتے ہیں۔ راقم نے آپ پر ایک مضمون میں لکھا تھا۔

”کسی ادیب یا شاعر کے بڑے پن کا فیصلہ آنے والا وقت کرتا ہے۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ لمبے ہاتھ پاؤں والے ادیب اور شاعر دور سے ہاتھ ہلا کر دیپ کو بچھا دیتے ہیں یا پھر اسی سے اپنا دیپ جلا کر منظر نامے پر زیادہ قریب رکھ دیتے ہیں۔ جبکہ دوسرے کو پیچھے دھکیل دیتے ہیں لیکن یہ کیفیت زیادہ عرصے تک نہیں رہتی اور ہوا کا تیز جھونکا وقت مقررہ پر منظر نامے کے دیپ کو اور منظر دونوں کو بچھا دیتا ہے۔“

نصرت چوہدری ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنی کٹیا میں بیٹھ کر چراغ روشن رکھے ہیں اس سے روشنی نکلی لیکن ادب کے حکمرانوں کو وہ روشنی چندھیادینے والی لگی تو اس پر پہرے بٹھا دیئے۔“ ۳۸

نصرت چوہدری نے ساری زندگی ایک بھرے پُرے خاندان کے باوجود سرگودھا میں اکیلے گزار دی۔ بچیاں وغیرہ گاؤں میں رہیں اور وہ شہر میں جہاں انہوں نے پڑھنے لکھنے کو ہی اپنا وطن بنا رکھا۔ آپ کے سات شعری مجموعے ”زینہء صدا“، ”دیا اور درخت“، ”حسن خوشبو روشنی“، ”پتے پھیل کے“، ”کروٹ اور انگڑائی“، ”دستک اور دریچہ“ اور ”ضرب خیال“ شائع ہو

چکے ہیں۔ جبکہ ”سفرِ عمرہ گرفتِ الفاظ میں“ عمرہ مبارک کے سفر کی روداد اور ”کچھ دیر پہلے نیند سے“ آپ کی مختصر سوانح حیات ہے۔ نیز آپ کی شخصیت اور فن کے بارے ”عروسِ غزل اور نصرت چوہدری“ کے عنوان سے اخلاق عاطف اور عنصر سہیل نے ایک کتاب مرتب کر کے کافی عرصہ پہلے شائع کرائی تھی۔ یونیورسٹی آف سرگودھا آپ کی شاعری اور شخصیت پر مقالہ بھی لکھوا چکی ہے۔ آپ نے ۲۶ مارچ ۲۰۱۰ء کو وفات پائی اور اپنے گاؤں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

غزل

گلدان سے جب مجھ کو ترن باس نہ آئی مجھ کو مرے کمرے کی ہوا راس نہ آئی
 میں کھول کے بیٹھا رہا آنکھوں کے درتے پھر بھی تری تصویر مرے پاس نہ آئی
 ہونٹوں کی فصیلوں پہ بھی میں دیپ جلاتا افسوس کہ وہ غیرتِ الماس نہ آئی
 لفظوں کو اجالوں کا لہو۔ پینا پڑے گا ذہنوں میں اگر گرمیء احساس نہ آئی
 تیروں کی طرح اس پہ برسنے لگی کرینیں جب خیمہء شبنم میں ہری گھاس نہ آئی
 اس آنکھ میں اک ایسی بھی تحریر تھی نصرت
 جس میں ابھی رنگینیء قرطاس نہ آئی ۲۳۹



ہو امیں چیختی پھرتی ہیں گھر مغموم لگتے ہیں مجھے اس شہر کے باسی بڑے مظلوم لگتے ہیں
 بڑے غصے میں ہیں بوڑھے شجر کی کس حماقت پر یہ پتے جو غزل کے شعر کا مفہوم لگتے ہیں
 یہ ہنتے کھلتے گلیوں کی زینت خوش نما چہرے کبھی تقدیر لگتے ہیں کبھی مقوم لگتے ہیں
 صداکانوں سے ٹکراتی ہے جب زخمی پرندوں کی تو نامعلوم اندیشے بھی پھر معلوم لگتے ہیں
 اٹھا کے ہاتھ جب موسم بدلنے کی دعا مانگیں صدا کے دیپ پھر ہر شاخ پر مرقوم لگتے ہیں
 کبھی جب قافلہ نصرت تھکن محسوس کرتا ہے
 تو پھر نقشِ قدم بھی ریت پر معدوم لگتے ہیں ۲۴۰

نواب مخمور

شیخ نواب علی نام اور مخمور تخلص ہے۔ آپ ۱۹۳۰ء میں موضع بھوانی ضلع حصار ۳۱ میں پیدا ہوئے۔ قبل ازیں راقم نے اپنی کتاب ”نعت گویان سرگودھا“ میں آپ کا سن ولادت ۱۹۱۵ء تحریر کیا ہے۔ جو پھلروان کے ایک معتبر شاعر افضل گوہر نے اندازاً بتایا تھا۔ گویا اب اُسکی تصحیح کی جا رہی ہے۔ شیخ نواب علی مخمور کے والد کا نام تھن۔ جو اپنا کاروبار کرتے تھے۔ حالات چونکہ اچھے نہیں تھے اس لئے نواب علی بھی تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ لیکن اُن کا مشاہدہ اور مطالعہ اُن کی شاعری کا سبب بنا۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ہجرت کی اور ضلع سرگودھا کے ادبی مرکز پھلروان کو اپنی جائے سکونت منتخب کیا۔ سعید دوشی کا کہنا ہے کہ:

”میں جب چھوٹا تھا تو انہیں دیکھتا کہ وہ بلا کسی لالچ کے لوگوں

کے کام کر رہے ہیں اور خوش باش زندگی گزار رہے ہیں۔“ ۳۲

شیخ نواب علی بہت خوبصورت اور اپنے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ استادانہ رنگ اُس میں سے صاف جھلکتا تھا۔ ایک مجموعہ ”پیر مغاں“ کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ جو شائع نہ ہو سکا۔ لیکن اب اس کلام کا کوئی پتہ نہیں کہ کہاں گیا اور کس کے پاس ہے۔ آپ نے شاعری میں حمد، نعت، نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی۔

راقم کو اُن کی قبر پر حاضری کا اتفاق ہوا تو اُن کی زندگی فوراً ذہن میں گھوم گئی۔ بوسیدہ اور خستہ قبر کی طرح اُن کی زندگی بھی گمنامی اور معاشی بد حالی میں جیسے گزری ہوگی اُسے سمجھنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئی۔ لیکن بہر حال اُن کا جو تھوڑا بہت کلام محفوظ ہے۔ یہ اُن کی موجودگی کا کسی نہ کسی حد تک احساس دلاتا رہے گا۔ ”آپ نے ۲۱ مارچ ۱۹۹۹ء کو پھلروان میں وفات پائی۔“ ۳۳

غزل

دن میں ہم ہوں گے کہاں رات کہاں گزرے گی

خوب گزرے گی تیرے ساتھ جہاں گزرے گی
 بے گناہی کا یقین پہلے دلاؤں ورنہ
 ”بدگمانی میں ہر اک بات گراں گزرے گی“
 یہ ہے تعبیر محبت کے حسیں خوابوں کی
 جو بھی گزرے گی باندازِ فغاں گزرے گی
 اب تو سایہ ہے نشیمن پہ ہرے پتوں کا
 ہوگا کیا حال کہ جب بادِ خزاں گزرے گی
 بے خطر چین سے فٹ پاتھ پہ سونے والے
 یہ بھی سوچا ہے کہ برسات کہاں گزرے گی
 بے مروت دلِ مخمور بہت نازک ہے
 بے رخی آپ کی یہ بارِ گراں گزرے گی ۳۳۳



کچے گھر میں بیٹھ کر محلوں کے منظر سوچنا
 بھول کر اوقات اپنی سنگِ مرمر سوچنا
 یوں تو اونچی سوچ بھی اچھی ہے یہ مانا مگر
 اپنے قد کو دیکھ کر اس کے برابر سوچنا
 مت بنائیں آپ اس ماحول میں شیشے کا گھر
 سر پھروں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں پتھر سوچنا
 اس کی میری سوچ کے انداز میں یہ فرق ہے
 میرا سوچا ہے اٹل اس کا مکرر سوچنا
 کر لیا جب تم نے اے مخمور پیمانِ وفا
 اب تو بس اس عہد کا پابند ہو کر سوچنا ۳۳۵

پروفیسر ساقی الحسینی

”ساقی الحسینی کا اصل نام ظہیر الحق تھا۔ لیکن خاندان کے لوگ انہیں انوار الحق کہا کرتے تھے۔ وہ ۱۹۲۸ء یا ۱۹۳۰ء میں تحصیل گوبانہ ضلع رتھک (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حافظ سید ظہور احمد تھا اور وہ سہارن پور کے رہنے والے تھے۔“ ۳۳۶

یہاں چونکہ ولادت کے حوالے سے دو سن دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے اگر کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے کہ وہ صحیح ہے تو میرا قیاس ۱۹۳۰ء پر جا کر ٹھہرے گا۔ گوبانہ ظہیر الحق کا ننھیال تھا۔ اور چونکہ سید ظہور احمد جلد ہی فوت ہو گئے تھے اس لئے سید ظہیر الحق کی پرورش اپنے دیگر بہن بھائیوں کے ساتھ نانی کے پاس ہی ہوئی۔ اسی شہر سے انہوں نے ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد اپنے بہن بھائیوں اور نانی کے ہمراہ پاکستان میں آئے۔ اور ملتان میں رہائش پذیر ہوئے۔ ساقی الحسینی نے گورنمنٹ گرلز ٹیڈل سکول لیہ سے بطور کلرک اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ جسے بعد میں ہائی سکول کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کے بعد آپ کا تبادلہ مظفر گڑھ ہو گیا۔ جعفر بلوچ ان کی تعلیمی محنت شاقہ کے بارے لکھتے ہیں کہ:

”ان ملازمتوں کے ساتھ ساتھ ساقی صاحب اپنی تعلیم کی تکمیل کے لئے بھی کوشاں رہے۔ چنانچہ غالباً ۱۹۵۵ء میں انہوں نے ایف۔ اے اور ۱۹۵۷ء میں بی۔ اے کے امتحانات پاس کر لئے۔ ایک گروپ فوٹو سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۷-۸ء میں ساقی صاحب نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی۔ ایڈ کیا۔۔۔ غالباً ۱۹۶۰ء میں ساقی صاحب نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔ اے اردو کا امتحان پاس کیا۔“ ۳۳۷

جب ایم اے پاس کیا تو اس وقت تک آپ گورنمنٹ ہائی سکول خانیوال میں بحیثیت استاد

تعیانات ہو چکے تھے۔ اور پھر آپ نے لیکچررشپ کے لئے کوشش کی جس میں کامیابی پر گورنمنٹ انٹر کالج ملتان میں ان کا تقرر ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں آپ کا تبادلہ کوئٹہ ہو گیا اور جب ۱۹۷۰ء میں ون یونٹ ختم ہوا تو انہیں گورنمنٹ کالج سرگودھا میں بھیج دیا گیا۔ جہاں آپ زندگی کے آخری لمحات یعنی وفات ۲۳ اگست ۱۹۷۴ء تک رہے۔ آپ سے قبل آپ کی زوجہ نے بھی سرگودھا میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئیں۔

ساقی الحسینی اردو نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا کے علمی و ادبی مجلہ ”ضیابار“ کے ایڈیٹر بھی رہے اور اس مجلہ میں آپ کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ لیکن آپ کی تمام نگارشات پر پردہ پڑا رہا۔ یہاں تک کہ ۲۴ سال بعد چند ایک تحریریں پروفیسر فیاض احمد فیاضی (یونیورسٹی آف سرگودھا) کی وساطت سے تلاش کر کے جعفر بلوچ نے ”اشارات“ کے عنوان سے انہیں ترتیب دیا۔

جناب ساقی الحسینی ایک استاد، ایک عالم، ایک ادیب، ایک شاعر اور ایک نقاد تھے۔ پروفیسر ساقی الحسینی کے شاعر ہونے کی تصدیق ڈاکٹر عاصی کرناالی کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ:

”ساقی الحسینی کیونکہ شاعر ہیں اس لئے ان کے اسلوب میں ثقالت اور کھر درے پن کی بجائے ایک شاعرانہ دلکشی اور دلنوازی کی شان ملتی ہے۔“ ۳۳۸

اور وہ شان کیا ہے بس ایک ہی دستیاب نظم اور چند اشعار سے اخذ کر لیجئے۔

مذراقبال

اے شاعر سرشار مئے حکمت و عرفان ہر شعر ترا آئینہ علم فراواں
 آنکھوں میں تری شاہد کونین کے جلوے ہاتھوں میں ترے لیلی آفاق کا دامان
 ادراک پہ چھایا ہوا احساس کا بادل جذبات کا سینے میں نہاں بحر خروشاں
 ہر لرزشِ مژگاں میں بصیرت کا ترنم ہر جنبشِ لب میں تری اسرار غزل خواں
 اندیشہ ترا نور فشاں صورتِ قدیل گفتار منور، صفتِ شمعِ فروزاں

ضوبار خیالات کے چھٹکے ہوئے تارے ظلمت کدہ دہر میں ہے جن سے چراغاں
تخیل تری پردہ کشائے رخ ہستی تدبیر تری شانہ کش گیسوئے دوراں
کارخ امراء پر کبھی افکار کی یورش تقریر کا موضوع ہے کبھی مرد کہستاں
تفید کی زد میں کبھی پیرانِ شکم سیر عنوانِ مباحث ہے کبھی چہل فقیہاں
یوں ربط دیا تو نے حکایاتِ جنوں کو اک خواب پریشاں ہوئیں آیاتِ حکیمان
ہر دل کو منور کیا قندیلِ خودی سے انساں ہوا خودداری انساں کا نگہباں

اب فیض سے تیرے ہے سرِ جادہ منزل

حیرت کدہ دہر میں بھٹکا ہوا انساں ۳۹

انتخاب

عرش والے مری افتاد کی عظمت دیکھیں تارے تارے پہ مرا نقشِ کف پا ہو گا
دوستو فکر کہ تنویرِ سحر سے پہلے رنگِ رخسارہ شب اور بھی گہرا ہو گا
خوئے تسلیم نے انساں کی تراشے ہیں یہ بت ورنہ کیا تختِ کیاں، تاجِ سلیمان بنتے
یہ تو آواز تمہاری تھی کہ ہم لوٹ آئے حادثے کیا سبب ترکِ گلستاں بنتے
یاد آتے ہیں جو گزرے ہوئے لمحات کبھی چند سائے سے گریزاں نظر آتے ہیں مجھے
قصہ زیت میں ترتیب کہاں سے لاؤں ان کے گیسو جو پریشاں نظر آتے ہیں مجھے
زمانہ جانتا ہے ساقیِ الحسینی کو
یہ شخص مرتبہ دان بہار گزرا ہے ۵۰

ڈاکٹر جی ایم اکمل

غلام مرسلین نام، اکمل تخلص اور ہومیو پیتھک ڈپلومہ ہولڈر ہونے کے باعث ڈاکٹر سابقہ

استعمال کرتے تھے۔ ”۱۰۰ مشہور شعراء“ ۱۹۵۱ء کے مطابق آپ ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ لیکن شاید یہ سن ولادت غلطی سے لکھا گیا ہے۔ کیونکہ آپ اپنے بارے خود لکھتے ہیں کہ :

”۱۵ جنوری ۱۹۲۱ء کو کسی ساعت میں سرگودھا کے ایک نواحی دیہات میں پیدا ہوا۔ والد بزرگوار کا نام علی محمد ہے..... والدین نے بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا اور پانچ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم کی غرض سے اسکول میں داخل کرادیا لیکن اسکول کی تعلیم راس نہ آئی اور خود اپنے ذوق کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ کثرت مطالعہ نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا اور نتیجہ میں میری تحریر پختہ ہوتی گئی۔ ادبی جرائد کا مطالعہ میرے دے ہوئے جذبات کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوا۔ چونکہ اساتذہ سخن کے دوادین کو اچھی طرح پڑھ چکا تھا اس لئے فطری رجحان پر شعر و شاعری کا بہت اثر ہوا اور شعر موزوں ہونے لگے۔ ایک سال کے قلیل عرصہ میں پنجاب یونیورسٹی کے تین امتحانات، منشی فاضل، ادیب فاضل، اور میٹرک پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے امتیازی نمبروں میں پاس کئے۔ اس کے بعد مولوی فاضل، ایف اے اور ہومیو پیتھک کی ڈگریاں بہترین نمبروں سے حاصل کیں۔ میرے مضامین اور منظومات مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔“ ۱۹۵۲ء

نجانے آپ نے سرگودھا کے اُس نواحی دیہات کا نام کیوں نہیں لکھا جس میں آپ کی پیدائش ہوئی تھی۔ جبکہ ڈاکٹر محمد منیر سلج نے تاریخ پیدائش میں تھوڑی سی تبدیلی یعنی ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کے ساتھ اُس جگہ کا نام بھاگٹانوالہ ۱۹۵۳ء تحریر کیا ہے۔ اور اس کی تصدیق جی ایم اکمل کی اس تحریر سے کی جاسکتی ہے کہ:

”۲۳ جنوری ۱۹۳۹ء کو میرے اہتمام سے بھاگٹانوالہ ضلع سرگودھا میں مشاعرہ ہوا جس کی صدارت جناب سید اصغر علی شاہ احسن ڈپٹی

انسپکٹر آف سکولز اور اولپنڈی ڈویژن نے فرمائی تھی۔“ ۳۵۴

اس مشاعرے کا ذکر کبھی کبھی احباب کی محفلوں میں ہمارے بزرگ شعراء آج بھی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ شاید اس سے پہلے یا اس کے بعد ایسا مشاعرہ بھاگٹا نوالہ میں دیکھنے میں نہیں آیا۔
جی ایم اکل نے جب شعر کہنا شروع کیا تو کچھ عرصے بعد اپنی ایک نظم مولانا غلام رسول مہمدی انقلاب کو اصلاح کیلئے بھیجی جس پر انہوں نے اپنی رائے دی :

”عزیزم اکل صاحب نے جب مجھے اپنی ایک نظم بغرض

اصلاح دکھائی تو میں فرط حیرت سے استعجاب میں رہ گیا کیونکہ بجائے خود یہ

نظم قادر الکلامی اور پختہ ذہنی کی بین دلیل ہے۔ توقع ہے کہ موجودہ دور کے

بہترین ادباء اور شعراء میں موصوف جگہ حاصل کر لیں گے۔“ ۳۵۵

جی ایم اکل نے اگرچہ ہومیو پیتھک میں ڈپلومہ بھی لے رکھا تھا اور اسے بطور پیشہ استعمال

کر سکتے تھے لیکن آپ نے تدریس کو اپنایا اور ہائی سکول بھاگٹا نوالہ میں عربی ٹیچر کے طور پر فرائض ادا

کرتے رہے۔ یہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد آپ بھکر چلے گئے۔ ”جہاں آپ نے ۴ اگست ۱۹۹۴ء

کو وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔“ ۳۵۶

جی ایم اکل ایک شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، اور مضمون نگار تھے۔ آپ کے دو

ناول ”منچلا جوان“ اور ”حریم ناز“ شائع ہو چکے ہیں۔ جبکہ آپ کی غیر مطبوعہ کتب میں ”شاخ نبات“،

”گل نسرین“ اور ”خوشہ پروین“ شعری مجموعے ۳۵۷ ہیں۔ ہارجیت، شرط، اور بکھرے گیسو آپ کے

ڈرامے ہیں۔ جن میں سے مؤخر الذکر دونوں سٹیج ہو چکے ہیں۔ اصنافِ سخن میں آپ نے کوئی موضوع

تشنہ نہیں چھوڑا۔ نظمیں، غزلیں، رباعیات، قطعات سبھی کچھ کہا۔ نمونہء کلام ملاحظہ فرمائیے

عجب افتادیہ دل پر پڑی ہے نظر اک بے مروت سے لڑی ہے

نہ حرف آئے محبت پر مبادا دلِ ناداں سنبھل منزل کڑی ہے

رگینیاں شباب کی پیری میں آئیں یاد فصلِ خزاں میں شوق ہے موسم بہار کا

شگونی پھوٹنے پائے نہ تھے دور خزاں آیا تماشا ہے کہ قبل از وقت وقت امتحاں آیا
 بستر کے قریب آ کے جو نہی پوچھی طبیعت منہ پھیر لیا اور کہا تم کو غرض کیا
 تصور ہی تصور میں ملاقاتیں ہوئیں ان سے شبِ فرقت بھرے تھے پھول کانٹے میرے دامن میں
 دونوں جہاں کے عیش ہیں میرے نصیب میں مجھ کو نہ چھیڑ محو ہوں ذکرِ حبیب میں
 ہوا بدلی ہے اکمل آج کل کچھ ایسی زنداں کی ہر اک قیدی جنوں میں کر رہا ہے چاک دامن کو
 چند روزہ زندگی سے تو نے حاصل کیا کیا بسترِ غفلت سے اٹھ اکمل مآل کار سوچ
 جس وقت کہ سر پر پڑتی ہے اُس وقت خدا یاد آتا ہے دستور یہی ہے دنیا کا آرام میں کیا یاد آتا ہے
 یاد ہے تیری محبت کا وداعی پیغام چند قطرے جو پسینے کے جبیں سے چھلکے ۴۵۸

ظہیر الدین ظہیر

ظہیر الدین جو استاد ظہیر کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے۔ ۱۱۹۰ء اپریل ۱۹۳۱ء کو انبالہ شہر
 کے محلہ قاصی واڑہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ابھی طالب علم تھے جب آزادی کی لہر اٹھی اور
 مسلمانوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ خطہ حاصل کیا۔ اس دور میں ظہیر الدین نے بھی اپنے والد وزیر
 محمد اور دیگر اہل خاندان کے ساتھ مہاجریت کی اور سرگودھا میں آ کر مقیم ہوئے۔ اور یہیں انبالہ مسلم
 ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ گردشِ روزگار کا شکار رہے اور پھر محکمہ انہار میں
 ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں رشک ترابی جیسے انقلابی شاعر کی رفاقت میسر رہی۔ اگرچہ آپ کے اندر
 ایک شاعر موجود تھا جو کبھی کبھی سراٹھاتا لیکن آپ اسے کوئی اہمیت نہ دیتے اور پھر ۱۹۵۱ء میں وہ شاعر
 ظہیر بن کر ظہیر الدین کے مقابل آکھڑا ہوا۔ لہذا ظہیر الدین نے یہ ملازمت قبل از وقت چھوڑ دی اور
 ریٹائرمنٹ سے پہلے آپ چونکہ ڈرافٹسمن تھے لہذا اسی کو لے کر آگے بڑھے اور آرٹ کو ہی اپنا پیشہ
 بنا لیا۔ پھر کمرشل آرٹسٹ کی حیثیت سے بہت نام کمایا۔ اسی طرح شاعری کے میدان میں بھی آپ کی
 عزت افزائی ہوئی۔

ظہیر الدین ظہیر فن کا شخص تھا۔ لہذا فن کسی بھی صورت میں ہو وہ فن ہی ہوتا ہے۔ اور جب آرٹ میں شاعری اور شاعری میں آرٹ مل کر یکجان ہو جائیں تو لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ظہیر کی تین کتابیں ”سائبان“، چاہتوں کے گلاب“ اور ”نعتِ مصطفیٰ“ شائع ہوئی ہیں۔ یہاں ان کی شاعری کے وہی ہونے سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن کسی طور پر ایک کمی کا احساس بہر حال رہتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ظہیر نے مطالعہ کو کچھ زیادہ وقت نہیں دیا۔ مطالعہ سے سوچ اور فکر میں ایک نکھار پیدا ہوتا ہے اور اسی کے اثرات شاعری پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ جو اگلی منزلوں کی طرف رہنمائی کرتے اور لے کر جاتے ہیں۔ بلکہ یہاں میں ظہیر کے سکول اور جوانی کے دوست رشک ترابی کے الفاظ دہرانا چاہوں گا:

”ظہیر بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔ اور وہ اس میدان

میں کسی سے متاثر نظر نہیں آتا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کے پاس کوئی

لمبی چوڑی لائبریری نہیں اور نہ ہی وہ وسیع مطالعے پر یقین رکھتا ہے۔ ظہیر ان

شعراء کے زمرے میں نہیں آتا جن سے متعلق قیصر بارہوی نے لکھا ہے۔

الفاظ چن رہے ہیں صحیفوں کے کھیت سے کتنے ہنر سے فصل ہنر کاٹتے ہیں لوگ

مطالعہ کے میدان میں ظہیر کی بے بضاعتی کو سامنے رکھیں تو یہ بات واضح ہو

جاتی ہے کہ ظہیر کی شاعری کسی نہیں وہی ہے۔ بقول غالب ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں“ ۲۵۹

ظہیر الدین ظہیر نے غزل کے علاوہ نظم بھی کہی ہے۔ قطعاً بھی کہے۔ حمد و نعت سے بھی

روح کی طراوت کا سامان کیا اور نعمات سے بھی دل کو بہلایا۔ لیکن غزل پر بہر حال انہیں مکمل عبور تھا۔

استاد ظہیر نے ۸۱ سال اس دنیائے ثبات میں گزار کر ۱۲ اپریل ۲۰۱۱ء بروز بدھ کو وفات پائی اور بڑے

قبرستان میں دفن ہوئے۔

غزل

کہاں ملا تھا وہ اک بے وفا خدا جانے وہ ایک خواب تھا یا حادثہ خدا جانے

جسے بھی دیکھو وہ تنہا دکھائی دیتا ہے
 ہمیں تو کوئی کنارہ نظر نہیں آتا
 چمن میں پھول بھی ہوتے ہیں اور کانٹے بھی
 نہ بات کرتا ہے ظالم نہ مسکراتا ہے
 مرے نصیب میں کیا ہے میں کیسے بتلاؤں
 مرے نصیب میں کیا ہے مرا خدا جانے
 قسم تو کھا کے مرے ساتھ وہ چلا تھا ظہیر
 بدل گیا ہے وہ کیوں راستہ خدا جانے ۲۶۰



ہر شخص اک سوال ہے سمجھے اگر کوئی
 ہر آنکھ میں ہے چاند ستاروں کی رہ گزر
 مرنے کا حوصلہ بھی نہیں پاس کیا کریں
 شہر جنوں کی سمت چلیں سرخ آندھیاں
 زخمی پروں پہ لے کے اڑا ہوں بدن کی لاش
 اشعار کی زبان میں دل کی حکایتیں
 اپنا تو یہ کمال ہے سمجھے اگر کوئی
 کتنا بڑا زوال ہے سمجھے اگر کوئی
 ہر ہاتھ ایک جال ہے سمجھے اگر کوئی
 جینا بھی اب محال ہے سمجھے اگر کوئی
 اہل خرد کی چال ہے سمجھے اگر کوئی
 کیا رنج کیا ملال ہے سمجھے اگر کوئی
 اپنا تو یہ کمال ہے سمجھے اگر کوئی
 بیٹھے ہیں دل میں زخمِ جدائی لئے ظہیر
 ظاہر تو اپنا حال ہے سمجھے اگر کوئی ۲۶۱

ضامن علی حیدری

السید ضامن علی حیدر کبھی ضامن علی حیدری، سلسلہ وارثیہ سے بیعت، آپ کا پیدائشی نام محمد یار ہے۔ آپ ۸ مارچ ۱۹۳۲ء کو ادنیٰ تحصیل بھلووال ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کھیتی باڑی کرتے تھے۔ آپ نے میٹرک کرنے کے بعد پنجابی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ آپ کو

اول عمری میں ہی گاؤں سے نکلنا پڑا۔ اور پھر زندگی کا زیادہ حصہ فیصل آباد اور ساہیوال میں گزارا۔ ساہیوال میں آپ کو مجید امجد کی ہمسائیگی میسر آئی تو شعری ذوق جو آپ کے اندر پنپ رہا تھا۔ شعر بن کر سامنے آ گیا۔ آپ نے صحافت کے شغل کو بھی اپنایا اور ساری زندگی اس سے منسلک رہے۔ آغاز آپ نے روزنامہ ”زمیندار“ سے کیا۔ آپ نے سٹیٹ لائف انشورنس میں بھی ملازمت کی۔ رموز شاعری عبدالرشید اشک سے سیکھے۔ اردو، پنجابی اور فارسی زبانوں کو اپنے اظہار کے لئے استعمال کیا۔ صحافت اور شاعری دونوں میں آپ نے مزاحمتی رویہ اختیار کیا۔ کچھ عرصہ آپ کو جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔

ضامن علی حیدری نے جب شاعری شروع کی تو مستان علی حیدری کے نام کو اپنے لئے بہتر سمجھا۔ لیکن بعد میں ضامن علی حیدری کے قلمی نام میں تبدیل ہو گئے۔ کچھ عرصہ تو آپ شاعری میں سرگرم رہے۔ پھر ایک خاموشی چھا گئی۔ واپسی سرگودھا آنے کے بعد اس وقفے کو ختم کر دیا ہے اور پھر آپ مختلف رسائل میں دکھائی دینے لگے اور یہ سلسلہ وفات تک جاری رہا۔ واپسی پر آپ سرگودھا شہر میں رہائش پذیر ہو گئے تھے جہاں ۲۷ جنوری ۲۰۱۲ء کو وفات پائی آپ کا کلام رسائل میں اتنا بکھرا پڑا ہے کہ یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم مجموعہ کلام بن سکتا ہے۔ محمود اسیر آپ کے بارے لکھتے ہیں:

”ترقی پسند ادب میں آپ کا نمایاں حصہ ہے۔ اپنے نظریات کی

وجہ سے اکثر زیرِ عتاب رہے ہیں اور چار بار تحفظِ امنِ عامہ آرڈینس کے تحت

تحریر، تقریر اور نظموں پر پابندی عائد ہوئی جس کی پاداش میں آپ کو خاصی

مدت جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کی ہوا کھانا پڑی آپ کی شاعری،

بھوک، وافلاس، بے چینی اور انقلاب کی شاعری ہے۔

ضامن ایک درد مند دل کے مالک ہیں اور کچلے ہوئے، بے حال، مظلوم اور

پسماندہ طبقات کے نمائندہ شاعر ہیں“۔ ۶۲

غزل

ایک زمانہ بیت گیا ہمدرد وہی غم خوار وہی
 درد وہی ہے ٹیس وہی ہے، زخم وہی آزار وہی
 بال سفید ہوئے تو کیا یہ دل تو سرخ ابھی تک ہے
 آوارہ گردی، شب باشی، سگی، ساتھی، یار وہی
 مٹی کی خوشبو نے مجھ کو کوسوں دور سے کھینچ لیا
 پھر وہی کچے پکے رتے گاؤں کے بازار وہی
 برسوں سے اک عادت سی ہے کل کو جانے کیا ہوگا
 انجانا سا خوف وہی ہے سوچوں کا انبار وہی
 قصبوں قصبوں شہروں شہروں پھرتے رہنا عادت ہے
 فٹ پاتھوں پر بیٹھے رہنا اپنا کاروبار وہی
 عزم سفر ہے ضامن حیدر پہروں سوچتا رہتا ہوں
 کتنے ہی سر پھوٹ گئے ہیں لوہے کی دیوار وہی ۲۶۳



ہزاروں دکھ ملے ہیں آگہی میں بڑا ہی لطف تھا اس گم رہی میں
 خدا جانے وہ کب گزرے ادھر سے کھڑا ہوں کب سے نکر پر گلی میں
 وہ شاید مہربان ہونے لگی ہے کوئی تو راز ہے خندہ لبی میں
 مری اک عمر کا یہ تجربہ ہے سکون دل کہاں ہے عے کشی میں

دلوں کے بھید سے واقف ہوں ضامن

زمانہ ہو گیا ہے عاشقی میں ۲۶۳

سید تاجدار دہلوی

سید مصطفیٰ حسین نام تاجدار تخلص اور دہلی کی نسبت سے دہلوی کا دم چھلا ساتھ لگایا ہوا تھا جبکہ دہلی ان کی جائے پیدائش بھی نہیں تھی۔ ”آپ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کو سادات باہرہ ضلع مظفر گڑھ (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔“ ۱۹۵۰ء آپ کے بارے کہا جاتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں کافی ذہین تھے۔ آپ نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد آپ نے ہجرت کی اور سرگودھا کو مسکن بنایا۔ یہاں آپ نے کاروبار حیات کے رخ بدل بدل کر دیکھے۔ کبھی ٹھیکیدار بنے۔ کبھی اسٹیٹ ڈیلر بنے۔ کبھی سیاست کے میدان میں نعرے بازی کی اور کبھی صحافت کی کرسی پر بیٹھے لیکن ان تمام سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ شاعری کو اس کا وقت دیا۔ اس حد تک کہ سرگودھا کا کوئی مشاعرہ آپ کی حاضری کے بغیر مکمل نہیں گردانا جاتا تھا۔ اہل زبان تو وہ تھے ہی۔ اُن کا انداز شعر خوانی بھی دلکش تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ جب وہ شعر پڑھتے تو آواز کے جادو سے سامعین کو مبہوت کر دیتے تھے۔ شعر بھی اچھا کہتے تھے فن پر بھی گرفت تھی جس بنا پر انہیں اساتذہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ جبکہ وہ خود استاذ الشعراء جناب سیما ب اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔

صحافت میں وہ ”دعوت عمل“ کے مدیر رہے۔ ہفت روزہ ”سلطان“ اور مزارع“ کے بھی مدیر رہے۔ محمود اسیر اُن کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”تاجدار دہلوی سرگودھا میں تاجدار سخن کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کی فنی کاوشوں کا نچوڑ ہے کہ ان کی زبان دوسرے شعراء سے صاف اور سلجھی ہوئی ہے۔ اُن کی غزل منفرد اسلوب کی حامل ہے۔ آپ نے ہر موضوع سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ وہ ایک پختہ گو، مستند استاد اور نظم گو شاعر ہیں۔“ ۲۶۶

بقول یوسف خالد : رشک مرحوم کا کہنا تھا کہ

تاجدار دہلوی اور میں اگر مشاعرہ میں ہوں تو رشکِ عرش پر ہوتا ہے اور
 تاجدار فرش پر۔ لیکن محفل میں تاجدار عرش پر ہوتا ہے اور رشکِ زمین پر“ ۱۷۷
 تاجدار دہلوی کا کلام کہاں ہے۔ کس کے پاس ہے؟ یہ الگ بات ہے جن اخبارات او
 رسائل میں جو کلام مل سکتا ہے وہ جمع کرنا ضروری ہے۔ تاکہ تاجدار دہلوی کو عملاً اُن کے کلام سے
 آئندہ اورتی پر زندہ رکھا جائے نہ کہ صرف دو چار اشعار یا غزلوں کے حوالے سے۔ اور وہ دو چار
 غزلیں سخنورانِ سرگودھا اور ”نقوشِ سرگودھا“ تک ہی محدود ہیں۔
 تاجدار دہلوی جیسا شعلہ نوا شاعر ۱۶ مئی ۱۹۸۵ء تا ۱۸ مئی کو سرگودھا کی شعری محفلوں کو ”سُنجا“
 کر کے عدم کو سدھا گیا۔ لیکن اُن کی قبر پر موجود کتبہ میں جو وفات کی تاریخ رقم ہے وہ ۱۵ مئی ہے۔
 ۱۷۹ء تو ثابت ہوا کہ ۱۶ مئی کی تاریخ اخبار سے لی گئی ہے اور اس پر سوچنے کی زحمت نہیں کی گئی۔

غزل

دشتِ تنہائی میں یوں احساس کے جگنو اڑے
 زخم کھا کر جس طرح دہشت زدہ آہو اڑے
 کتنے ارماں قبہبہوں کی گونج میں گم ہو گئے
 کتنے گل چہروں کے رخساروں سے رنگ و بو اڑے
 آبرو کے عرش پر ہم نے کمندیں ڈال دیں
 ہم زمانے میں بزورِ قوت بازو اڑے
 کیا بھروسہ کاغذی پھولوں کے رنگِ زاد کا
 کون جانے ان کے گلدستوں سے کب خوشبو اڑے
 جگمگا اٹھا سرِ فردوسِ فانوسِ خیال
 جب مری بانہوں کے حلقے میں ترے گیسو اڑے
 ایک آسودہ تبسم کی کرن کے واسطے

زندگی بھر اس بھری دنیا میں ہم ہر سو اڑے
میں ستاروں کو بھی گردِ راہ سمجھوں تاجدار
میرے بازو سے اگر بازو ملا کر تو اڑے۔ ۱۷۱



میں اپنے دامانِ دل سے داغِ شکستِ ہستی مٹا رہا ہوں
بڑے سکوں سے انی پہ نیزے کی بیٹھ کر مسکرا رہا ہوں
زمانہ کروٹ بدل رہا ہے، شبابِ ظلمات ڈھل رہا ہے
افق کی تاریک وادیوں میں سحر کے آثار پا رہا ہوں
بزیرِ تیغِ ستم گلو ہے، مگر مجھے پاسِ آبرو ہے
کہ گیت اپنے وطن کی عظمت کے زیرِ لب گنگنا رہا ہوں
میں ایک قطرہ ہوں آبِ بھوکا، میں ایک ذرہ ہوں خاکِ بھوکا
صدف کی پہنائیوں میں گھر کر بھی روز و شب جگمگا رہا ہوں
کبھی مہ و مہر و کہکشاں میں، کبھی پہاڑوں کے درمیاں میں
خدا کے فضل و کرم سے اپنے قد و مہمت بڑھا رہا ہوں
ہے کس قدر تاجدارِ صادق یہ میری حالت بقولِ شاعر
”ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغِ اپنا جلا رہا ہوں“ ۱۷۲

ارشادِ عظمت

مرزا محمد ارشاد المتخلصِ عظمت ۱۹۳۲ء میں ہندوستان کے شہر انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ایک
عام سے خاندان سے متعلق تھے۔ جہاں حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ تعلیم حاصل کریں۔ قیامِ
پاکستان کے بعد آپ نے ہجرت کی اور سرگودھا آ گئے۔ ہجرت کے دوران آپ جن مشکلات اور

تجربات سے گزرے انہوں نے آپ کو سوچ اور اظہار کی نئی راہیں دکھائیں۔ اور آپ شعر کہنے لگے۔ کاروبار حیات چلانے کے لئے کوٹ فرید میں پان سگریٹ کی ایک دکان بنالی اور اسی سے گزراوقات کرتے رہے۔ زندگی میں بہت کم شعر کہے۔ بس جب کوئی ٹھیس پہنچی اور جذبات مشتعل ہوئے تو بھڑاس نکال لی۔ ورنہ خاموشی سے صبح شام ایک ہی روش پر زندگی کو گامزن رکھا۔ ساری زندگی کوئی ساتھی بھی نہیں بنایا۔ سخنوران سرگودھا میں آپ کے بارے میں تحریر ہے کہ:

”ارشاد نے اگرچہ اکتسابی علم حاصل تو نہ کیا۔ مگر زمانے کے

نشیب و فراز اور تجربات نے اُسے اس علم سے روشناس کروا دیا ہے جسکا بار شاید کتابوں کے اوراق نہیں اٹھا سکتے۔ اس علم اور آگاہی کی روشنی میں وہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی اس تاریکی کو دور کرنے کی کوشش میں مصروف ہے جو تقسیم ہند کے بٹوارے کے وقت ایک مشعل کا مقام رکھتی تھی“۔ ۱۹۸۲ء

جناب ارشاد عظمت کی تنہائی کا سفر ۲ مئی ۱۹۸۲ء کو اختتام پذیر ہوا۔

نعت شریف

ہو کیوں نہ ذکر یہاں پر ترا سدا کے لئے یہ کائنات بنی ہے تری ثنا کیلئے
ترستے آئے ہیں دنیا کے بادشاہ ان کو خدا کے ہاں ہیں جو رتبے ترے گدا کے لئے
ہزار شکر کہ ہر شے نصیب ہے، لیکن ترس رہا ہوں ترے شہر کی ہوا کے لئے
مجھے بھی اذنِ مدینہ ملے کبھی آقاؐ یہ کوئی بات نہیں ہے تری عطا کے لئے
اے عازمینِ مدینہ ! ذرا ٹھہر جاؤ میں لفظ ڈھونڈ رہا ہوں ابھی دعا کے لئے

کہاں یہ رحمتِ الہام اور کہاں عظمت

یہ شعر مجھ کو ہوئے ہیں تری ثنا کے لئے ۱۹۸۲ء



کبھی وہ دن بھی آئے گا اجالا پھیل جائے گا

یقیناً زور ٹوٹے گا کبھی غم کی گھٹاؤں کا
 کبھی تو بے ضمیروں کے ضمیر انگڑائیاں لیں گے
 کبھی تو آہی جائے گا جواب اپنی صداؤں کا



کسی کا فسانہ کسی کی حقیقت فضا گنگناتی رہی ہے ہمیشہ
 ترے لب رہے چپ مگر آنکھ تیری فسانہ سناتی رہی ہے ہمیشہ ۱۹۷۴

رشک تراپی

احمد حسین نام اور رشک تخلص ہے۔ آپ ۲ مارچ ۱۹۳۳ء ۱۹۷۵ء کو قصبہ کانتھال تحصیل دسواہ ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد حسین کا نسبی تعلق رام چندر جی سے ملتا ہے۔ تعلیم کی ابتدا گاؤں سے ہوئی اور اسی دوران جب کہ چوتھی جماعت میں تھے شعر کہنا شروع کیا۔ اور اپنے لئے زخمی تخلص اختیار کیا۔ تقسیم ہند پر ہجرت کی اور سرگودھا شہر میں آ کر آباد ہوئے۔ یہیں ۱۹۵۰ء میں اسلامیہ خالقیہ ہائی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب آپ نے ہجرت کی تو آپ کی عمر ۱۸ سال بتائی جاتی ہے۔ یوں اگر حساب کیا جائے تو ۱۹۲۹ء سال پیدائش بنتا ہے جبکہ طارق محمود اُن کے غیر مطبوعہ شعری مجموعہ ”عکس جمیل“ کے مطابق سن ولادت ۱۹۳۳ء ۱۹۷۶ء بھی تحریر کرتے ہیں لیکن وہ ہارون الرشید کی دی گئی تاریخ محررہ بالا سے متفق ہیں۔ جو انہوں نے رشک صاحب سے ہی لی تھی۔ جناب احمد حسین زخمی نے کالج میں داخلے کے بعد شاعری میں الطاف مشہدی کے سامنے زانوائے تلمذتہ کیا جس پر استاد نے اُن کا تخلص زخمی سے رشک کر دیا اور آپ نے اپنے لئے انقلابی کالاقہ پسند کیا۔ اور رشک انقلابی بن گئے۔ ایف اے میں ہی تھے کہ والدہ انتقال کر گئیں جس کے باعث تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اور ملازمت اختیار کر لی۔ شاعری کا سلسلہ جاری رہا اور غزل آپ کی

پسندیدہ صنفِ سخن رہی۔ جس میں آپ نے بڑی عمدہ سوچ کی حامل غزلیں دیں۔

یوں مرے ذہن میں افکار کے آہو ٹھہرے جیسے رخسار کی ڈھلوان پہ آنسو ٹھہرے
زندگی میری ہے اس بادِ معطر کی طرح جو گزر جائے مگر راہ میں خوشبو ٹھہرے
قربتیں شرعِ محبت کے منافی کب ہیں آ بھی جاؤ کہ یہ تکرارِ من و تو ٹھہرے
دیدنی ہوتا ہے اس وقت دلوں کا عالم برق جب آ کے تہِ سایہ گیسو ٹھہرے
آج بھی کرب کے صحرا سے صدا آتی ہے اب کوئی تشنہ مسافر نہ لبِ جو ٹھہرے
آنکھ کی جھیل میں اظہار کا سیلاب رُکا دل کے گوشے میں تمناؤں کے جگنو ٹھہرے

مجھ سے یہ کہہ کے بگولے مرے ہمراہ چلے

ہم ٹھہر جائیں گے اے رشک جہاں تو ٹھہرے ۱۹۶۰ء

۱۹۶۰ء میں آپ نے حضرت ابوانیس محمد برکت علی لودھیانویؒ کی بیعت کی۔ اُن کی تعلیمات اور ہدایت و شخصیت نے آپ کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ آپ کا مزاج اور فطرت تبدیل ہو گئے اور اسی طرح شاعری نے بھی رنگ بدل لیا غزل کی جگہ حمد و نعت نے لے لی۔ قرآن مجید فرقانِ حمید کے مطالعہ اور سوجھ بوجھ نے دل اور ذہن کو وسعت دی۔ اس پر سیرتِ رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کی سوانح کے مطالعہ نے اُن کے سامنے مضامین کے ڈھیر لگا دیئے۔ الطاف مشہدی کی فنی اور صوفی برکتِ بعلیٰ کی روحانی تربیت نے رشک انقلابی کو رشکِ تراپی بنا کر پیش کیا۔

بلکہ اس سے بھی آگے نکل کر وہ اپنی طبعِ رسا کو اپنا نہیں کہتے بلکہ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ

یہ میرا حسنِ تکلم، یہ میری طبعِ رسا کرم ہے سرورِ دیں کا، عنایتِ رب ہے

میرے کلام میں اغلاط ڈھونڈھنے والو مرا طریقِ عبادت ہے شاعری کب ہے

رشکِ تراپی کے حافظے اور اُنکے اندازِ شعر گوئی کو جہاں داد دینی پڑتی ہے وہاں اُن کے

شعر کی کشش اور گرفت اتنی مضبوط ہے کہ قاری اس سے بچ کر نکل نہیں سکتا وہ خود اپنی زندگی میں سٹیج پر

جب پڑھ رہے ہوتے تھے تو لگتا تھا کہ اشعار کا نزول ہو رہا ہے یا پھر جب نصرتِ فتح علی خان کی آواز

میں یہ الفاظ سماعتوں سے ٹکرائیں تو قافلے رک جاتے ہیں۔

ہر سمت ہے تیری دھوم یا حئی یا قیوم
تو حاکم میں محکوم یا حئی یا قیوم

اسی طرح رشک تراہی کا کلام جب ایک قاری پڑھنا شروع کرتا ہے تو پھر رکتا نہیں۔ کلام

کی چاشنی، کلام کی روح اور جذبہء دل کی کیفیت ہل من مزید کا نعرہ لگاتی ہے۔

ناصر، نذیر، ظاہر، و باطن، نبی کریم
صادق، ولی، رؤف، مدثر، قوی، حکیم
سید، قریب، ختم رسل، اول و یتیم
طسین، واطحی، عزیز و ہمی، کلیم

منصور و مقصد ہے سراج منیر ہے

ختم ہے، خلیل ہے، عادل شہیر ہے

معراج فرش، وارث اقلیم عالمین پیغمبری کا فخر شہ دولت یقین

آفاق گیر صورت واحد، سراپا دین فانوس عرش مشعل ایوان اولین

خلاق ہست و بود کا جو دل پسند ہے

سر عجز و انکسار کا جس سے بلند ہے ۷۷۸

اُن کے اسی انداز اور اسلوب نے انہیں رشک تراہی سے علامہ رشک تراہی بنا دیا۔ وہ جب شعر کہنا شروع کرتے تو کہتے ہی رہتے۔ پروفیسر ہارون الرشید تبسم اُن کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب کی ایک طویل فہرست گنواتے ہیں جن میں ”زائر کعبہ، آئینہ حجاز، مشعل آفاق، العظمت للہ، سیدنا صدیق اکبر، سیدنا عمر، آتش خاموش، خراماں صبا، کہکشاں، بزم انجم، عکس جمیل، سلام بخضور سرور کونین، فیضان، صحرا میں گلزار، کشت صدرنگ، سچی بات اور سیدنا کریم شامل ہیں۔ ۷۷۹

طارق محمود نے اپنے مقالے ”علامہ رشک تراہی کی شخصیت اور شاعری“ میں ۵ مسودے

وہ بھی گنوائے ہیں۔ جن کے ابھی تک نام تجویز نہیں ہوئے تھے۔ اور اسی طرح ”کشت صدرنگ“

کے دو حصوں کا ذکر کیا ہے۔ ۷۸۰ اس وقت میرے سامنے اُن کے تین مطبوعہ مجموعے موجود ہیں۔

مشعل آفاق، العظمت للہ اور تحفہء درویش، ایک کتابچہ ہے جس کا کہیں ذکر موجود نہیں اس میں ”یا حی
 ویا قیوم“۔ اللہ الصمد“۔ ”یا حنان یا منان“ اور ان اللہ علی کل شیء قدیر“ نظمیں شامل ہیں۔ یوں تو ہر ہر
 لفظ دل میں اتر جاتا ہے۔ ان نظموں کی روانی روح میں گھلتی ہے اور اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ ذرا ”اللہ
 الصمد“ کو اس کی ہستی میں ڈوب کر پڑھیے

اے دیارِ دل کے مکیں بتا مری آنکھ سے تو نہاں ہے کیوں
 میں ترے ہی نور کا جزو ہوں تو مجھی سے پردہ کناں ہے کیوں
 میرے ولولوں کا شباب تو مرے گلستاں کی بہار تو
 مرا ذوق تو مرا شوق تو مرے دل کا صبر و قرار تو
 مجھے ہیں فضیلتیں دہر میں ترے لطف سے ترے فیض سے
 اے نگارِ من اے قرار جاں بہ آسماں میرے واسطے
 ترا ذکر عشرت جاوداں تیرا نام وجہ نجات ہے
 تو ہے بے نیاز یکن لہ کفوٰ احد تیری ذات ہے



کہیں کنت کنزاً مخفیاً، کہیں سرکن فیکون میں
 کہیں نحن اقرب میں نہاں کہیں ”ق“ میں کہیں ”ن“ میں
 کہیں لا الہ کے روپ میں تیرا حسن جلوہ فلکن ہوا
 کہیں تو نے میرے لئے کہا ولسوف یعطیک ربک
 کہیں دن نوید فتحنا کی کہیں دام حرص بچھا دیا۔
 کہیں چھپ کے پردہ ”م“ میں تو نے اپنا آپ دکھا دیا
 تو ہے رنگ رنگ میں ضوفشاں کبھی دن ہے تو کبھی رات ہے
 تو ہے بے نیاز یکن لہ کفوٰ احد تیری ذات ہے



میں کثیف ہوں تو لطیف ہے میں حقیر ہوں تو عظیم ہے
میں سراپا جرم و خطا ہوں اور تو کریم ہے تو رحیم ہے
تو ہے وہ کہ جس کی نگاہ سے کوئی چیز پردہ کناں نہیں
مگر ایک میں ہوں کہ آج تک مراحل مجھ پہ عیاں نہیں
میں اسیر دام گماں تو ہوں مگر اتنا مجھ کو شعور ہے
تو ہے جتنا میرے قریب تر مری جان اتنا ہی دور ہے
یہ دوئی کے پردے ہٹا کہ اب تری ذات سے مری بات ہے
تو ہے بے نیاز یکن لہ کفو احمد تری ذات ہے



ترے لفظ کن کی لطافتوں کو سمجھ سکی نہ مری نظر
نہ ہے ابتدا کی خبر مجھے نہ میں انتہا سے ہوں بہرہ ور
مجھے دے کے خلعتِ آبرو تو نے ایسا رستہ بتا دیا
میں چلا کہاں سے تھا اور کہاں مجھے تو نے لا کے پھنسا دیا
میں سیاہ خانہ ہست میں پھروں کب تک یونہی جا بجا
مجھے راہبر کی تلاش ہے مری رہبری کو چلا بھی آ
تری جستجو میری بندگی تری چاہ میری حیات ہے
تو ہے بے نیاز یکن لہ کفو احد تری ذات ہے



تو جو چاہے ذرے کو بخش دے وہ ضیا کہ جس سے قمر بنے
ہو تری نگاہ جو سنگ پر تو وہ رشک لعل و گہر بنے

تو کرم کرے تو جہان میں ہو یتیم خاتم مرسلان
 مری آرزو پہ بھی غور کر مری بات سن مرے مہرباں
 مجھے آنکھ کر وہ عطا کہ جو ترے غم میں اشک فشاں رہے
 مرے دل میں تیرا خیال ہو ترا ذکر وردِ زباں رہے
 تیرا نام رب العالمین تو سراپا لطف و ثبات ہے
 تو ہے بے نیاز یکن لہ کفو احد تیری ذات ہے ۴۸۱

علامہ احمد حسین رشک ترابی فقیر سرگودھا، دارالاحسانی کو ۱۹۸۵ء میں دل کا عارضہ لاحق ہو۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۸ء کو آپ نے محکمہ نہر سے اپنی مدت ملازمت ختم کی اور ریٹائرمنٹ لے لی اور پھر کچھ عرصہ صاحب فراش رہنے کے بعد ۱۷ جنوری ۲۰۰۳ء کو رحلت فرمائی۔

صاحبزادہ گلزار حسین شاہ صابر

حضرت پیر گلزار حسین شاہ صابر روحانیت کے سلسلہ صابریہ کے کلس شریف تحصیل بھلووال ضلع سرگودھا میں بانی حضرت پیر سید سیدن شاہ سرکار کے ہاں ۱۹۳۴ء ۲۸۲ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے ابتدائی تعلیم اور تربیت حاصل کی بعد میں گورنمنٹ ہائی سکول ملکوال سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ والد صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ انہوں نے بیٹے کو تمام آبائی اوراد و وظائف عطا فرمائے۔ ۱۹۷۳ء میں آپ مسند آرادر گاہ حضرت پیر سیدن شاہ ہوئے۔ مئی ۱۹۸۰ء میں کلیر شریف حضور مخدوم علاؤ الدین کے آستانہ پر حاضری دی۔ اجمیر شریف میں بھی حاضر ہوئے۔ دیگر روحانیت کے سلاسل کے اولیاء کے مزارات پر بھی گاہ گاہ حاضر ہوتے رہے۔ ۱۹۸۴ء میں حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔

”۲۶ نومبر ۱۹۹۱ء کو اپنے بیٹے پیر شمیم صابر کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور ۲۸ نومبر کو آپ نے وفات پائی۔ ان کی نماز جنازہ حضرت پیر حاجی عاشق حسین شاہ سجادہ نشین بہگام شریف تحصیل ملکوال

ضلع منڈی بہاؤ الدین نے پڑھائی“ ۲۸۳

حضرت پیر گلزار حسین شاہ صابر گوارو، پنجابی اور فارسی کے علاوہ عربی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ لیکن آپ اردو، پنجابی اور فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ آپ نے نثر میں بھی لکھا اور نظم میں بھی۔ آپ کے شعری مجموعوں کے نام ”شاہی گدائی“۔ ”گلزارِ طیبہ“۔ ”ذکرِ بلال“۔ ”وسدیاں اکھیں“ اور ”گلزارِ چشت“ ہیں جبکہ ”رموزِ دلبراں“ اور ”شاہکارِ صابر“ آپ کی نثری تصانیف ہیں۔ آپ نے اپنی شاعری اور نثر ہر دو میں حق و صداقت کی بات اور تبلیغ و ہدایت کے سلسلے کو آگے بڑھایا ہے۔ اولیائے کرام کی سوانح بھی آپ کی تحاریر کا حصہ ہیں۔ حمد، نعت، منقبت، اور اصلاح و اخلاق آپ کی شاعری کا واضح حصہ ہے نمونہء کلام ملاحظہ فرمائیے۔

نعت

سرکارِ دو جہاں کی محبت پہ ناز ہے
میرے گناہ دامنِ بخشش میں گھر گئے
زاہد ! تجھے تو زہد و عبادت پہ ناز ہے
شیدائے حسن روئے محمدؐ وہ خود ہوا
پیشِ نظر ہے آیہء لا تقطوا مجھے
اُس آمنہ کے لال کی عظمت پہ ناز ہے
تیری نگاہِ لطف کی قسمت پہ ناز ہے
مجھ کو حبیبِ حق کی شفاعت پہ ناز ہے
خالق کو اپنی ندرتِ صنعت پہ ناز ہے
عفوِ خدا، رسولؐ کی شفقت پہ ناز ہے
گلزار کو حضورؐ نے کملی میں لے لیا
عاصی کو اپنی خوبیء قسمت پہ ناز ہے ۲۸۳

غزل

ترا غم ہے تو کوئی غم نہیں ہیں
پننے فطرت نے یہ انمول موتی
رواں ہیں چشمہء کوثر کے دھارے
نوازیں جس کو حاتم ہی بنا دیں
فروزاں ہیں دیئے مدہم نہیں ہیں
گلوں کی آنکھ میں شبنم نہیں ہیں
مری جاں تیرے احساں کم نہیں ہیں
سخی میرے فقط حاتم نہیں ہیں

مجھے بے راہروی نے دور رکھا
کہاں پائیں گے وہ سر الہی
فقط یہ کھیل ہیں تیری نظر کے
گداگر ہیں مگر تیرے گداگر
تیرے کوچے سے اٹھ جنت کو جائیں
لو اتنے بے خبر تو ہم نہیں ہیں
کہاں گلزار تکمیل محبت !
ابھی آنکھیں ہوئی پر نم نہیں ہیں ۳۸۵

شکلیب جلالی

سید حسن رضوی نام اور شکلیب تخلص تھا۔ آبائی وطن ضلع علی گڑھ کے قصبہ جلالی کی نسبت سے جلالی کو نام کا حصہ بنا لیا۔ آپ کی تاریخ پیدائش پر اکثر محققین متفق ہیں اور یکم اکتوبر ۱۹۳۳ء تا ۱۹۶۱ء کو صحیح قرار دیتے ہیں لیکن ان کی بیوہ سیدہ محدثہ خاتون کے مطابق یہ درست نہیں وہ ان کی پیدائش ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۷ء بتاتی ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان دونوں تاریخوں سے متفق نہیں۔ یہ میری سوچ ہے جو ان کی تصاویر کو دیکھ کر اکثر ابھرتی ہے۔ کیونکہ ۱۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو جب انہوں نے موت کو گلے لگایا تو عمر عزیز ۳۲ سال بنتی تھی۔ لیکن آپ کی تصاویر سے جو اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ ۴۰ سال سے اوپر کا ہے۔ بہر حال اس پر میں زیادہ بحث اس لئے نہیں کروں گا کہ یہ کوئی دلیل نہیں۔ البتہ مشاہدے اور سوچ کی ایک دعوت ہے۔ شکلیب کے والد کا نام سید صغیر حسین رضوی تھا جو کہ محکمہ پولیس میں ملازم تھے اور ذہنی خلل کے باعث ۱۹۶۵ء میں بھارت میں ان کا انتقال ہوا۔

سید حسن رضوی نے تعلیم کی ابتداء اپنے گاؤں سے کی۔ ابھی زیر تعلیم تھے کہ تقسیم ہند پر ہجرت کرنا پڑی اور پاکستان آ گئے۔ میٹرک بدایوں سے پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۵۵ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۵۷ء میں شہزاد احمد لکھتے ہیں کہ ”شکلیب نے میاں محمد نقوی

اور محمد فاضل نقوی کے ساتھ اپنی بہنوں کو پاکستان بھجوادیا مگر خود میٹرک کرنے کے بعد پاکستان آئے یہ واقعہ ۱۹۴۹ء کا ہے۔“ ۳۸۹ لیکن اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:

”پاکستان پہنچتے ہی ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور تیرہ چودہ

برس کی عمر میں انہوں نے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرنی شروع کر دیں۔ اس

دوران انہوں نے کچھ رقم پس انداز کر کے پنڈی سے ایک ادبی رسالہ

”گونج“ کے نام سے شائع کیا۔“ ۳۹۰

یہاں اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۹ء میں انہوں نے میٹرک کیا تو عمر پندرہ سال تھی۔

پاکستان میں آ کر محنت مزدوری شروع کر دی تو عمر تیرہ، چودہ سال کیسے ہو گئی۔ اگرچہ یہ چھوٹے چھوٹے نکتے ہوتے ہیں لیکن تحقیق میں یہ بہت بڑے اثرات مرتب کرتے ہیں۔

”گونج“ اگرچہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۲ء تک صرف ایک سال چلا لیکن شکیب کو ادب و صحافت

میں داخل کر گیا۔ بعد ازاں ادبی صحافت اور ادبی رسائل کے ساتھ کچھ وقت گزار کر محکمہ تعلقات عامہ

پنجاب میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۵۹ء میں تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں ترجمان کی حیثیت سے ملازمت کر

لی۔ چونکہ دفتر جوہر آباد میں تھا لہذا ۴۱ سال تک یہاں رہے اور ۱۹۶۳ء میں بھکر چلے گئے۔ جہاں

۱۹۶۶ء میں ان کے دماغ کا خلل بڑھ گیا اور جون ۱۹۶۶ء میں وہ بھکر سے سرگودھا آ گئے۔ سرگودھا

میں وہ اپنے رشتے دار سید نذیر علی شاہ کے پاس رہے۔ جنہوں نے احمد ندیم قاسمی اور سیف زلفی کی

معاونت سے شکیب کو لاہور کے دماغی ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ وہاں وہ ایک مہینہ یا چند دن زائد

زیر علاج رہے اور ستمبر میں انہیں فارغ کر دیا گیا۔ اب وہ سرگودھا میں ہی مقیم تھے۔ اور پھر گیارہ نومبر

کو وہ حادثہ پیش آ گیا جس کے بارے سید جعفر طاہر بہت پہلے کہہ چکے تھے:

"This Gentleman will commit suicide"

گیارہ نومبر کو شکیب دوپہر کے وقت گھر سے نکلے ان کے ذہن میں بچپن کی یادیں اور ماں

کی موت کا منظر تھا۔ وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے موٹی ملز کے نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ سامنے

سے ٹرین آ رہی ہے اور پھر موت نے انہیں کھینچ کر ریلوے لائن پر پھینک دیا۔ ٹرین اوپر سے گزر گئی۔ دونوں ٹانگیں دھڑ سے جدا ہو گئیں۔ لیکن سانس کی رمتی باقی تھی۔ چار بجے ان کے عزیزوں کو اطلاع ملی۔ شکیب کو اٹھا کر میونسپل ہسپتال سرگودھا میں داخل کروا دیا گیا۔ زندگی آہستہ آہستہ بے بس ہوتی جا رہی تھی اور موت غالب آ رہی تھی۔ بالآخر رات بارہ بجے کے گھنٹے نے نئی تاریخ کا اعلان کیا اور یوں شکیب ایک دن کی اضافی زندگی لے کر ۱۲ نومبر کو موت کی آغوش میں چلے گئے۔ اسی دن انہیں سرگودھا کے بڑے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ:

”میری قیام گاہ اور کھیتوں کے درمیان ریلوے لائن کا وہ ٹکڑا

موجود ہے جہاں شکیب جلالی نے موت کو گلے لگایا تھا۔ اور اس جگہ پر پہنچ کر میں سوچتا ہوں کہ شکیب کو گاڑی (ٹرین) سے کیوں خوف آتا تھا؟ صاف ظاہر ہے بچے کے ذہن میں جو بات بیٹھ جاتی ہے وہ مرتے دم تک نہیں نکلتی۔ شکیب ابھی بچہ ہی تھا جب اس کی والدہ ٹرین کے نیچے آ کر دم توڑ گئی تھی۔ شکیب پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھتا رہا لیکن ماں جیسی شفیق اور محبت کرنے والی ہستی کو وہ عزرائیل کے ہاتھوں سے نہ چھین سکا..... لیکن عزرائیل کو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے تو چارپائی پر حوروں کی طرح سفید کپڑے میں ملبوس اس ہستی کو جسے ماں کہتے ہیں اپنوں جیسے انسانوں کے کندھوں پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ روتا پیتا رہا لیکن کسی نے اس کی ماں کو اس کے حوالے نہ کیا اور لے جا کر منوں مٹی کے نیچے دبا دیا۔ یہ ایک ایسا احساس تھا جو ساری زندگی شکیب کے دل و دماغ پر حاوی رہا۔ خاص کر اس لمحے وہ جنوں کی حد تک پہنچ جاتا جب ٹرین کو دیکھ لیتا۔ اور پھر اسی کیفیت میں اس نے ایک دن جب ٹرین کو اپنے نزدیک دیکھا تو جا کر خود کو اس خوف سے ہمیشہ کیلئے آزاد کرالیا۔“ ۲۹۱

شکلیب جلالی نے اردو غزل کو ایک نئی زندگی دی اور نظم و نقد نے اس صنف کو جب ایک کونے میں لاکھڑا کیا تھا شکلیب نے اسے پھر مرکز میں پہنچا دیا۔ ”روشنی اے روشنی“ ایک مختصر سی شعری کاوش مدتوں سے غزل کے دبستان میں موضوع بحث ہے۔ اور اب ”کلیات شکلیب جلالی“ بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔

شکلیب کی شاعری پر لوگوں نے بہت کچھ لکھا۔ ایم۔ اے کی طالبہ امتیاز کلثوم نے مقالہ لکھا۔ لیکن ان کی شاعری کی پرتوں کو کھولنے کے لئے ابھی بہت کام ہونا باقی ہے۔ تیمور حسن شکلیب اور اس کی شاعری پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا۔ ذوالفقار احسن کی شکلیب کی شخصیت، شاعری، فن اور نثری کام کے حوالے سے دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

یہاں ادبی بددیانتی کی ایک مثال پیش کرتا چلوں۔ ”روشنی اے روشنی“ کے کئی ایڈیشن ماورا پبلشرز نے شائع کئے اور خوب پیسہ کمایا لیکن شکلیب کی زوجہ بیگم محدثہ خاتون نے ایک انٹرویو میں یہ وضاحت کر دی تھی کہ مجھے چند سکوں کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ مزید اسی بددیانتی کی دوسری مثال دیکھئے کہ ذوالفقار احسن نے کلیات کی اشاعت سے پہلے مختلف رسائل سے کچھ غزلیں اور اشعار تلاش کر کے ماہنامہ کامران کی اشاعت مئی جون ۲۰۰۳ء میں اپنے ایک مضمون میں انہیں حصہ بنایا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ”روشنی اے روشنی“ کا نیا ایڈیشن آیا تو وہ سارا کلام اس میں شامل تھا۔ کتاب کی قیمت بڑھادی گئی تھی۔ لیکن ذوالفقار احسن، مدیر اور رسالے کے شکریہ کا ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ اور شکلیب کی شاعری بہر حال ایسی ہے کہ وہ بکتی ہے اور پبلشرز منافع کما رہا ہے۔ لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں۔ شکلیب کی شاعری کیوں بکتی ہے درج ذیل نمونہ کلام اس کی وضاحت کر دے گا۔

غزل

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے
ایسی دہشت تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی آنکھ جھپکی بھی نہیں، ہاتھ سے پتوار گرے
مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں جس طرح سایہ دیوار پہ دیوار گرے

تیرگی چھوڑ گئے دل میں اجالے کے خطوط
 کیا ہوا ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی تھی
 دیکھ کر اپنے دروبام لرز جاتا ہوں
 وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
 ہم سے ٹکرا گئی خود بڑھ کے اندھیرے کی چٹان
 کیا کہوں دیدہ تر، یہ تو مرا چہرہ ہے
 ہاتھ آیا نہیں کچھ رات کی دلدل کے سوا
 وہ تجلی کی شعاعیں تھیں کہ جلتے ہوئے تیر
 دیکھتے کیوں ہو کھلیب اتنی بلندی کی طرف

نہ اٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے ۲۹۲

کنار آب کھڑا خود سے کہہ رہا ہے کوئی
 ہوانے توڑ کے پتے زمیں پہ پھینکے ہیں
 بنا سکے ہیں پڑوسی کسی کا درد کبھی
 درخت راہ بتائیں ہلا ہلا کر ہاتھ
 چھڑا کے ہاتھ بہت دور بہ گیا ہے چاند
 یہ آسمان سے ٹوٹا ہوا ستارہ ہے
 مکان اور نہیں ہے بدل گیا ہے مکین
 فصیل جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
 حدود وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

کھلیب دیپ سے لہرا رہے ہیں پلکوں پر

دیار چشم میں کیا آج رت جگا ہے کوئی ۲۹۳

مفتی بشارت احمد نیر

ممتاز ماہر قانون ”مفتی بشارت احمد المتخلص نیر ولد مفتی بشیر احمد ۱۵ مئی ۱۹۳۵ء کو چک نمبر ۱۷۷ جنوبی ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔“ ۳۹۴ بی اے آنرز کے بعد ایل ایل بی کر کے وکالت کو بطور پیشہ اپنالیا۔ ۱۹۶۳ء میں بار کے ممبر بنے۔ ۱۹۷۳ء میں پنجاب بار کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۶ء کے بار کے انتخابات میں حکیم چراغ علی قریشی کو شکست دے کر بار کے صدر منتخب ہوئے۔

اسحاق آشفته کا کہنا ہے کہ:

”۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک ممبر پنجاب بار کونسل، ممبر پاکستان بار

کونسل، ممبر انٹرنیشنل لاء ایسوسی ایشن ہونے کے اعزازات بھی آپ کے تشخص کی رفعتوں کا پتہ دیتے ہیں..... جتنے عمیق آدمی ہیں اتنے ہی شفیق آدمی ہیں۔ قانون دانی کے حوالے سے مستند ہے میرا فرمایا ہوا، کے بہت قریب کھڑے ہیں۔“ ۳۹۵

آپ کے بارے ریاض مفتی اگرچہ اسحاق آشفته سے متفق ہیں لیکن بات کو تھوڑا آگے

بڑھاتے ہیں:

”اسلامی مارشل لاء دور میں فروری ۱۹۸۳ء سے دسمبر ۱۹۸۴ء

تک کوٹ لکھپت جیل اور شاہی قلعہ میں سرکاری مہمان رہے۔ یہ شاعر مزاج

انسان جیل کی بھٹی سے فولاد بن کر نکلا۔ آپ ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۰ء میں دو برس

بار کے صدر چنے گئے۔ مفتی صاحب شعر و ادب کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ خود

بھی اچھا شعر کہتے ہیں۔ مجموعہ کلام زیر ترتیب ہے۔“ ۳۹۶

لیکن افسوس کہ وہ کلام تشنہ اشاعت ہی رہا اور آپ ۱۷ دسمبر ۱۹۹۳ء کو وفات پا گئے۔

آپ کو موضع ترکھ ضلع گجرات میں دفن کیا گیا۔

اس کے چہرے پر تری بربادیوں کا غم نہ تھا
 تو جسے سمجھا تھا ہدم وہ ترا ہدم نہ تھا
 اب تو غنچے بھی چمن میں ہیں لباس اندر لباس
 شبہی موسم میں بھی ان پتیوں میں نم نہ تھا
 زرد موسم میں گریباں چاک ویرانوں کے پار
 میری آشفۃ سری تھی آپ کا ماتم نہ تھا
 جس کی چشمِ فیض سے اس گھر کو بینائی ملی
 وہ عزیزِ مصر کے دربار کا خادم نہ تھا
 اس نے جنت سے نکل کر اس طرح پھیری نظر
 جیسے وہ حوا تھی اور حوا کا میں آدم نہ تھا
 وسعتِ قلبی سے ہم نے معاف کر ڈالا اسے
 انتہا اس کی ہے اپنی ذات پر نادم نہ تھا ۲۹۸

دہے۔ فضا میں سمٹتے رہے

اجنبی دیس کے اجنبی شہر سے جب مہکتی ہوئی ریل چلنے لگی
 دور دہے فضا میں سمٹنے لگے اور مہکتی ہوئی شام ڈھلنے لگی
 دور تاریکیوں میں وہ گم ہو گئے اور لمحات پھر تلملانے لگے
 دندناتی ہوئی ریل چلتی رہی ققمے جل اٹھے جھلملانے لگے
 روشنی کے ٹھٹھرتے ہوئے نور میں ہر سٹیشن مسافر بدلتا رہا
 دور دہے فضا میں سمٹنے رہے آمدورفت کا دور چلتا رہا
 وقت ڈھلتا رہا ریل چلتی رہی میرے سینے سے لاوہ ابلتا رہا
 زندگی کی بدلتی ہوئی رہ پر کس قدر دوست ملتے پھڑتے رہے

کتنے لمحات ماضی میں ڈھلتے رہے کتنے دھبے فضا میں سمٹتے رہے
 کوئی ہے جو میری زندگی چھین لے میرے لمحات ماضی کو آواز دے
 دنداتی ہوئی ریل کی کوکھ میں
 مجھ کو جینے کا کوئی تو انداز دے ۲۹۹

حسن اختر جلیل

کچھ خاندانوں میں یہ رواج آج بھی چلا آ رہا ہے کہ پہلا بچہ اپنے ننھیال کے ہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس رسم کے تحت حسن اختر جلیل ۲۲ جولائی ۱۹۳۵ء، ۵۰۰ کو جھنگ میں اپنے نانا کے گھر پیدا ہوئے جبکہ ان کے والد جناب جوہر نظامی ان دنوں سرگودھا میں مقیم تھے۔ ”مقتل میں چراغ“ ۱۰۵ میں سن ولادت ۱۹۳۷ء رقم ہے جو شاید غلطی سے لکھا گیا ہے۔ کیونکہ جب حسن اختر جلیل کے تعلیمی کیریئر کو دیکھتے ہیں تو ۱۹۳۵ء میں سرگودھا میں پرائمری کا امتحان پاس کیا تو دس سال کی عمر تھی اور نوویا دس سال کی عمر میں ہی پرائمری پاس ہو سکتا تھا۔ پھر ۱۹۴۹ء میں مڈل اور ۱۹۵۱ء میں میٹرک کے امتحانات سرگودھا سے ہی پاس کئے تو ۱۹۵۱ء تک سولہ سال عمر بنتی ہے۔ پھر جب ہم ان کی ریٹائرمنٹ کو دیکھتے ہیں تو ۱۹۹۵ء تک عمر پوری ساٹھ سال بنتی ہے۔ لہذا ۱۹۳۷ء جو کہ راقم نے ”نعت گویان سرگودھا“ میں بھی لکھی ہے اسے غلط قرار دیتا ہوں۔ نیز جھنگ میں پیدائش کی وجہ بھی لاعلمی یا غلط معلومات کے باعث تحریر ہوا اسے بھی رد کرتا ہوں۔

حسن اختر جلیل نے گورنمنٹ کالج سرگودھا سے ۱۹۵۵ء میں گریجویشن کیا۔ اور پھر اسی سال والدین کے ساتھ جوہر آباد منتقل ہو گئے۔ یہیں سے آپ نے تھل ڈویپمنٹ اتھارٹی کے محکمہ سے ملازمت کا آغاز کیا۔ لیکن ۱۹۶۳ء میں نائب تحصیلدار منتخب ہونے پر اسے ترک کر دیا۔ بعد ازاں ۱۹۷۴ء میں P.E.A.C. کا امتحان پاس کر کے پنجاب سول سروس میں آ گئے۔ اور مجسٹریٹ، اسٹنٹ کمشنر، اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کے عہدوں پر فائز رہے۔ یہ عرصہ آپ نے مختلف مقامات پر

گزارا اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو اس وقت میانوالی میں فرائض انجام دے رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ مستقل طور پر جوہر آباد میں رہائش پذیر ہوئے۔ آپ نے ۲۹ دسمبر ۲۰۰۲ء کو لاہور میں وفات پائی۔ جہاں آپ ہسپتال میں داخل تھے۔ آپ کی میت کو لا کر جوہر آباد میں دفن کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس شب ٹیلی وژن پر پٹی چل رہی تھی جس میں درج تھا کہ ”حسن اختر جلیل اسلام آباد میں وفات پا گئے۔“ میرے ذہن میں بھی یہی محفوظ تھا لہذا لاہور کی تصدیق کیلئے جب ان کے بھائی مظفر حسن منصور کو ٹیلی فون کیا تو انہوں نے بتایا:

”بھائی جان جب بیمار ہوئے تو انہیں اسلام آباد علاج کی غرض

سے لے جایا گیا۔ جہاں وہ تین ماہ تک زیر علاج رہے لیکن افاقہ نہ ہونے پر

لاہور لے جا کر ہسپتال میں داخل کروایا گیا جہاں وہ اللہ کو پیارے ہوئے“ ۵۰۲

حسن اختر جلیل نے ۱۹۵۰ء میں شعر کہنا شروع کیا اور پھر تھوڑا عرصہ بعد ہی ”کامران“

میں چھپنے کی ابتداء کی۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے اشاعت پذیر ہوئے۔ ”مقتل میں چراغ“

ان کی زندگی (۱۹۸۶ء) میں لیکن ”یقینِ سحر“ آپ کی وفات کی بعد (۲۰۰۵ء) میں شائع ہوا۔

غزل

احساس مضمحل ہے نظر بے چراغ ہے	گھنگھور منزلوں کا سفر بے چراغ ہے
یہ شب یہیں الاؤ جلا کر گزار لیں	سونا ہے دشت اور ڈگر بے چراغ ہے
تم دل میں کس کو ڈھونڈنے آئے ہو اجنبی	اک عمر ہو گئی ہے یہ گھر بے چراغ ہے
ہاں داغ دل سے تھی کبھی سینے میں روشنی	اب تو یہ جگنوؤں کا نگر بے چراغ ہے
تو شکوہ سنج ہے کہ تری شب اداس تھی	ان کو بھی دیکھ جن کی سحر بے چراغ ہے

ہم نے تو یاں جلیل کو دیکھا ہے بار ہا

تم کہہ رہے ہو شہرِ ہنر بے چراغ ہے ۵۰۳



ان اندھیروں کے ستم کا کوئی چارا نکلے
 اے شبِ غم وہی خورشید دوبارا نکلے
 اس طرح خوف سے جامد ہیں بدن لوگوں کے
 سنگ ٹکرائے تو پیکر سے شرارا نکلے
 آنکھ پابند کہ قطروں سے تجاوز نہ کرے
 دل بھند ہے کہ لہو جسم سے سارا نکلے
 دل تو ناداں ہے ازل سے یہی خو ہے اس کی
 وہی بیوپار کرے جس میں خسارا نکلے
 کاش ان اجنبی چہروں کے سمندر سے جلیل
 کوئی بچھڑا ہوا ساتھی کوئی پیارا نکلے ۵۰۴

سعید مرزا

فقیر محمد سعید کے نام سے اپنے جاننے والوں میں جانا جانے والا سعید مرزا اکیم مارچ ۱۹۳۶ء کو بھارت کے شہر جگادھری میں پیدا ہوا۔ آپ کے والد جناب محمد صدیق وہاں پیر جی کے نام سے معروف تھے۔ ابھی پرائمری سکول پاس ہی کیا تھا اور ٹل کلاسز میں جانے لگے تھے کہ بٹوارا ہو گیا اور ہجرت کر کے اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئے۔ رزق سرگودھا میں لکھا تھا سو یہاں مقیم ہو گئے اور سکول جانا شروع کر دیا لیکن ٹل پاس کر کے میٹرک میں پہنچے اور تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور ایک دکان بنا کر پھر ساری زندگی اسی سے رزق کما تے رہے۔ ہارون الرشید تبسم کا کہنا ہے:

”شاعری کے لئے کسی دور یا عمر کے کسی خاص حصے کا مخصوص ہونا

لازمی امر نہیں ہے..... فقیر محمد سعید پیدائشی شاعر نہ تھے۔ تقریباً تیس

سال کی عمر میں ان پر آمد شروع ہوئی اور پھر اچانک ۴۵ سال کی عمر میں

اشعار کا یہ نزول رک گیا۔“ ۵۰۵

وہ پرانے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ آپ نے نعت بھی کہی اور غزل بھی۔ لیکن کچھ زیادہ کلام اُن کا نہیں ملتا۔ فقیر محمد سعید نے ۱۸ مارچ ۲۰۰۰ء کو عید قربان کے دن اس دار فانی سے عدم کا سفر اختیار کیا۔ دوسرے دن انہیں سپردِ خاک کیا گیا۔

نعت

جو محمد مصطفیٰؐ کے دین میں داخل ہوا ربِ کعبہ کی قسم انسان وہ کامل ہوا
حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں حاجت روا میرے آقا! آپ کے میں لطف کا سائل ہوا
آپ کی بعثت سے پہلے بھی نبی آئے مگر آپ کے آنے سے آقا دینِ حق کامل ہوا
آپ ہی کے دم سے پائی ہے صراطِ مستقیم آپ ہی کے فیض سے آسودہ منزل ہوا
سُن کے ذکرِ مصطفیٰؐ تیری زباں سے اے سعید
دل جھکا جھک کر مدینے کی طرف مائل ہوا ۵۰۶



شیخ صاحب تو فقط کوئے بتاں تک پہنچے ہم سے دیوانے خدا جانے کہاں تک پہنچے
اٹھ کے کعبے سے چلے آئے صنم خانے تک توبہ توبہ یہ مسلمان کہاں تک پہنچے ۵۰۷



کیوں نہ ان لوگوں کے پاگل پن کا ہم ماتم کریں
سامنے سورج کے رکھ کے جو جلاتے ہیں چراغ
لاکھ کوشش کی ہوائے تند نے لیکن سعید
پھر بھی تربت کو میری روشن بناتے ہیں چراغ



قاضی خضر جمال

قاضی خضر جمال کا اصل نام خضر حیات تھا جبکہ شعر و سخن کے میدان میں خضر اور جمال دونوں تخلص کرتے تھے اور قاضی کا سابقہ خاندانی نسبت سے استعمال کرتے تھے۔ آپ کے والد کا نام عمر بخش تھا۔ جو حافظ قرآن بھی تھے۔ اور محکمہ مال میں ملازم تھے۔

محسن عباس کے مطابق ”قاضی خضر جمال ۱۲ ستمبر ۱۹۳۶ء کو محلہ حکیمانوالہ، خوشاب شہر میں پیدا ہوئے“ ۵۰۸ جبکہ بدر منیر ۳ دن کے فرق سے ۹ ستمبر ۵۰۹ء، ان کی تاریخ ولادت لکھتے ہیں۔

خضر جمال ابھی پرائمری سکول کے طالب علم تھے کہ اپنے شعور میں کچھ تبدیلیاں محسوس کیں اور جب مڈل کلاسز میں پہنچے تو یہ تبدیلی شعر کی صورت میں نمایاں ہونے لگی تب واصف علی واصف کے والد ملک محمد عارف جو اسی سکول میں ڈرائنگ ماسٹر تھے کی شاگردی اختیار کر لی۔

قاضی خضر جمال نے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۵۴ء میں تھل ڈویپمنٹ اتھارٹی میں ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن ۱۹۵۸ء میں آپ محکمہ حال میں پنواری بن گئے۔ اس دور میں شکیب جلالی، جوہر نظامی اور خالد اختر افغانی وغیرہ سے اٹھنا بیٹھنا رہا۔ ان ملاقاتوں سے آپ کو تحریک ملتی رہتی اور شعر موزوں کرتے رہتے بعد میں مصروفیات اور ادبی ماحول میسر نہ آنے کے باعث یہ سلسلہ تقریباً منقطع ہو گیا اور پھر جب ۱۹۸۲ء میں خوشاب میں ”بزم فکر و فن“ کا قیام عمل میں آیا تو اس شہر کے شعراء کو ایک پلیٹ فارم میسر آ گیا اور ایک تحریک پیدا ہوئی۔ جس کا حصہ قاضی خضر جمال بھی بنے۔ اور آخر تک وہ اس تنظیم کا فعال حصہ رہے۔

آپ نے ۱۹۹۶ء میں پنوار سے ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ طبیعت کی خرابی اور ڈھلتی ہوئی عمر کے ہاتھوں خوشاب میں ہی آرام کی زندگی گزاری آپ اکثر اہل ادب سے مل کر غم کو غلط کرنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتے۔ آپ نے خوشاب میں ہی ماہ رمضان ۲۰۰۸ء میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ صرف غزل کہتے ہیں اور غزل کو تغزل، جمالیات اور زندگی کی کیفیات سے خالی نہیں رہنے

دیتے۔ عصری شعور اور تقاضائے وقت بھی آپ کی غزلوں میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

غزل

خودی ضمیرِ صدف میں اگر نہاں نہ ہوئی
 حیاتِ خام رہی گوہرِ گراں نہ ہوئی
 برنگِ شمعِ میری ذاتِ ضوفشاں نہ ہوئی
 خمیرِ گل میں میری خاکِ آشیاں نہ ہوئی
 لہو جو اپنا کسی تشنہ لب کو دے نہ سکی
 وہ آب جو ہی رہی بحرِ بیکراں نہ ہوئی
 کٹے ہزار ترددِ زمینِ دل پہ حضور
 کسی بھی دور میں لیکن یہ گلِ فشاں نہ ہوئی
 لبوں پہ گو ہے ترے ورد لا اللہ خضر
 جبیں سے دور سفالِ درِ بتاں نہ ہوئی۔۱۵



بے برشکال سے نہ بہاروں سے گفتگو
 ہے میرے آشیاں کی شراروں سے گفتگو
 اک آگ پھر لگے گی بہاروں کے دیس میں
 درپردہ ہو رہی ہے چناروں سے گفتگو
 گم گشتہ کشتیوں کے ہوئے رازِ منکشف
 موجوں نے کی ہے جب بھی کناروں سے گفتگو
 وہ خوبرو چمن میں ہے کلیوں سے ہم کلام
 ماہتاب کر رہا ہے ستاروں سے گفتگو

رہتے ہوئے چمن میں بھی خاموش ہیں خضر
کلیوں سے کچھ غرض ہے نہ خاروں سے گفتگو ۱۱۵

اظہر جاوید

اظہر جاوید ابن عبدالغفور جنوری ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ اگرچہ ماہنامہ اسلوب ۱۹۵۲ء میں
مقامِ ولادت گوجرانوالہ تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن زاہد حسین انجم ۱۹۵۳ء ریاض احمد شاد ۱۹۵۴ء محمد ظفر اقبال ۱۹۵۵ء
اور کشور و کرم ۱۹۶۱ء اس بات پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ آپ کی پیدائش راولپنڈی میں ہوئی۔ لیکن
آپ کے پاسپورٹ پر مقامِ ولادت سرگودھا رقم تھا۔ ۱۹۵۷ء سرگودھا سے اپنے تعلق کو اظہر جاوید ان
الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور شاید ہی اس سے غلط فہمی کا احتمال ہو:

”سرگودھا سے پرے طالب والا کے راستے پر ایک جگہ ہے

بھاگٹانوالہ۔ تب وہ چوکی بھاگٹانوالہ تھی۔ اس کے ساتھ میرا گاؤں تھا۔ چک

۸۰ جنوبی۔ میں بھاگٹانوالہ کے سکول میں ہی پڑھتا تھا۔ ہمارا خاندان لاہور

اور گوجرانوالہ سے اس چک میں آ گیا تھا۔ اپنی کامیابی کی دیکھ ریکھ کے لئے۔“

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب کالج میں داخل ہوئے تو جناب الطاف مشہدی
کے ساتھ مل کر ہفت روزہ خلوص کے اجراء سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد تعلیم کے حصول
کے ساتھ ساتھ سرگودھا کے مختلف اخبارات و رسائل سے بھی وابستہ رہے۔ جب صحافت میں قدم رکھا
تو اسی عرصے میں پہلا شعر بھی کہا اور پھر ممتاز شاعر جوہر نظامی کی شاگردی اختیار کر لی۔ آپ کی خوش
قسمتی ہے کہ سرگودھا کے دو بڑے نام صحافت اور شاعری میں آپ کے رہنما بنے۔ گورنمنٹ کالج
سرگودھا سے گریجوایشن کرنے کے کچھ عرصہ بعد آپ لاہور چلے گئے اور مکمل طور پر صحافت سے رشتہ
قائم کر لیا۔ مختلف رسائل کی ادارت، کالم نگاری اور معاونت آپ کے حصے میں رہی جن میں ”عکس
نو“، ”امروز“، ”سیارہ ڈائجسٹ“، ”جمہور“، ”تقاضے“، ”دن“ اور کراچی سے نکلنے والے ”اخبار

جہاں“ اور ”حریت“ وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن اطمینان اس وقت ہوا جب ۱۹۶۹ء میں اپنے ادبی پرچے ماہنامہ ”تخلیق“ کو جاری کیا۔ آپ کی وفات تک اس طرح جاری رہا کہ فروری کا شمارہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے پوسٹ کیا اور مارچ کا شمارہ کمپوزر کو دینے کے لیے اُسے ۱۴ فروری کو بلایا تھا لیکن یہ آپ کا آخری دن ثابت ہوا۔

اظہر جاوید ایک صحافی، ایک شاعر، ایک مترجم، ایک افسانہ نگار، اک مدیر، ایک مکالمہ نگار، ایک گیت نگار اور ایک نقاد کے روپ میں ہمارے سامنے رہے۔ آپ کی پہلی کتاب اگست ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔ جو آپ نے انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کی تھی اور یہ بلغاریہ کے افسانے تھے۔ جسے ”بلغاریں افسانے“ کا ہی نام دیا گیا۔ آپ کا شعری مجموعہ ”غمِ عشق گرنہ ہوتا“ کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ اس مجموعہ میں شامل شاعری بالکل اس نام کی عکاس ہے۔ جس میں محبت تو اپنی جگہ بھر پور ہے ہی۔ لیکن محبت میں فراق، جدائی اور احساسِ تنہائی جو ہوتا ہے وہ بھی ہمیں ملتا ہے۔ گویا کہ یہ نام اظہر جاوید کی شاعری اور دل کی یکساں آواز ہے۔ اور سلطان رشک اس مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اظہر کو کس کا انتظار ہے؟ اُس کی ملکچی شاید اداس کیوں ہے؟

اُس کی تنہائی ختم کیوں نہیں ہوتی؟ ان سب باتوں کا ایک جواب معاشرے

میں موجود منافقت، شاعر کا احساسِ انا، سیاسی اور سماجی عدم توازن، اور اس

کا ردِ عمل بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ خارجی رخ ہے۔ دراصل اس کا سبب اس کے

رومان اور ارمان کی عدم تکمیل ہے جو اُس کے درد آشنائزاج کا حصہ بن چکی

ہے اور اسی وجہ سے اُس کے شعروں میں زندگی کے درد کی لہریں ملتی ہیں۔ ۵۹

اظہر جاوید کے دیگر کام اور کتابوں کے نام ہیں: ”بڑی دیر ہو گئی“ پنجابی کہانیوں کا مجموعہ،

”نا کام محبت“ ساحر لدھیانوی، ”موت میرے تعاقب میں“ بے نظیر بھٹو کی وفات پر کتاب، ”سندھی

ادب و ثقافت نمبر“ تخلیق کے چھ سو صفحات پر مشتمل ”تخلیق کا افسانہ نمبر“ پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی،

کشمیری کتابوں سمیت، ”تخلیق کا خلیجی ریاستوں میں اردو نمبر“ چھ سو صفحات، اظہر جاوید ایک بھرپور زندگی گزار کر آخری لمحے تک متحرک رہتے ہوئے ۱۴ فروری ۲۰۱۲ء کو لاہور میں وفات پا گئے آپ کی تدفین وہیں ہوئی۔ نمونہ کلام۔

بھول جا اب اُسے چھوڑ تکرار کو، ضد نہ کر، ضد نہ کر
تو نے سولی پہ رکھا ہے کیوں پیار کو ضد نہ کر، ضد نہ کر
اس کو تیری ضرورت نہیں مان لے خود کو پہچان لے
دیکھ پاگل نہ بن توڑ اصرار کو، ضد نہ کر، ضد نہ کر
مانگ کر دیکھ لی تو نے ہر اک دعا ہے خدا کی رضا
اب تو تج دے محبت کے اقرار کو، ضد نہ کر، ضد نہ کر
یاد کر اس کا کوئی بھی وعدہ نہیں، کوئی دعویٰ نہیں
چل گرا دے تمنا کی دیوار کو، ضد نہ کر، ضد نہ کر
تجھ کو کیا آج تک شاعری سے ملا، کیا کسی سے ملا
دن کر دے تو جذبوں کے اظہار کو، ضد نہ کر، ضد نہ کر ۵۲۰



سرورِ قرب تو ہے نشہ وصال نہیں بدن مہکتے ہیں خوشبو کا احتمال نہیں
وہ میرے سامنے بیٹھی ہے اک غزل بن کر مری گرفت میں لیکن مرا خیال نہیں
پھڑکے پھر جو ملے ہیں وفا کی راہوں میں کسے یقین کہ مقدر کی یہ بھی چال نہیں
تمہاری آنکھوں میں لکھا نہیں جواب کوئی مرے لبوں پہ مچلتا کوئی سوال نہیں
تجھے میں یاد رکھوں وقت کو نہیں منظور تجھے میں دل سے بھلا دوں میری مجال نہیں
افق افق نئی صبحوں کے رنگ پھیلیں گے جو ڈوبتا ہے یہ سورج اسے اچھال نہیں
تو اپنے طرزِ تفاعل پہ کیوں پشیمان ہے مجھے تو اپنی تباہی کا کچھ ملال نہیں

نقیب صبح ازل دیکھ تھک چکا ہوں میں شب حیات کی افتادگی کو ٹال نہیں
یہی کہا تھا یہاں جبر کی حکومت ہے تو اس خطا سے ہمیں شہر سے نکال نہیں
میں کیسے روکوں گا اظہر غموں کی تاریکی
کہ میرے ہاتھ میں اب چاندنی کی ڈھال نہیں ہے

سلیم حسن مرزا

سلیم حسن مرزا ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو سرگودھا شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مرزا مامول حسن جو مامول انور کے نام سے ادبی حلقوں میں پہچان رکھتے ہیں۔ ایک خوبصورت شاعر اور صحافی تھے۔
سلیم حسن نے پرائمری تک تعلیم اسلام پورہ میں پائی۔ جبکہ اسلامیہ خالقیہ ہائی سکول سرگودھا سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا سے گریجوایشن کیا اور بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے وزارت مذہبی امور میں پبلک ریلیشننگ آفیسر کے طور پر ایک مدت تک خدمات انجام دیں اور ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا پرائیویٹ سکول چلانے لگے۔

سلیم حسن مرزا کے گھر کا ماحول چونکہ ادبی تھا۔ اس لئے بچپن سے ہی شعر و سخن کی سوجھ بوجھ آگئی۔ ابھی چٹھی جماعت میں تھے کہ خود بھی شعر کہنے لگے۔ جب شعور میں مزید پختگی آئی تو جوہر نظامی سے مشورہ کرنے لگے۔ آپ شعر کے علاوہ نثر بھی لکھتے تھے لیکن مستقل لکھنے والوں میں آپ کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ کبھی سال دو سال کے بعد ایک آدھ مضمون کسی رسالے میں دکھائی دے جاتا تھا۔ البتہ آپ کی غزلیں تخلیق، عکس نو، اوراق، نقاد یا روزنامہ جنگ ونوائے وقت میں دکھائی دیتی رہیں۔
سلیم حسن نہایت مخلص اور محبت کرے والی شخصیت تھے۔ دھیمے لہجے میں بات کرتے اور دھیمے لہجے میں ہی شعر کہتے۔ آپ آدمی کی درمانگی اور شکستگی کو اس کی تکریم اور تقدیس کے حوالے سے دیکھتے تھے۔ اور جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں اس کا سبب ہماری اپنی تیز رفتاری

کو ہیں ان کا کہنا ہے کہ ۔

جب زمانے کے چلن میں تیز رفتاری نہ تھی

اس قدر وحشت درو دیوار پر طاری نہ تھی

سلیم حسن مرزا نے ۲۳ اپریل ۲۰۱۰ء بروز جمعہ المبارک شام کے وقت وفات پائی اور

دوسرے دن آپ کو دفن کیا گیا۔ آپ نے اگرچہ شعر زیادہ لکھا لیکن آپ کی کتاب نثر میں بعنوان

”کیمرے کے روبرو“ پہلے شائع ہوئی۔

غزل

گھر سے کتنا بے خبر ہوں رات اندازہ لگا

دو قدم اٹھ کر چلا تو سر میں دروازہ لگا

خشک لب، چہرے دھواں، جسموں پہ لرزہ خوف کا

سوکھے پتوں کی طرح یہ گھر کا شیرازہ لگا

نیند کے پیچھے یہاں کے رت جگے در آئیں گے

خواب گاہ زیت میں جیسا بھی دروازہ لگا

پتیر تو کاٹا ہے تو نے ان پرندوں کو بھی دیکھ

ان کے کرب و درد کا تو کچھ تو اندازہ لگا

موسم گل سے مرا اب ربط اتنا رہ گیا

پھول جب کوئی کھلا تو مجھ کو آوازہ لگا

ڈھلتی شب ہو جائے گی کیا اس طرح سے پھر جواں؟

پھینکی پھینکی چاندنی کا اس پہ مت غازہ لگا

آج پھر برسا ہے بادل آج پھر پروا چلی

زخم جو تو نے دیا تھا آج پھر تازہ لگا



بیٹھے ہی تھے ابھی ذرا تھک ہار ٹوٹ کر سر پر ہمارے آگری دیوار ٹوٹ کر
 تنہائیوں میں چھوڑ کر جانے کہاں گئے ملتے تھے جو کبھی سر بازار ٹوٹ کر
 ہر سمت سے ہزار ہا پتھر برس پڑے یوں ریزہ ریزہ ہو گیا گھر بار ٹوٹ کر
 پتھر پہ جس طرح سے گرے آئینہ کوئی اک دن گرد گے فرش پر سرکار ٹوٹ کر
 ساحل تو دو قدم تھا مگر حادثہ ہوا کشتی بکھر گئی سر منجدار ٹوٹ کر
 چاہت کی راہ میں کبھی دنیا کی راہ میں
 بکھرے ہیں ہم سلیم کنی بار ٹوٹ کر ۵۲۳

شفیع ضامن

محمد شفیع نام اور ضامن تخلص ہے۔ ایک مدت تک محمد شفیع کے نام سے ہی لکھتے رہے۔ فوج
 میں جب صوبیدار ہوئے تو ضامن بھی ساتھ لکھنا شروع کر دیا۔

”آپ ۱۲۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو نوشہرہ تحصیل خوشاب میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد فتح محمد
 سون کے اعوان قبیلے سے متعلق تھے۔ ابتدائی تعلیم نوشہرہ سے حاصل کی اور پھر فوج میں بھرتی ہو گئے۔
 سنگلز سنٹر کوہاٹ میں ٹریننگ کی۔ اور جب دوبارہ کوہاٹ سنٹر میں تبادلہ ہوا تو سنٹر کی تھیسٹریکل ٹیم کا
 حصہ بنے۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۳ء تک آپ سنگلز کور میں رہے۔

۱۹۶۳ء میں ایف اے کیا اور اسی سال آپ کو ایجوکیشن کور میں لے لیا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں
 آپ نے بی۔ اے اور ۱۹۶۸ء میں ایم۔ اے کی ڈگریاں لیں۔ ۱۹۸۲ء میں آپ صوبیدار میجر کے
 عہدے سے ریٹائر ہوئے اور تمنغہ خدمت درجہ اول سے نوازے گئے۔“ ۵۲۳

آرمی سے ریٹائرمنٹ کے بعد شفیع ضامن کا اسلام آباد، طلبہ کے کالج میں استاد کی حیثیت
 سے تقرر ہوا۔ جہاں آپ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۸ء تک رہے۔ یہاں شاہد رشید امجد بھی ان کے شریک کار

تھے کیونکہ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ:

”ایم اے اردو کر کے وہاں (فوج) سے ریٹائرمنٹ لے لی اور اسلام آباد کالج فار بوائز میں لیکچرر ہو گئے۔۔۔۔ اچھی شاعری کے ساتھ ساتھ عمدہ خاکے لکھتے ہیں۔ ان کے خاکوں کی خاص بات یہ ہے کہ شخصیت کے اندر اتر کر باتیں نکال لاتے ہیں جو اگرچہ سامنے کی ہوتی ہیں لیکن ان کے نفسیاتی محرکات سے ہم لاعلم ہوتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ہم دونوں اب ایک ہی کالج میں ہیں۔“ ۵۲۵

میری ملاقات جب ۲۰۰۰ء میں ہوئی تو آپ اسلام آباد میں ہی کسی پرائیویٹ کالج میں پڑھا رہے تھے۔ اور وہیں ”۲۰۰۶ء میں آپ اللہ کو پیارے ہو گئے“ ۵۲۶ وفات کے بعد آپ کی میت کو آپ کے گاؤں نوشہرہ ضلع خوشاب میں لا کر دفن کیا گیا۔

شفیع ضامن نے فوج میں رہتے ہوئے مختلف عسکری رسائل کے لئے مضامین لکھے۔ شاعری بھی کی۔ چونکہ ان رسائل کی پالیسی اپنی ہوتی ہے اس لئے ملی و قومی شاعری میں آپ وہاں پہچانے گئے۔ لیکن عام ادبی رسائل میں آپ نے جو غزل، حمد اور نعت لکھی۔ وہ آپ کی ادبی حلقوں میں پہچان کا سبب بنی۔ محسن عباس ان کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی خوبصورت بات کر گئے ہیں:

”ضامن کی غزل کا تار و پود جدید اردو غزلوں کے معیار سے

مربوط ہے۔ اپنی فکری جولانیاں اور خلتی توانائیاں اسی صنف کو آراستہ کرنے

میں آزماتے ہیں۔ ان کی شاعری روح کے منجد ہار میں اترنے، موجوں

سے نکرانے، سایہ دار درخت بننے، جھونکوں میں گھلنے اور قدروں میں تلنے کا

درس دیتی ہے۔ بحیثیت مجموعی اس دور کے قاری کو عصری نوحہ سناتی ہے۔

فطرت اور روح فطرت میں اس کا سکون تلاش کرتی ہے۔“ ۵۲۷

شفیع ضامن نے شاعری کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ ڈرامہ نگاری کا آغاز آپ

نے کوہاٹ سنٹر سے کیا۔ جو وہاں سٹیج بھی ہوئے۔ ترجمہ نگاری میں آپ کی ایک کتاب ”تخت یا تختہ“ شائع ہو چکی ہے۔ جو ”ہیروانوڈا“ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز نے ایم اے کا مقالہ آپ پر لکھوایا ہے جس میں آپ کے کلام اور مضامین کی بھی تدوین کی گئی ہے۔ محمد شفیع ضامن کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

غزل

کیسے خود بینوں میں ہے بیٹھنا اٹھنا اپنا
پیار کرتا رہا غیروں سے بھی اپنوں کی طرح
یار غیبت سے ملامت پہ اتر آئے تو کیا
عشق اندھا ہے تو اے اہل نظر پھر کیسے
میں تری رائے میں پاگل ہی سہی، پر یہ بتا
تو گریزاں ہے تو جھنجھلائے ہوئے پھرتے ہیں
جو ملا ہے وہی لے بیٹھا ہے قصہ اپنا
میں کہ اپنوں کی نظر میں بھی نہیں تھا اپنا
میں نے تو اب بھی توازن نہیں کھویا اپنا
کھوج لیتا ہے اندھروں میں بھی رستہ اپنا
کبھی دیکھا بھی ہے یہ چاند سا چہرہ اپنا
جیسے بے لوٹ نہ ہو تجھ سے بھی رشتہ اپنا

ہر نئے دور کے معیار الگ تھے ضامن

شکر ہے یاد رہا ہم کو سلیقہ اپنا ۵۲۸



تپتی دوپہریں، بے سایہ دیواریں اور میں
رنگوں روشنیوں، خوشبوؤں کے ہالے اور تو
ایک ملاپ کا عالم سارا، ایک تمام فراق
دیکھیں کیا اس رویا کی تعبیر نکلتی ہے
کون اتار کے لے گیا کرے کی ساری تصویریں
اوپر سے جلتے تیروں کی بوچھاڑیں اور میں
دکھ دھولوں، بے رونقیوں کی یلغاریں اور میں
گھنے درختوں میں چڑیوں کی چہکاریں اور میں
شام، افق، کرلائی کونجوں کی ڈاریں اور میں
پچھے رہ گئیں خالی خالی دیواریں اور میں

ضامن میرا ذاتی سرمایہ بس اتنا ہے !!

چند کتابیں، کچھ پرچے، کچھ اخباریں اور میں ۵۲۹

ثاقب ملک

ملک حبیب نواز ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو موضع ہر دوسوہی تحصیل خوشاب میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ملک احمد نواز خان فوج سے میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء حبیب نواز جو بعد میں ادبی دنیا میں ثاقب ملک کے نام سے جانے گئے نے پہلی جماعت بھارت کے شہر جھانسی کے نزدیک ایک قصبہ بہینا میں پڑھی۔ آپ کے والد کا تبادلہ وہاں سے نوشہرہ کینٹ (صوبہ سرحد) میں ہو گیا۔ تو ثاقب کو رسالپور میں داخل کروایا گیا جہاں تیسری اور چوتھی جماعت پڑھی۔ اور پھر خالقہ ہائی سکول سرگودھا میں انہیں داخل کروایا گیا جہاں سے ۱۹۵۴ء میں میٹرک کیا۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا سے ۱۹۵۸ء میں گریجوایشن کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں ایل ایل بی کیلئے داخلہ لیا۔ لیکن صحت خراب ہو گئی اور یہ سلسلہ ۱۹۵۶ء تک منقطع رہا۔ ۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے نجی حیثیت سے اردو میں ایم اے کیا۔ ۱۹۷۲ء تک آپ بے روزگار رہے اور ۱۹۷۳ء میں پی ٹی وی میں اسٹنٹ پروڈیوسر ہو گئے۔ جہاں سے ۱۹۹۸ء میں پروڈیوسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۷۱ء

ثاقب ملک نے اگرچہ اردو میں ایم اے کیا تھا۔ بیکاری کے ۶ سال مطالعہ میں گزارے تھے لیکن شاعری کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب پاکستان ٹیلی ویژن میں ایسے لوگوں سے رابطہ ہوا جن کا اوڑھنا بچھونا ہی ادب تھا۔ اس ماحول میں آپ نے بھی شعر کہنا شروع کیا۔ اور دوستوں کے ساتھ برابری کے اس تقاضے کو نبھایا۔ پی ٹی وی میں بھی آپ نے مطالعہ کو رہنما بنایا اردو کے علاوہ انگریزی ادب اور فارسی ادب سے لگاؤ اور لگن نے بین الاقوامی ادب کو سمجھنے میں ان کی معاونت کی۔ آپ نے ادب کو بھی سمجھا اور زندگی کو بھی۔ اور پھر ایک فیصلے پر پہنچے کہ:

”ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب اگر ایک

طرف رواں دواں زندگی کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسری طرف زندگی کو زیادہ

خوبصورت، زیادہ حسین اور زیادہ خوشگوار بنانے کا فریضہ بھی سرانجام دیتا

ہے۔ ادب کی تمام اصناف اپنی اپنی جگہ قابلِ قدر اور اہم ہیں۔ مگر شاعری تمام اصناف اور ادب میں ہمیشہ ممتاز رہی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ شاعری جس طرح انسانی دلوں میں محبت کا رس گھولتی ہے۔ انسانی آرزوؤں کو جو حسن اور تابندگی بخشتی ہے۔ اور انسانی زندگی کے تاریک لمحوں میں بھی جو چاندنی بکھیرتی ہے کوئی اور صنفِ ادب اس کا مقابلہ نہیں کر پاتی۔“ ۵۳۲

اور شاید یہی احساس تھا جس نے انہیں شعر کہنے کی طرف مائل کیا اور انہوں نے ”بردر جاناں“۔ ”سانول سرنگیت“ اور ”سلگتی چاندنی“ جیسے شعری مجموعے قارئین کی نذر کئے۔

ثاقب ملک کی شاعری میں کلاسیکیت اور سرنگیت کا بھرپور تاثر ملتا ہے۔ اس نے شعر میں تجربات اور مشاہدے کو زندگی کی باریکیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور تلخی و تندہی کے ساتھ میٹھی اور شیریں سچائیوں کو الفاظ کا موزوں رنگ دیا ہے۔ اور زندگی میں سے محبت اور جمالیات کے حسین رنگوں کو کشید کر کے مصوری کی ہے۔ آخری عمر میں آپ تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ گاؤں میں ہی گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے لگے۔ کئی بار ٹیلی فون پر رابطہ ہوا تو انہوں نے اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے راقم کو وہاں آنے کی دعوت دی۔ اور پھر اسی عالم میں ورد و وظائف کرتے ہوئے ۱۷ جولائی ۲۰۱۱ء کو اپنی جانِ جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

غزل

کچھ یوں جبینِ دل پہ رقم ایک نام ہے جیسے فلک پہ جلوہ ماہ تمام ہے
یادوں کے گلستاں پہ ہے پھر بارشِ جمال پھر ساغرِ نظر میں مئے لالہ قام ہے
پڑتی ہے اک پھواری رنگوں کی ہر طرف پھیلا ہوا شفق پہ تمنا کا دام ہے
تیرے بغیر لگتا ہے یوں جیسے زندگی سورج غروب ہونے پہ صحرا کی شام ہے
حیراں سا دیکھتے ہو جو اس سمت بار بار وہ دل نواز یاد کیا بالائے بام ہے
لگتا ہے آج پھر کوئی تقریب خاص ہے اتنے تکلفات کا جو اہتمام ہے

ثاقب کسی بہار کی آمد تو ہے ضرور
دل میں شمیمِ حسن سی محو خرام ہے ۵۳۳



تھی تو آباد مگر اتنی بھی آباد نہ تھی گویا ہستی تھی دل آویز پہ بنیاد نہ تھی
کثرتِ جلوہء اصنام سے مسحور نظر محوِ نظارہء صد رنگ سہی شاد نہ تھی
جبرِ ہستی سے کسی طور رہائی نہ ملی زندگی آپ ہی زندان تھی آزاد نہ تھی
چہرے پڑمردہ، بدن محنتِ شاقہ سے نڈھال دنیا اتنی ہوئی برباد کہ برباد نہ تھی
بوند آنکھوں میں نہ آواز گلوں میں باقی ایسی صحرا بھدا پہلے تو فریاد نہ تھی
تم اکیلے ہی تو معتب نہیں ہو ثاقب
کار الفت میں روا کس پہ یہ بیداد نہ تھی ۵۳۳

محمد صفدر خان

محمد صفدر خان ۲۰ دسمبر ۱۹۳۸ء کو حکیم سرخرو خان کے ہاں نوشہرہ تحصیل خوشاب میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم نوشہرہ میں حاصل کی۔ اپنے اُس وقت کے کلاس فیلوز میں سے اکثر آپ شفیع ضامن کو یاد کرتے رہتے تھے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور بہاولپور یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ میٹرک کے بعد تدریس کے شعبے سے منسلک ہوئے اور ۶۰ سال کی عمر تک مختلف سکولوں میں پڑھاتے رہے۔ آخر میں سوڈھی جے والی ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے جب ریٹائرمنٹ ہوئی۔

محمد صفدر خان نے ۱۹۵۵ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ ملاقات پر مجھے آپ نے بتایا تھا کہ ”میری کتاب سیدنا ابو بکر صدیق (منظوم) ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔“ ۵۳۵ لیکن بار بار کہنے کے باوجود مجھے وہ کتاب نہیں دکھائی۔ ۲۷ جون ۲۰۰۸ء کو سرِ راہے مجھے اس کتاب کا مسودہ آپ نے دکھایا۔ جسے

اشاعت کیلئے تیار کر رکھا ہے۔ آیا آپ کی وہ کتاب شائع نہیں ہوئی تھی؟ اب شائع ہونے لگی ہے؟ دیکھیں ہوتی بھی ہے یا نہیں؟ دوسرا مجموعہ مراد مصطفیٰ اور تیسرا عثمان ذوالنورین مسودات کی صورت میں موجود ہیں۔ یوں آپ کو منظوم سیرت نگار کہا جاسکتا ہے۔ آپ کی شاعری میں اس حوالے سے جان ہے۔ اور اگر یہ کتب شائع ہو گئیں تو زندہ شاعری میں ان کا نام رہ جائے گا۔ لیکن افسوس کہ آپ کی اولاد پڑھی لکھی ہونے کے باوجود کتاب کی اہمیت سے انجان ہے۔

محمد صفدر خان نے شاعری میں ابتداء غلام حسین قیصر سے اصلاح لی۔ اور شاید یہ ۱۹۷۲ء کے بعد کا زمانہ ہوگا۔ کیونکہ ۱۹۷۲ء میں آپ نے نوشہرہ سے نقل مکانی کی اور سرگودھا آ کر رہائش اختیار کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی آپ متحرک رہے اور آخری لمحوں تک آپ کسی پر بوجھ نہیں بنے اور یونیورسٹی میں اکثر دیکھے جاتے رہے۔ یکم شوال ۲۰۱۰ء میں آپ نے سرگودھا ہی وفات پائی۔

نعت رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

سردار سب رسولوں کے اور رہنما ہیں آپ
نورِ ازل کا پر تو اکمل حضور ہیں
شاہد ہیں کبریا کے ام کے شفیع ہیں
بے مثل دو جہان میں لاریب آپ ہیں
کشف الدجی جمال میں پورا کمال ہے
شاہی میں فقر و فخری کا ساماں پسند تھا
انسان زیر بار ہے خلقِ عظیم کا
جبریل کو بھی در کی غلامی پہ ناز ہے
اے پیکرِ خلوص خدا را نگاہِ لطف
سب انبیاء کو آپ کا ہے اقتداء قبول
اک نور بکراں ہیں حبیبِ خدا ہیں آپ
شمسِ منیر باعثِ ارض و سما ہیں آپ
سلطانِ کائنات خدا کی رضا ہیں آپ
بحرِ کرم میں منبعِ جود و سخا ہیں آپ
اک مشکلِ ہدیٰ ہیں سراجِ صفا ہیں آپ
اے شاہِ کائنات وہ خیر الوریٰ ہیں آپ
ترویجِ خلقِ عام کے بس پیشوا ہیں آپ
وہ تاجدار و سرورِ ہر دوسرا ہیں آپ
ہر حق طلب کے واسطے اک حق نما ہیں آپ
وہ مقتدی ہیں رہبرِ کل انبیاء ہیں آپ
اشرف عزیز آپ ہیں صفدر کا ہے یقین
برتر خدا کے بعد فقط پیشوا ہیں آپ ۵۳۶

آفتاب مفتی

سرگودھا کے کئی چکوک میں گجرات سے نقل مکانی کر کے آئے ہوئے کئی زمیندار خاندان رہائش پذیر ہیں۔ انہی خاندانوں میں گجرات کے مفتی خاندان کے کچھ لوگ بھی یہاں آباد ہیں۔ گجرات سے نقل مکانی کر کے آنے والوں میں ایک نام ڈاکٹر محمد شریف قیصر کا بھی تھا۔ ڈاکٹر محمد شریف قیصر کے ہاں ۱۲۰ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو چک نمبر ۷۵ جنوبی ضلع سرگودھا میں ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام نصر اللہ خان رکھا گیا۔ ابھی اس بچے کی عمر پانچ سال تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ ایک باہمت خاتون تھیں جو تدریس کے شعبے سے وابستہ تھیں۔ وہ اپنے بڑے بیٹے ظفر اللہ طارق اور منجھلے نصر اللہ خان کو اپنے ساتھ اسی سکول میں لے جانے لگیں جبکہ تیسرا بیٹا اسد اللہ خان ابھی بہت چھوٹا تھا۔ ان تین بیٹوں کے علاوہ تین بیٹیاں بھی تھیں۔ اکیلی خاتون، چھوٹے چھوٹے بچے۔ جب حالات مخدوش ہونے لگے تو اس نے اپنے بچوں کی انگلی پکڑی اور ۱۹۴۷ء میں اپنے اصل کی طرف یعنی گجرات کو مراجعت کر گئی۔ نصر اللہ خان نے یہیں اپنی تعلیم مکمل کی اور صحافت میں حصہ لینے لگے۔ اس سے پہلے شعر آپ کالج کے زمانے سے کہہ رہے تھے اور اپنے لیے آفتاب مفتی کا قلمی نام استعمال کر چکے تھے۔ صحافت میں آتے ہی آپ نے اردو زبان میں ہفت روزہ ”تازیانہ“ اور انگریزی زبان میں ماہنامہ ”سن رائز“ کا اجراء کیا۔ آپ کے والد بھی چونکہ صحافت سے وابستہ رہے اور بے باک صحافت میں ایک نام کمایا۔ آفتاب نے بھی انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جانشین ہونے کا حق ادا کرنا اپنا مطمع نظر سمجھا اور کئی مزاحمتی اور انقلابی تحریریں قارئین کو دیں۔

آفتاب مفتی نے ۲۵ دسمبر ۱۹۹۲ء کو گجرات میں ہی وفات پائی۔ آپ کے بعد آپ کے بڑے بھائی طارق مفتی جن کا بظاہر صحافت سے یا شعر و سخن سے تعلق نہیں تھا، سامنے آئے اور اب ”تازیانہ“ کو باقاعدگی سے چلا رہے ہیں۔

آفتاب مفتی ایک صحافی، ایک شاعر، ایک دانشور اور ایک مصنف کی حیثیت سے اپنی

پہچان رکھتے تھے۔ لیکن ان کی تحریریں رسائل و جرائد میں بکھری ہوئی تو ملتی ہیں، کتابی صورت میں سامنے نہیں آئیں۔ شاعری میں آپ کا رنگ یا لہجہ مزاحمتی اور انقلابی تھا۔

بد نصیبی کا لیکن خدا مر گیا

قاضی شہر نے اس کو بیٹی کہا، اور ترازو میں انصاف کے ڈال کر اس کو حجرے کی زینت بنانے لگا جب وہ تڑپی تو تھپڑ دیا گال پر تو نہیں جانتی جو بھی آیا یہاں، وہ تعیش کا سامان بن کے گیا تیرا انکار تو بین انصاف ہے، انتہائے غضب میں گرجنے لگا محتسب بھی مرا، کو توالی مری، اور فقیہ شہر میرا دریوزہ گر کوئی آشفٹہ سر تیری آواز پر سوئے مقتل چلے، بن سکے چارہ گر بائرن کی قسم میں ہوں داہر نسل، اب نہ قاسم کوئی بھی ادھر آئے گا سن کے تیری صدا، ہر محافظ ترا، سکرا کرا دھر سے گزر جائے گا تیرے بھائی ہیں بے غیرتی کے نشاں، ان میں احساس تقدیس حرمت کہاں جانتے ہیں فقط مصلحت کی زباں، سو گئے سارباں، لٹ گیا کارواں سسکیاں مر گئیں، ہچکیاں لٹ گئیں اور سنانا چیخوں سے تھرا گیا اس طرح ایک منصف عدل کا امیں، ایک فریادِ مظلوم سنتا رہا دم بخود بے کسی سر پٹختی رہی بد نصیبی کا لیکن خدا مر گیا اپنی بیٹی کے بد بخت ناموس پر، اسر طرح اک درندہ بھرتا رہا بے بسی نے پکارا خدا کے لیے، رسم رفتہ کو اب پھر سے آواز دو بیٹیاں جننے والو، انہیں جنتے ہی، ان کے سینے میں نوکِ سناں گاڑ دو تاکہ کوئی بھی مجبور بیٹی یہاں، پھر کیس کو نہ بھائی، نہ والد کہے پھر نہ کوئی بھی منصف عدل کا امیں، بیٹی بیٹی کہے آبرو چھین لے ۵۲۸

غزل

اس دورِ گھٹن میں کوئی آواز اٹھاؤ اس جور و سیاہ کاری پہ اک حشر اٹھاؤ
 پتھراؤ گھروندوں پہ ہے شیشے کے گھروں سے ان شیش محلوں پہ کوئی سنگ گراؤ
 اک آندھی کی صورت درِ زنداں کو اکھیڑو اے گوشہ زندان کی محبوس ہواؤ
 یہ ظلم تشدد یہ مقدمے یہ سزائیں کب پاؤں کی زنجیر بنیں یہ تو بتاؤ
 سچائی کی آواز دبی ہے نہ دبے گی دیوار پہ لکھا ہے یہ اے بونے خداؤ
 تنہا میری آواز سے کب بات بنے گی
 لب کھولو! اس آواز میں آواز ملاؤ ۵۳۹

شوکت راز

راؤ شوکت علی خان نام اور راز تخلص نے مل کر جو ادبی نام پیدا کیا وہ شوکت راز بنا۔ آپ سابق ہندوستان کے شہر رتھک میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ ولادت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ”سخنوران سرگودھا“ کے مؤلف نے ۱۹۴۲ء ۵۴۰ء جبکہ آپ کے کلیات کے سر آغاز میں ۲۵ دسمبر ۱۹۴۱ء ۵۴۱ کی تاریخ درج ہے۔ لیکن ”آئینہ احساس“ میں جو تاریخ آپ کے تعارف میں دی گئی ہے وہ کیم اپریل ۱۹۴۱ء ہے۔ ۵۴۲ اور یہی تاریخ آپ نے اخلاق عاطف ۵۴۳ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی۔ جو اس نے ۱۹۸۴ء میں ایک فارم فل کراتے ہوئے لی تھی۔ اس لئے مؤخر الذکر تاریخ ولادت صحیح تصور کی جاتی ہے۔ آپ کے والد کا نام دوست محمد تھا۔ جو اپنے بال بچوں کے ساتھ رتھک سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے اور پھلروان ضلع سرگودھا میں رہائش اختیار کی تھی۔

شوکت راز نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول پھلروان سے حاصل کی اور میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج سرگودھا میں داخلہ لیا۔ جہاں آپ نے تعلیم کے علاوہ غیر علمی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اگرچہ فوج، فارسٹ اور پولیس میں Select

ہوتے رہے لیکن آخری ملازمت شعبہ تدریس میں کی۔ جس میں ۱۹۹۰ء تک مختلف مقامات پر مختلف حیثیتوں میں خدمات انجام دیتے رہے۔

شوکت راز نے ۱۹۷۳ء میں پھلروان میں مجلس فکر و شعور کی بنیاد رکھی۔ یہ ادبی تنظیم نے آنے والوں کے لئے ایک اکیڈمی کا درجہ رکھتی تھی۔ اس تنظیم کے پلیٹ فارم پر جہاں کئی مشاعرے منعقد کئے گئے وہاں پبلشنگ کا کام بھی کیا گیا۔ جسے بعد میں شوکت راز اکیڈمی نے سنبھال لیا۔ آپ کی بھی تمام کتابیں اسی ادارے سے شائع ہوئیں جن کے نام ہیں۔ خراشیں (شعری مجموعہ)۔ کالا سورج (شعری مجموعہ)۔ رد عمل (شعری مجموعہ) ادراک (شعری مجموعہ) دستک (شعری مجموعہ)۔ پاداش (شعری مجموعہ)۔ توشہ (نعتیہ مجموعہ)۔ کچھ تے بول (پنجابی شاعری) فشار (کلیات) اور ”آپ اور آپ کے بچے“ (نفسیات)۔

شوکت راز نے ۲۵ فروری ۲۰۰۷ء کو وفات پائی اور پھلروان میں دفن ہوئے۔ جناب رئیس امر و ہوی نے آپ کی شاعری کے بارے کہا تھا:

”میں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں رکھتا کہ شوکت راز اس دور کا

نمائندہ شاعر ہے۔ اس کا شعور پختہ، فکر رسا، انداز بیان دلکش اور رنگ تغزل

مجتہد ہے۔“ ۵۳۳

بغرض مصلحت اغلاط کو تسلیم کیوں کرتا	میں سچا تھا منافق سے بھلا تفہیم کیوں کرتا
اگر یہ جانتا کہ ریزہ ریزہ ہو کے بکھروں گا	تو اپنی ذات کو لوگوں میں یوں تقسیم کیوں کرتا
حوالہ اس کو قدر آدمی کا کس لئے دیتا	درندہ ہے تو وہ انسان کی تکریم کیوں کرتا
اگر تو بھی محبت کے رویے سامنے رکھتا	تو تیرے درد کو الفاظ میں تجسیم کیوں کرتا
ترے شہروں کے حلقوں میں اگر کچھ بھی لچک ہوتی	تو پیدا گاؤں میں چھوٹی سی وہ تنظیم کیوں کرتا

وہ بونا ہے مجھے احساس ہے اس بات کا شوکت

مرے قد کو مجھے معلوم ہے تسلیم کیوں کرتا ۵۳۵

نعت

کامیابی کا تھا جو رستہ دکھایا آپ نے
جن کو کافر یہ سمجھتے تھے کہ ہیں حاجت روا
بے یقین افراد کو مژدا سنایا آپ نے
سب سے پہلے ان بتوں کو ہی گرایا آپ نے
کالی کملی کو جو چہرے سے ہٹایا آپ نے
اور کمزوروں کو سینے سے لگایا آپ نے
مجھ کو طیبہ کی طرف جس دن بلایا آپ نے
ساری دنیا کو نمونہ بھی دکھایا آپ نے
اک دیا صحراؤں میں ایسا جلایا آپ نے
یہ بھی کیا کم ہے کہ چہرہ ہی دکھایا آپ نے
آسماں پر ایسے لوگوں کو بٹھایا آپ نے
وہ قرینہ اہل طیبہ کو سکھایا آپ نے
ہر بڑے چھوٹے کو آتے ہی مساوی کر دیا
فرق رنگ و ذات کا ایسا مٹایا آپ نے

میں ہوں شوکت راز دم بھرتا ہوں آقا آپ کا

نعت گوئی کا سلیقہ بھی سکھایا آپ نے ۵۴۶

حضرت غلام نظام الدینؒ

حضرت صاحبزادہ غلام نظام الدینؒ معظمیؒ کا تعلق معظم آباد تحصیل بھلووال ضلع سرگودھا کی

معروف خانقاہ معظمیہ سے ہے۔ آپ حضرت خواجہ غلام سدید الدینؒ کے تیسرے فرزند تھے۔

پروفیسر طارق حبیب نے سہ ماہی شبیبہ کا حضرت خواجہ غلام نظام الدینؒ معظم آبادی رحمۃ

اللہ علیہ نمبر شائع کر کے اپنی عقیدت اور ارادت مندی کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

آپ کی ولادت ۲۴ جولائی ۱۹۳۱ء/۵۴۷/۲۸ جمادی الاخرہ ۱۳۶۰ھ/۹ ساون ۱۹۹۸ء بکری

بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات، دس بجے مرولیا نوالہ (حال معظم آباد) میں ہوئی۔ لیکن اسی شمارے میں طارق حبیب نے اپنے مضمون میں ۲۹ جمادی الآخر کی تاریخ لکھی ہے۔ چونکہ قمری تاریخ شام کے بعد تبدیل ہو جاتی ہے شاید طارق حبیب اور خولجہ معین نظامی کا بیان کردہ ایک دن کا درمیانی تفاوت اس بنا پر ہو۔

آپ کا نام غلام معین الدین تجویز ہوا۔ مگر حضرت شیخ الاسلام خولجہ محمد قمر الدین سیالوی کے حکم پر آپ کا نام ”غلام نظام الدین“ طے پایا۔

آپ کے والد محترم حضرت خولجہ غلام سدید الدین نے حضرت خولجہ محمد معظم الدین کے روضہ انور میں آپ کو الف، ب پڑھا کر آپ کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ۱۹۴۸ء میں مڈل سکول مرولیاں والا میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۶ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ آپ کو اسی دوران مصوری اور خطاطی کا شوق پیدا ہوا۔ حضرت حافظ محمد یوسف سیدی سے باقاعدہ فن خطاطی سیکھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۴ جون ۱۹۵۶ء کو روزنامہ امروز لاہور کی پیشانی پر ”امروز“ آپ کی خطاطی کا شاہکار شائع ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج سرگودھا میں تعلیمی سلسلے کو جاری رکھا فرسٹ ایئر میں تھے کہ اپریل ۱۹۵۹ء میں آپ کی شادی ہو گئی۔ ۱۹۶۲ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا اور پھر اوری اینٹل کالج لاہور میں ایم اے فارسی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۳ء میں فارسی اور پھر ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا اسی سال محکمہ خاندانی منصوبہ بندی میں بطور سپروائزر تقرری ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اردو اور فارسی دونوں شعبوں میں لیکچررشپ کے لئے درخواست دے دی جس پر آپ کو میونسپل ڈگری کالج بھلوال میں تعینات کیا گیا۔ جہاں آپ فارسی اور اردو دونوں پڑھاتے رہے۔ یہیں سے آپ نے افغانستان کی سیاحت بھی کی۔ بھلوال کے علاوہ آپ گورنمنٹ حشمت علی اسلامیا کالج راولپنڈی اور گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں بھی لیکچرار رہے۔ آپ کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران ہی پیٹ میں بڑھتی ہوئی رسولی کے آپریشن کیلئے العباس ہسپتال سرگودھا میں داخل ہونا پڑا۔ لیکن اسی دوران ۸ جولائی ۱۹۹۵ء/ ۱۰ صفر ۱۴۱۶ھ بروز ہفتہ رات ساڑھے ۹ بجے کے

قریب حرکتِ قلب بند ہونے سے آپ نے جانِ جانِ آفریں کے سپرد کر دیں۔ ۹ جولائی کو ساڑھے تین بجے سہ پہر صاحبزادہ جمال الدین صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور آپ کو خواجہ محمد معظم الدین کے روضہ مبارک کے مرکزی دروازے کے سامنے سپردِ خاک کیا گیا۔ ۵۲۸

حضرت خواجہ غلام نظام الدین کو بچپن ہی سے شعر و ادب سے دلچسپی تھی۔ حضرت خواجہ غلام سدید الدین آپ کو فارسی اور اردو کے نامور شعراء کے دواوین فراہم کرتے رہتے تھے۔ جن کے مطالعے سے آپ کا ذوقِ شعری نکھرتا گیا۔ آپ نے نظم اور نثر دونوں اصناف میں لکھا۔ آپ کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں۔

”شاخِ گل (شعری مجموعہ)۔ شعرِ ناب (کلاسیکی فارسی، اردو، پنجابی شعراء کا منتخب کلام اور ان پر تنقیدی حواشی و حالات)۔ چاندنی کا شہر (خطوط)۔ ہوا المعظم (خانقاہ معظمیہ کی صد سالہ تاریخ)۔ دیباچہ ہوا المعظم (رانج خانقاہی نظام کی خرابیاں اور اصلاحی احوال)۔ فوز المبین (خانقاہ معظمیہ کے متعلق اصلاحی منشور)۔ ایک سو سال بعد (حضرت شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی کے ملفوظات عالیہ) جھلک (افسانوی نثر اور علامتی افسانے) اس کے علاوہ حضرت یوسف سدید کی سوانح اور فن کے متعلق ایک تفصیلی کتاب“۔ ۵۲۹

آپ چونکہ صاحبِ فکر و نظر اور درویشِ باصفا تھے۔ جس کی جھلک آپ کی شاعری میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

جلوۂ حسن کو یہ پردۂ اظہار ہے تنگ	شورشِ عشق کو یہ کوچہ و بازار ہے تنگ
تیری مسند سے مری رفعتِ تخیل ہے پست	تری منزل کو مری وسعتِ افکار ہے تنگ
یہ زبان اور ترے اوصاف کا مضمون طویل؟	تیری مدحت کے لئے عرصہء گفتار ہے تنگ
جلد پیغامِ خلاصی تجھے مل جائے گا	اب تو کچھ اور طرح سے تیرا بیمار ہے تنگ
دل کو اے درد نہ چھیڑ اتنا کہ نالہ پھوٹے	نغمہء عشق کو یہ گنبدِ دوار ہے تنگ
ہم نے بازارِ سخن میں ہیں بکھیرے موتی	جنس گو مفت ہے یہ پھر بھی خریدار ہے تنگ

آج اک مست تڑپتے ہوئے کہتا تھا نظام
فیضِ ساقی ہے فزوں، ظرفِ قدحِ خوار ہے تنگ ۵۵۰

☆

چمن ہے مجھ سے چمن کی بہار مجھ سے ہے
چھری گلے پہ چلے اور پھڑک نہ ظاہر ہو
صبا ہے تجھ سے، چمن تجھ سے، داستاں تجھ سے
غرض ہوں میں تو تری ذاتِ جوہرِ اولیٰ
خدا بچائے مجھے ایسی قوم سے کہ جہاں
مرے قلم سے ہے روشن روایتِ اسلاف
لکھا ہے عہدِ معظم کا تذکرہ میں نے
مبالغہ ہے نہ کچھ اس میں جوشِ لافِ زنی
ترا طریق الگ ہے، مرا طریق جدا
عجب نہیں کہ ہو بخشش مری اسی کے سبب
کس انجمن میں ہوئے جمعِ شبنم و خورشید
ہمائے اورجِ سعادت ہوں، بتلائے امید
ابھی سے مسلکِ اسلاف میں یہ صدقِ صفا
جنابِ خواجہ معظم کے خانوادے میں
کلی کلی کا یہ تازہ نکھار مجھ سے ہے
جہاں عشق میں رسمِ شکار مجھ سے ہے
بس ایک گریہ بے اختیار مجھ سے ہے
ترا وجود ہی خود آشکار مجھ سے ہے
عزیر تر مرا عکسِ مزار مجھ سے ہے
بنائے عہدِ قدیم استوار مجھ سے ہے
بلند، نامِ شیوخِ کبار مجھ سے ہے
نظامیوں کا سرِ افتخار مجھ سے ہے
رجوع ایک ہے تجھ سے، ہزار مجھ سے ہے
جو تیرے خانہء دل میں غبار مجھ سے ہے
منافقوں کا ہمیشہ فرار مجھ سے ہے
قدم قدم پہ یمین و یسار مجھ سے ہے
فروعِ نسبتِ اہلِ دیار مجھ سے ہے
نظامِ خاقمی برقرار مجھ سے ہے
فیوضِ دورِ معظم کی تابشوں کا نظام

خدا کے فضل سے نصف النہار مجھ سے ہے ۵۵۱

☆

مظہر جعفری

راقم نے ”نعت گویان سرگودھا“ میں مظہر جعفری کا سن ولادت ۱۹۵۰ء ۵۵۲ تحریر کیا ہے۔ چونکہ یہ پھلروان سے افضل گوہر نے اندازاً بتایا تھا جس کی تصدیق محمد اسلم ایڈووکیٹ (پھلروان) نے بھی کر دی تھی۔ لیکن بعد میں مظہر جعفری کے اپنے ہاتھوں سے لکھی تاریخ ولادت ”یکم اکتوبر ۱۹۴۱ء“ ۵۵۳ مل جانے پر تصحیح کا حق استعمال کرتا ہوں۔

مظہر جعفری کا اصل نام مظہر حسین تھا۔ جبکہ مظہر جعفری اور مظہر سیاہ پوش کے ناموں سے اپنی پہچان رکھتا تھا۔ آپ کے والد کا نام فضل الہی تھا۔ جو ضلع انبالہ سے مع بال بچوں کے ہجرت کر کے آئے تھے۔ مظہر نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول پھلروان سے پاس کیا اور پھر ہومیو پیتھی میں ڈپلومہ حاصل کر کے پریکٹس کرنے لگے۔ اور اسی کو ہی اپنا وسیلہ حصول رزق بنائے رکھا۔

مظہر نے سکول میں طالب علمی کے دوران ہی شوقِ شعری پال لیا تھا۔ لیکن اسے اپنی مجبوری یا ضرورت کبھی نہیں بنایا۔ بس شوق کی حد تک کبھی کبھی کچھ کہہ لینے پر ہی اکتفا کر لیا۔ کبھی کبھی اور کسی کسی مشاعرے میں بھی شرکت کر لیا کرتے۔ اور پھر ایک دن منڈی بہاؤ الدین سے مشاعرہ پڑھ کر ٹرین میں رات کو واپس پھلروان آ رہے تھے۔ ڈبے میں رش ہونے کی وجہ سے دروازے میں ہی بیٹھ گئے۔ اور ٹرین جبکہ پھلروان سے ایک دو میل پیچھے تھی تو نہ جانے کیا ہوا۔ باہر گر گئے اور فوراً ہی موت نے آیا۔ یہ ۱۹۹۵ء کے لگ بھگ حادثہ پیش آیا۔

مظہر سیاہ پوش نے کتنا لکھا اور وہ کس کے پاس ہے کوئی نہیں جانتا لیکن چند ایک رسائل میں اس کا کلام بکھرا پڑا ہے۔ کچھ مظہر جعفری کے نام سے اور کچھ مظہر سیاہ پوش کے نام سے۔ اور اسی بکھرے کلام سے نمونے کے طور پر یہ انتخاب کیا گیا ہے۔

نعت رسول مقبول ﷺ

یا محمد مصطفیٰ تیرے سوا کوئی نہیں منبع دینِ خدا تیرے سوا کوئی نہیں!

جو تجھے بھولا وہ بھولا ہے خدا کی ذات کو
 چاندنی اور کہکشاں شمس و قمر تیرے لئے
 تو غریبوں کا ہے مولا بے کسوں کا آسرا
 جو نہیں رب سے جدا تیرے سوا کوئی نہیں
 رونقِ ارض و سما تیرے سوا کوئی نہیں
 میرا بھی مشکل کشا تیرے سوا کوئی نہیں
 آل سے تیری محبت، مظہرِ دینِ خدا
 مظہرِ نورِ خدا تیرے سوا کوئی نہیں ۵۵۴

یہی نعت ”جانِ رحمت“ میں چند ایک تبدیلیوں کے ساتھ شامل کی گئی ہے۔ جو کچھ یوں ہے۔
 یا محمدؐ مصطفیٰ تیرے سوا کوئی نہیں
 جو ترا منکر وہ منکر ہے خدا کی ذات کا
 یہ جہاں شمس و قمر ہیں بس تیرے ہی واسطے
 تا ابد تو مصطفیٰ ہے تو ہی محبوبِ خدا
 ہے تہیٰ خیرالوریٰ تیرے سوا کوئی نہیں
 جو نہیں رب سے جدا تیرے سوا کوئی نہیں
 وجہِ تخلیق و بنا تیرے سوا کوئی نہیں
 تا قیامت مجتبیٰ تیرے سوا کوئی نہیں
 نعت لکھی تھی لکھی ہے اور لکھتا جاؤں گا
 مقصدِ اعلیٰ مرا ترے سوا کوئی نہیں ۵۵۵



تمہارے شہر میں اک داستاں ہم چھوڑے جاتے ہیں
 ذرا تم غور سے سننا فغاں ہم چھوڑے جاتے ہیں
 فقط دو سانس پر موقوف تھی جب زندگی اپنی
 تمہاری دوستی دیکھو کہاں ہم چھوڑے جاتے ہیں
 جبیں سے خون جو ٹپکا وہ سجدوں کا امیں ہو گا
 تم اپنا آستاں دیکھو نشاں ہم چھوڑے جاتے ہیں
 میں اک شیشے کا انساں تھا یہاں، ہاتھوں میں پتھر تھے
 وفا سے بے خبر لوگو جہاں ہم چھوڑے جاتے ہیں

خرد والوں کی مظہر بے حسی اک زہر قاتل تھی
قلم کاغذ زباں سب کچھ یہاں ہم چھوڑے جاتے ہیں ۵۵۶

لیفٹیننٹ کرنل محمد افضل ملک

ضلع سرگودھا کی مغربی پٹی (جواب ضلع خوشاب کا حصہ ہے) کے لوگ فوج کی ملازمت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس ترجیح میں وطن سے محبت کا جذبہ بہر حال کارفرما ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا آ رہا ہے۔ کرنل محمد افضل بھی اسی جذبے کے تحت فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کے رینک سے شامل ہوئے اور لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر پہنچے۔ بقول اسد بھٹی ۱۹۸۰ء میں آپ نے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ۵۵۷

لیکن مجھے اُن کی ریٹائرمنٹ کی تاریخ میں شک ہے۔ کیونکہ محمد افضل ملک ۱۹۴۲ء میں رسالدار عطا محمد وراہ کے ہاں موضع ہڈالی ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ ہائی سکول ہڈالی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اگر انٹرمیڈیٹ کے بعد فوج میں کمشن لیا ہو تو فوج کے لئے منتخب ہونے کی عمر ۱۸ سال ہوگی۔ یوں فوج میں جانے کا سن ۱۹۶۰ء سے پہلے نہیں ہو سکتا۔

آرمی لسٹ میں ۵ جولائی ۱۹۴۲ء کو پیدا ہونے والے محمد افضل خان کے فوج میں کمشن پانے کی تاریخ ۱۹ اپریل ۱۹۶۳ء ہے جبکہ بحیثیت کیڈٹ فوج میں شامل ہونے کی تاریخ ۵ جولائی ۱۹۶۲ء ہے۔ اس محمد افضل خان نے فرنٹیر فورس رجمنٹ میں کمشن حاصل کیا تھا۔ یوں اُن کے ریٹائرمنٹ کی تاریخ ۱۹۹۰ء یا ۱۹۹۳ء بنتی ہے۔

بہر حال ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے پاکستان سٹیل ملز میں ملازمت اختیار کر لی اور ترقی کر کے اس کے چیئرمین کے عہدے تک پہنچے۔ تب تک آپ کے بارے کسی کے علم میں نہیں تھا کہ آپ شعر بھی کہتے بالکل ایسے ہی جیسے جنرل کے ایم عارف نے جر نیلی میں خود کو ظاہر کیا تھا۔ یہ ایک

پیشہ و رانہ مجبوری کہہ لیں۔ چیئر مین بننے پر جب آپ نے وہاں شاعروں کا انتظام کیا اور ان میں اپنا کلام بھی سنایا تو لوگوں کے علم میں آپ کے شاعر ہونے والی جہت آئی۔ لیکن ان ادبی محفلوں میں بہت کم آپ کو اٹھنا بیٹھنا نصیب ہوا کیونکہ اسی دوران ۲۰۰۳ء میں آپ نے وفات پائی۔

کرنل محمد افضل ایک عمدہ منتظم اور دیانتدار افسر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ جب آپ پاکستان سٹیل ملز کے چیئر مین بنے تو ملز نقصان میں جا رہی تھی۔ آپ نے ایک مختصر عرصے میں نہ صرف غیر ملکی قرضے ادا کیے بلکہ اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے منافع بخش بنا دیا۔ آپ کو حکومت پاکستان نے ستارہ امتیاز سے بھی نوازا۔

کرنل محمد افضل خان کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ پہلی غزل میں لفظوں کی تکرار سے ا خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ دوسری رجوعی غزل کا تجربہ ہے۔

خواب سہانے سنے، سنے ہوتے ہیں	خواب پرانے سنے اپنے ہوتے ہیں
میں سمجھا تھا غیر بھی اپنے ہوتے ہیں	غیر تو سارے اپنے اپنے ہوتے ہیں
کتنی نظریں ہوتی ہیں اک چہرے پر	اک اک آنکھ میں کتنے سنے ہوتے ہیں
آگے پیچھے دوست بھی دشمن جیسے ہوں	اپنے سامنے غیر بھی اپنے ہوتے ہیں
خوشیاں بانٹیں تو مل جائیں لوگ کئی	آنسو سارے اپنے اپنے ہوتے ہیں
سچ سے تالی دو ہاتھوں سے بجاتی ہے	لیکن دونوں ہاتھ تو اپنے ہوتے ہیں

کچھ آنکھیں تو خالی ہوتی ہیں افضل

کچھ آنکھوں میں لاکھوں سنے ہوتے ہیں



چلتے چلتے راہ میں ہنس دے کوئی میری طرح	میرا جی چاہے مجھے دیکھے کوئی میری طرح
رہ گزر پر روکنا چاہوں خیالوں میں اسے	میرا جی چاہے مجھے روکے کوئی میری طرح
کیا بتائیں کس قدر بے تابیاں ہیں موجزن	میرا جی چاہے مجھے چھو لے کوئی میری طرح

میں نہیں منکر بدن کی قربتوں کا تو مگر میرا جی چاہے مجھے سوچے کوئی میری طرح
 لمحہ لمحہ اک نیا چہرہ نئی خواہش کے ساتھ میرا جی چاہے مجھے مانگے کوئی میری طرح
 سانس کی ڈوری سے اس کی یاد باندھی تھی کبھی میرا جی چاہے مجھے بھولے کوئی میری طرح
 میں نے تو چاہا کسی کو یوں کہ گویا کائنات میرا جی چاہے مجھے چاہے کوئی میری طرح
 فرقتوں میں، قربتوں میں، سوچ میں، احساس میں میرا جی چاہے مجھے سہ لے کوئی میری طرح
 ساری دنیا سے الگ افضل کوئی مجھ سا لگے

میرا جی چاہے مجھے سمجھے کوئی میری طرح ۵۵۸

پروانہ شاہ پوری

شاہ پور، ضلع سرگودھا کا ایک متوسط دور کا شہر، جو سرگودھا کے ضلعی صدر مقام بننے سے پہلے خود ضلعی صدر مقام تھا۔ لیکن اپنی ادبی پہچان بنانے میں ناکام رہا۔ البتہ محمد حیات جو پروانہ شاہ پوری کے نام سے پنجابی ادب میں اپنا مقام بنا پائے اسے بھی ایک پہچان دے گئے۔

محمد حیات پروانہ شاہ پوری حافظ محمد دین کے ہاں ۲۰ دسمبر ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جو مکمل تعلیم کی صورت اختیار کر گئی یعنی پرائمری جماعت تک شاہ پور شہر سے حاصل کی۔ ہاں! بعد میں فاضل پنجابی کا امتحان پاس کیا۔ اور اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ نعت خوانی کا شوق آپ کو نعت نگاری کی طرف لے آیا اور فاضل پنجابی آپ کے منظوم قصے کہانیوں کا سبب بنا۔ آپ نے شاعری کا آغاز ۱۹۶۲ء میں کیا اور پنجابی کے معروف اور معتبر شاعر دائم اقبال دائم کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔

بعد ازاں آپ سرگودھا شفٹ ہو گئے۔ کچھ عرصہ دیار غیر میں بھی گزارا۔ پروانہ شاہ پوری خود استاد کی مقام پر پہنچ گئے تھے۔ کئی تنظیموں کے ساتھ منسلک رہے۔ جن میں پنجابی ادبی محفل، حلقہ ارباب ذوق، بزم اہل سخن سرگودھا رائٹرز کلب اور پاکستان رائٹرز گلڈ وغیرہ شامل ہیں۔ پروانہ خوش الحان اور خوش تحریر تھے ہی، خوش گفتار بھی تھے۔ پنجابی زبان کے فروغ کے لیے اگرچہ بہت کام

کیا اور کئی ایوارڈ حاصل کیے لیکن کتابچوں (قصے کہانیوں) سے آگے نہ بڑھ سکے اور وہ قصے ہیں۔
 پاکستان شیر، بارہ ماہ، گرتوبہ جنت جاویں گا۔ جیسے آٹھ کتابچوں کے نام آپ نے بتائے
 تھے۔ ۵۵۹ زندگی کے آخری دور میں آپ ریڈیو پاکستان سرگودھا سے منسلک تھے، مفت روزہ ”فریاد“
 سرگودھا نے آپ کے اعزاز میں ایک خصوصی نمبر ”بشن پروانہ شاہ پوری“ شائع کیا تھا۔ جس میں بہت
 سے اہل قلم آپ کی شخصیت اور فن پر تحریریں شامل تھیں۔ اقبال ندیم کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

تیرے سوہنے گیتاں دے وچہ سدھراں ڈھلکاں مار دیاں

تیریاں غزلاں گل سناون دکھاں نال یرانے دی

وچ ہنیریاں تیرے اکھر رج کے چانن ونڈدے نیں

توں جدوں کی بیعت کیتی سخی سیال گھرانے دی

پروانہ شاہ پوری نے ۶۸ سال کی عمر پا کر ۱۱ اگست ۲۰۱۰ء کو سرگودھا میں وفات پائی اور

مقام حیات کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

نعتیہ تضمین

کروں شان اُن کی میں کیا بیاں	کہ ہیں اُن کے سائے میں دو جہاں
سر عرش حق سے ملے ہیں وہ	بلغ العلیٰ بکمالہ
ہیں حسین جملہ جہاں سے وہ	ہیں عظیم کون و مکان سے وہ
نہیں اُن سا کوئی جہاں میں	کشف الدجیٰ بجمالہ
ہے حسین اُن کی ہر اک ادا	کہ ہر اک ادا ہے خدا نما
وہ کرین حُسنِ جہان ہے	حسنت جمیع خصالہ
میں ثنا خلقِ عظیم پر	ہو سلام درِ یتیم پر
ہو درود آپ کی آل پر	صلو علیہ والہ

غزل

ہے میرے دل میں اندھیرا اجاڑ گھر کی طرح خدا کرے کوئی آئے یہاں سحر کی طرح
جفا کی دھوپ سے ہارے مسافروں کے لیے کھڑے ہیں راہ میں ہم تو گھنے شجر کی طرح
میں دوڑتا ہوں کہ آگے ہر ایک سے نکلوں یہ اٹھ رہے ہیں قدم ریت کے سفر کی طرح
بھٹک رہا ہوں ابھی ریگزار ہستی میں ملا نہ راہنما کوئی بھی خضر کی طرح

ہوئے ہیں اور بھی شاعر جہاں میں پروانہ
”ہوا نہ کوئی خدائے سخن ببر کی طرح“ ۵۶۱

جاوید اختر سید

سید جاوید اختر ۱۰ جنوری ۱۹۴۸ء ۵۶۲ ۱۰ جنوری ۱۹۴۳ء ۵۶۳ سرگودھا میں پیدا ہوئے۔

آپ کے والد معروف تاریخ دان، ادیب اور عالم رشید اختر ندوی تھے۔

سید جاوید اختر نے تعلیمی مراحل رحیم یار خان میں طے کئے۔ اردو میں ایم اے کیا اور

بینکاری کے شعبے میں ملازمت اختیار کر لی۔ اور بہاولپور میں مستقلاً قیام پذیر ہوئے۔ بعد ازاں آپ

نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہو گئے۔ ۲۰۰۴ء کے لگ بھگ

آپ کا انتقال ہوا اور آپ دنیا کے اس منظر نامے سے روپوش ہو گئے لیکن آپ کی قلمی کاوشیں آپ کو

زندہ رکھیں گی۔ آپ ایک نثر نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے تھے شعر بھی اگرچہ کہتے تھے لیکن

بہت کم۔ نثری حوالے سے آپ کی جو کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: (۱)

بے تیغ سپاہی (ترجمہ) (۲) ویران محل (بچوں کا ناول) (۳) اک شاخ تمنا (ناول) (۴) زہر

خوشی کا (افسانے) (۵) کس سے منصفی چاہیں (افسانے) (۶) مٹی اور شگوفے (ڈرامے) (۷)

دوستی کی شاہراہ پر (سفر نامہ)۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

کچھ اس طرح سے آج تری یاد آگئی قلب و نظر پہ درد کی برکھا سی چھا گئی

حسن و جمالیات کے سانچے دھرے رہے بس اک ادائے ناز مرے دل کو بھاگنی
 جانے لگی تو آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے واپس ہوئی تو جان میں پھر جان آگنی
 جیسے فلک پہ چاند کی تنویر پھیل جائے اس طرح میری ہستی پہ وہ شکل چھاگنی
 روتا ہوں اپنے دوست کی تصویر دیکھ کر
 آخر نجانے اس کو نظر کس کی کھاگنی ! ۵۶۳

لینڈاسکیپ

ریل کی پٹری سے کچھ آگے
 اک مل ہے
 مل کے اوپر اونچی چمنی
 دھواں اگلتی
 سہ منزل تک روشن کمرے
 جن میں کئی مزدور
 شور مچاتے پہیوں پر ہیں
 کام میں دھت مخمور
 مل کے پیچھے پھیلا ہے آکاش
 دور افق پر نیا نویلا چاند
 جیسے ہواک خنجر براں
 ویسا ہے یہ چاند

محمد نواز نسیم

راقم (شاگرد کنڈان) نے ”نعتِ حضور اور ضلع سرگودھا کے شعراء“ کی ترتیب میں محمود نواز

نسیم کی گیارہ اشعار کی ایک نعت درج کی تھی جس کا مطلع تھا۔

ہدیہ آقا کو دو وفاؤں کا

زور پھر دیکھنا جزاؤں کا

جس پر راجا رشید نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا:

”جناب شاکر کنڈان نے نواز نسیم کے نمونہ کلام کے طور پر گیارہ

اشعار کی جو نعت دی ہے وہ مدیر ”نعت“ راجا رشید محمود کی ہے اور ان کے

مجموعہ کلام ”منظومات“ میں بھی چھپ چکی ہے۔ عمران نقوی نے روزنامہ

”نوائے وقت“ لاہور میں ان کے انٹرویو کے ساتھ بھی شائع کی تھی۔“ ۵۶۵

دراصل وہ نعت محمد نواز نسیم کی وفات کے بعد آستانہء فضل سے شائع ہونے والی ان کی

تصنیف ”فضل القرآن“ سے لی گئی تھی۔ اس کتاب کا حصہ سوم تفسیر القرآن اور حصہ چہارم منظومات

پر مشتمل ہے۔ ان منظومات میں کئی ایک کے مقطع میں نسیم تخلص بھی استعمال کیا گیا ہے جو اس بات کا

ثبوت ہے کہ یہ سارا کلام محمد نواز نسیم ہی کا ہے۔ مثلاً ایک غزل کا مقطع ملاحظہ ہو۔

کون سا گیت مر گیا ہے نسیم

سسکیاں بھر رہی ہے شہنائی

کتاب میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ دوسرے شعراء کی منظومات کون سی ہیں یا کیوں شامل کی

گئی ہیں۔ اب کے مجھے تھوڑا احتیاط سے کام لینا پڑ رہا ہے۔

جناب محمد نواز نسیم کا تعلق انگہ تحصیل خوشاب کے جناب مولوی سلطان محمود مرحوم کی نسل

سے تھا۔ وہ تعلیم کے حصول کے بعد کہیں تک نہ بیٹھے۔ اُن کے اندر کوئی ایسی کسک تھی جو انہیں جگہ

جگہ لئے پھری۔ پھر یوں ہوا کہ آستانہ فضل نزد ۴۹ ٹیل سرگودھا آئے اور ایک روحانی سکون محسوس

کرتے ہوئے یہیں کے ہو رہے۔ ایک درویش منش کو کیا چاہیے۔ صحافت کو بھی اپنایا اور جو مضامین

لکھے وہ بھی صوفیانہ روش کے تھے۔ قرآن مجید کی چند آیات منتخب کر کے اُن کی تفسیر بھی لکھی۔ شعر بھی

کہے لیکن شاعری کو بھی اپنی ڈگر سے ہٹنے نہیں دیا۔ جو حد بندی انہوں نے نثر میں روارکھی تھی شاعری میں بھی اس پر کاربند رہے۔

محمد نواز نسیم نے ۱۱۴ اگست ۱۹۹۴ء کو جس وقت فضا میں قومی ترانے کا مصرع ”تو نشانِ عزمِ عالی شان“ گونج رہا تھا اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی تحریروں کو یکجا کر کے ”فضل القرآن“ کے نام سے جناب ظہور سبحانی نے کتاب مرتب کی۔ جس کے چار ابواب ہیں۔ پہلے حصے میں مضامین شامل ہیں جن میں سے اکثر مضامین اخباروں میں شائع ہو چکے تھے۔ دوسرا حصہ وظائفِ آیات پر مشتمل ہے جبکہ تیسرا چوتھا حصہ جیسے اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ آپ کی منظومات میں زیادہ کلامِ نعتیہ ہے۔ جبکہ غزل بھی شامل کی گئی ہے۔

نعت شریف

تاجدارِ حرم، شاہِ والا کرم بحرِ جود و کرم، حسنِ لوح و قلم
وارثِ ہل آتی، مصطفیٰ مصطفیٰ

فخرِ کون و مکاں، باعثِ کن فکاں رحمتِ دو جہاں، ہادیِ انس و جاں
خاتمِ الانبیاء، مصطفیٰ مصطفیٰ

ہے بشیرِ آپ سا، دستگیرِ آپ سا بے نظیرِ آپ سا، دل پذیرِ آپ سا
کون بعد از خدا، مصطفیٰ مصطفیٰ

رختِ سادہ ترا، عرشِ جادہ ترا حقِ لبادہ ترا، دل کشادہ ترا
تو عطا ہی عطا، مصطفیٰ مصطفیٰ

تو امیرِ عرب، تو ہی مدوحِ رب تیرا امی لقب، تجھ سے منسوب سب
عظمتِ واعتملا، مصطفیٰ مصطفیٰ

گھر ترا خاک پر، ذکرِ لولاک پر ہفت افلاک پر، فہم و ادارک پر
کب یہ عقدہ کھلا، مصطفیٰ مصطفیٰ

اے رسولِ زمن، انجمن انجمن تو ہی جلوہ فگن، دل میں تیری لگن
لب پہ تیری ثنا، مصطفیٰ مصطفیٰ

نور ہی نور تو، خندہ طور تو حق کا منشور تو، حسب دستور تو
منظرِ جاں میں آ، مصطفیٰ مصطفیٰ

میرے افکار میں، ذکر و اذکار میں حرف و اظہار میں بزمِ سرکار میں
تو صد ادرصد، مصطفیٰ مصطفیٰ

غزل

دل کو ناداں کہوں کہ سودائی بھیر میں ڈھونڈتا ہے تنہائی
میں وہ ناداں کہ شہرِ طفلان میں بیچتا پھر رہا ہوں دانائی
گفتگو کا ہنر نہ کام آیا عقل کی جیب کٹ گئی بھائی
یہ بتا شہرتوں کی منڈی میں بک گئی کیسے تیری رسوائی
مان لوں کیسے اس کو میں دریا جس نے ہونٹوں کو پیاس پہنچائی
کون سا گیت مر گیا ہے نسیم
سکیاں بھر رہی ہے شہنائی ۵۶۶

اختر امان

اختر امان کا خاندانی نام امان اللہ ملک ہے۔ آپ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۳ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے
۱۹۷۰ء تاریخ پیدائش کے بارے ماہنامہ اخبار اردو کی ۱۱ ستمبر ۱۹۶۸ء کی دی ہوئی تاریخ کو میں اس بنا پر
یہاں رد کرتا ہوں کہ ”ماہنامہ شاعر، ہم سر اردو ادب نمبر“ ۱۹۶۹ء ”ہمارے اہل قلم“، ۱۹۷۰ء ”سخنوران
سرگودھا“ ۱۹۷۰ء اور سب سے بڑھ کر اختر امان کا شعری مجموعہ ”خوابوں کے بے نام جزیرے“ ۱۹۷۲ء میں
۱۴ ستمبر ہی تاریخ متفقہ طور پر درج ہے۔ آپ نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور سرکاری ملازمت

اختیار کر لی جبکہ صحافت میں بھی باقاعدہ اپنا شوق پورا کرتے رہے جو سکول کے زمانے سے ادبی حیثیت سے شروع ہوا تھا۔ پہلی تحریر ساتویں جماعت میں لکھی۔ اور پہلا شعر ماسٹرز کے بعد کہا۔ جبکہ اسی دوران افسانہ بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ روزنامہ ”شعلہ“ سے صحافتی زندگی کی ابتدا کی۔ سرگودھا سے ہی ”نوائے سرگودھا“ کے نام سے ایک مفت روزہ جاری کیا۔ جو زیادہ مدت نہ چل سکا۔ بعد ازاں روزنامہ ”تعمیر“ راولپنڈی روزنامہ ”نوائے وقت“ لاہور۔ روزنامہ ”امروز“ لاہور۔ ماہنامہ ”راہ نما“ اسلام آباد۔ روزنامہ ”نوائے وقت“ راولپنڈی۔ روزنامہ ”مسلم“ اسلام آباد سے کسی نہ کسی حیثیت سے منسلک رہے۔

اختر امان نے انگریزی، اردو اور پنجابی زبان میں شاعری، افسانہ، تنقید، کالم نگاری، خاکہ، انشائیہ، سیاسی مضامین وغیرہ میں اپنی نگارشات چھوڑی ہیں۔ سید ضمیر جعفری کا کہنا ہے کہ:

”اختر امان گھسے پٹے، روایتی، رسمی جملوں کو پسند نہیں کرتا۔ مگر یہ جملہ تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ اختر امان ایک تازہ طرز شاعر، مستند ادیب اور چوکس دانشور کی حیثیت سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بلکہ جب سے روزنامہ ”نوائے وقت“ کا ادبی ایڈیشن اس کے ہاتھوں سے پروان چڑھنے لگا ہے اور ادبی ماہنامے۔۔۔ قبرستان میں اترنے لگے ہیں۔“ ۵۷۳

جاوید انور نے اختر امان کی شاعری کو یکسانیت سے تنگ آئے ہوئے ایک نارمل انسان کی شاعری کہا ہے۔ اور ایک ایسی منزل کی سمت نما قرار دیا ہے جس کے کم از کم خواب دیکھنا تو ہم سب کا فرض بنتا ہے۔ ۵۷۴

اختر امان کا شعری مجموعہ اگرچہ ایک ہی شائع ہوا ہے لیکن وہ اپنی پہچان رکھتا ہے۔ اردو شاعری کے اپنے وقت میں اس نے قاری اور نقاد کو کچھ سوچنے کی طرف ضرور مائل کیا۔ ”خوابوں کے بے نام جزیرے“ (شعری مجموعہ) کے علاوہ ”سات رنگ“ اس کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے:

Pakistan and the challenge of history.

Pakistan new trends in Foreign Policy.

Z.A. Bhutto the political thinker (co-author)

اور The Role of Opposition in Pakistan آپ کی مطبوعہ کتب ہیں۔ جبکہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ”تضادات“ انٹرویوز ”ملاقاتیں“ سفر نامہ ”ایک سمندر پار“۔ افسانے ”شناخت“ اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین بعنوان ”ابھی عشق کے امتحان“ کے مسودے تیار تھے۔ جب آپ ۱۹ مارچ ۲۰۰۲ء/ ۴ محرم الحرام ۱۴۲۳ء کو بروز منگل اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ چونکہ اسلام آباد دوران ملازمت آپ نے وفات پائی اس لئے وہیں مرکزی قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ نے کسی سے متاثر ہو کر یا کسی کو آئیڈل بنا کر شعر نہیں کہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مختلف سوچ اور فکر کی مختلف اصناف میں ہمیں ان کے مجموعہ کلام میں شعر ملتے ہیں۔ اور آپ کی اس بات سے ہمیں اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ:

”شعر ذہن کے لئے ایک کھڑکی کا کام دیتا ہے۔ یہ ایک روزن

ہے۔ ایک زینہ ہے جس سے تازہ ہوا کے جھونکے اور روشنی کی کرنیں شخصیت

کے تہہ خانے میں در آتی ہیں“ ۵۷۵

غزل

اک پیڑ ہوں اور سرد ہواؤں میں گھرا ہوں
 اک چوٹ سے شیشے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں
 باہر سے تو سوکھا ہوں پر اندر سے ہرا ہوں
 تو نے تو یہ سمجھا تھا میں پتھر سے بنا ہوں
 سوچا تھا کہ لوٹ آؤں گا ان قدموں پہ گھر کو
 اب دشت میں پاؤں کے نشاں ڈھونڈ رہا ہوں
 آنکھوں کو ذرا کھول کے جھانکو مرے اندر
 سورج ہوں مگر کہر کی چادر میں چھپا ہوں

اب قہقہے کی مثل سرِ راہ جلوں گا

اے اندھی ہوا میں کوئی مٹی کا دیا ہوں ۵۷۶



یہاں موسم بھی بدلیں تو نظارے ایک جیسے ہیں
 ہمارے روز و شب سارے کے سارے ایک جیسے ہیں
 ہمارا کس لیے احساسِ محرومی نہیں جاتا
 کہ سب قسمت کے ماروں کے ستارے ایک جیسے ہیں
 کہیں گر فرق نکلے گا تو بس شدت کا کچھ ورنہ
 یہاں پر غم ہمارے اور تمہارے ایک جیسے ہیں
 ہمیں ہر آنے والا زخم تازہ دے کے جاتا ہے
 ہمارے چاند سورج اور ستارے ایک جیسے ہیں
 خدایا تیرے دم سے اپنا گھر اب تک سلامت ہے
 وگرنہ دوست اور دشمن ہمارے ایک جیسے ہیں
 میں کس امید پر دامن کسی کا تھام لوں اختر
 کہ سب سے دوستی میں اب خسارے ایک جیسے ہیں ۵۷۷

عاشق حسین عاشق

عاشق حسین ولد وزیر محمد ۱۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو موضع ڈھا کہ (سون سکیر) ۵۷۸ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کا امتحان ۱۹۶۰ء میں گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ تحصیل خوشاب سے پاس کیا اور اسی سال یعنی ۱۹۶۰ء میں روزگار کے سلسلے میں راولپنڈی منتقل ہو گئے۔
 قمر عینی عاشق حسین عاشق کے ضمن میں لکھتے ہیں:

”۱۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ تلاش معاش

کے سلسلے میں مدت سے راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ غزل، نظم، ہائیکو، ماہیہ پنجابی گیت، ملی نغمے اور نعت رسول مقبول سبھی کچھ کہتے ہیں۔ مرضی اودان پر

خاص محنت کر رکھی ہے۔“ ۵۷۹

یہاں میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ قمر عینی نے ۱۹۳۵ء اور میانوالی کہاں سے لے لیا ہے۔ جبکہ راقم کو عاشق حسین عاشق نے ایک خط میں مندرجہ بالا حوالے کے علاوہ درج ذیل کوائف کچھ اس طرح عنایت کئے تھے

”پیشہ: نجی حساب نویسی (اکاؤنٹنسی)۔ ابتداء شاعری: ۱۹۸۶ء نعتیہ (اردو) روحانی استاد: اعلیٰ حضرت احمد رضا بریلوی بحوالہ حدائق بخشش کامل ابتدائی ظاہری پرائمری استاد: عرفان رضوی ریٹائرڈ ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر راولپنڈی عروضی دسترس: ۱۹۸۷ء از خود تحقیق کے جاں سوز مرحلہ کے بعد دیگر اصناف سخن: حمد۔ مثبت غزل۔ ملی نغمے۔ نظمیں۔ پنجابی میں نعت، مثبت غزل، ملی نظم تخلیق: ۱۹۸۷ء میں نعتیہ کتاب ”بستان فیوض“ (نعت ہائے سیدالکونین در یک صد بحر) نعتیہ بیاض میں موجود بحروں کی تعداد: ۵۰۰ سے تجاوز، ذرائع ابلاغ تک رسائی: ۱۹۸۹ء سے ٹی وی، ریڈیو، اخبارات میں وقفے وقفے سے ادبی وابستگی: نعتیہ بزم ”کنج نعت“ راولپنڈی“ ۵۸۰

قمر عینی کی تحریر پر میں زیادہ گفتگو نہیں کروں گا۔ دونوں تحریریں سامنے ہیں۔ آپ راولپنڈی میں ہی آخری لمحوں تک دکانداری سے رزق حلال کمانے میں مصروف رہے۔ ابلاغ تک رسائی بالکل محدود ہو کر رہ گئی تھی اور نہ ہی مشاعروں وغیرہ میں جانے کا تردد کرتے تھے۔ ”بستان فیوض“ میں کمال یہ ہے کہ ۱۰۰ نعتیں شامل ہیں اور ہر نعت کی بحر دوسری سے الگ ہے۔ یوں ۱۰۰ بحر اس کتاب میں طبع آزمائی کے تحت شامل کی گئی ہیں۔

نعت کے بارے کیا لکھا جائے۔ یہ ہوتی ہے اس وقت ہے جب ذہن اور دل میں حضور نبی کریم کی ذات اقدس موجود ہو اور آپ کی سیرت نگاہوں میں بسی ہو۔ اور جو شخص صرف نعت ہی لکھتا ہو اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس کا ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بس دل میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔

سلطان رشک لکھتے ہیں:

”بستانِ فیوض، کا شاعر صرف اور صرف نعت کہتا ہے۔۔۔ اسی لئے ان کے

فن میں بلا کی پختگی ہے۔ اور اسے اس فن پر پوری دسترس حاصل ہے.....

سو بحر میں نعتیں اور اس میں صرف فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ہی نہیں۔ اچھی

نعتیہ شاعری کا اندراج بھی ہو تو کیا یہ فن شاعری میں کارنامہ نہیں اور کیا یہ ہم

ایسے شعر کے طالب علموں کے لئے سبق آموز نہیں۔ یقیناً ہے۔“ ۵۸۱

عاشق حسین عاشق نے ۲۶ ستمبر ۲۰۰۸ء بروز جمعہ الوداع راولپنڈی میں ہی وفات پائی۔

وفات تک آپ ۹۶۴ بحر میں نعت کہہ چکے تھے۔

نعت رسول مقبول ﷺ

خرد و شعور کے رہنما کو سلام ہو حکم و فیوض کے مقتدی کو سلام ہو
 نئے دور کی نئی روشنی کی اساس کا ہمہ دور نور کی ہر ادا کو سلام ہو
 وہ ادب نواز کہ بردہ بخش کہیں جسے بہ درود اس سخن آشنا کو سلام ہو
 نئی راہیں کھول دیں ہم پہ علم و فنون کی خیر حدیث رسولنا کو سلام ہو
 جو ہزاروں لاکھوں سروں پہ سایہ فلگن ہوئی اس انیس ہر دوسرا ردا کو سلام ہو
 مرے غوث کے مرے چارہ ساز حضور کے ہر اک ارتقا کی ہر انتہا کو سلام ہو
 میری حسرتوں میری چاہتوں کے وفور کا مہ حق رساشہ انبیاء کو سلام ہو
 بعد احترام و خلوص دل مرے میر کو میرے شاہ کو مرے مصطفیٰ کو سلام ہو

بہ سمن بہ لالہ بہ درد عاشق نعت کا

قرشی کی گلو کی حسین فضا کو سلام ہو



نہی صاحب والا محمد عربی رسول افضل و بالا محمد عربی

حیاتیات کی خوشبو مظاہرات کا رنگ مرہی گل و لالہ محمد عربی
 دیار حسن و کشش کا حسین ترس چہرہ جہان کن کا اجالا محمد عربی
 ہدایتوں کا پیہر امانتوں کا امیں صداقتوں کا حوالہ محمد عربی
 مرا نصیر مرا دنگیر میرا میر حسین گیسوؤں والا محمد عربی
 بہت رحیم بہت مہربان ہے عاشق
 صیب رب تعالیٰ محمد عربی ۵۸۳

ندیم حیدر بلوچ

بلوچ خاندان کے چشم و چراغ ندیم حیدر اپنے خاندانی لاحقے کے ساتھ ادب میں وارد ہوئے۔ جمالی بلوچاں جو موجودہ ضلع خوشاب کا ایک گاؤں ہے اور جس کی آبادی میں بلوچ قبیلے کی اکثریت ہے میں ۱۲ اپریل ۱۹۳۵ء کو سردار عالمگیر خان بلوچ کے ہاں پیدا ہوئے۔ راقم کو ایک مکتوب میں انہوں نے سن ولادت ۱۹۳۶ء بھی لکھا تھا۔ ۵۸۳ لیکن ان کے کاغذات اور شناختی کارڈ کے مطابق اول الذکر سن درست ہے۔

ندیم حیدر بلوچ نے ڈی بی ٹل سکول جمالی بلوچاں سے مڈل کا امتحان ۱۹۵۹ء میں پاس کیا۔ گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب سے ۱۹۶۱ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج جوہر آباد میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۶۸ء میں گریجوایشن کرنے کے بعد محکمہ ایکسٹرنل اور ٹیکسیشن میں ملازمت اختیار کر لی۔ ملازمت کے دوران آپ نے ایم اے کا امتحان دیا لیکن ناکام رہے۔ بہر حال ملازمت کا سلسلہ جاری رہا۔ جسے ۱۹۹۸ء میں آپ نے ختم کر دیا۔ اس وقت آپ انسپٹر ایکسٹرنل کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ۵۸۵

ندیم حیدر بلوچ نے کالج کے دور سے شعر کہنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ آخری لمحات تک قائم رہا۔ اور اسے ”صدمات“، ”نیم تاریک سڑک“ اور ”بھکارن کی ہتھیلی“ تین شعری مجموعوں کی

صورت میں محفوظ کر لیا۔ جبکہ نثر میں ”سحر ستارہ“ کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ تقریباً ۶۰ سے زائد اخبارات اور سائل میں ایسا بہت سا مواد بکھرا پڑا ہے جو ترتیب دینے سے رہ گیا ہے۔ البتہ پنجابی زبان میں ایک شعری مجموعہ ترتیب دیا تھا جس کا نام ”اوکھیاں منزلاں“ تجویز کیا لیکن وہ آپ کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ کیونکہ سانسوں نے ۵ نومبر ۲۰۰۶ء کو آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ۵۸۶۔

ندیم حیدر بلوچ نے مجرد زندگی گزاری۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مستقلاً جوہر آباد میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ کئی ادبی تنظیموں سے آپ کا تعلق تھا۔ ”حلقہ ارباب ذوق میانوالی“ کے نائب صدر رہے اور ”پاکستان رائٹرز گلڈ (پنجاب)“ کے ممبر تھے۔ کئی ایوارڈز، اسناد اور سٹیفکیٹ پذیرائی میں ادبی تنظیموں سے ملے جن میں ”سانول سنگیت ایوارڈ“ اور ”Best Performance Award“ بھی شامل ہیں۔

ندیم حیدر بلوچ نے شاعری میں تقریباً تمام اصناف کو برتا ہے۔ لیکن پابند نظم اور غزل میں ہمیں ندیم خود اپنے دکھ، محبتیں اور جذبات سے آگاہ کرتا محسوس ہوتا ہے۔ اگر کہیں ماحول کی بات کرنے کی کوشش کی بھی ہے تو اپنے درد کو اس میں سمودیا اور قاری کو وہ بات سمجھا نہیں سکا جو ارد گرد بکھری ہوئی تھی۔

اداس شام

شام ہوتی ہے تو آ جاتا ہے یادوں کا ہجوم
میں خیالات کے انبار میں سو جاتا ہوں
میں کسے یاد کروں کس کو نہ میں یاد کروں
اپنے ماضی میں کہیں جا کے میں کھو جاتا ہوں

○

جب نکلتا ہوں تیرے کوچہ بے مہر سے میں
میرے قدموں کو پکڑ لیتی ہیں تیری یادیں
پھڑ پھڑاتا ہوں میں محبوس پرندے کی طرح
مجھ کو باہوں میں جکڑ لیتی ہیں تیری یادیں

○

ہو کے خون رنگ وہ سورج بھی چلا جاتا ہے
غم کے سو داغ سجا کر میرے آئینے پر

ختم ہو جاتا ہے اک دن میری تنہائی کا اک نیا زخم لگا کر وہ میرے سینے پر

○

لوٹ آتے ہیں گھروندوں میں وہ غم کے پنچھی شام ہوتے ہی تری یاد چلی آتی ہے
پھر مچلتا ہے میرے دل میں اجالوں کا جمال زندگی آس کے صحراؤں میں کھو جاتی ہے

○

ملکبجی شام کی تنہائی کا منظر لے لو یہ اندھیرا، یہ سیاہی، یہ مقدر نے لو
مجھ کو لوٹا دو میرے سادہ سویرے سارے اور یہ رنگ بھرے پیار کے پیکر لے لو

مجھ کو اب شام کے ان سایوں سے ڈر لگتا ہے

سچ تو یہ ہے کہ تیری یادوں سے ڈر لگتا ہے ۵۸۷

غزل

کئی غم بھول جاتے ہیں کئی غم یاد رہتے ہیں
ہزاروں درد ہیں لیکن بہت کم یاد رہتے ہیں
سفر کے بعد سب کچھ بھول جاتا ہے مگر پھر بھی
پھٹ جاتے ہیں راہوں میں جو ہدم یاد رہتے ہیں
مقدر سے کوئی کہہ دے ہمیں اتنا تو سمجھا دے
اسے کیوں ساری دنیا چھوڑ کر ہم یاد رہتے ہیں
بھلا سکتے ہیں کیسے ہم محبت کی وہ برساتیں
گزرتے ہیں جو الفت میں وہ موسم یاد رہتے ہیں
مٹا ڈالا ہے جن کا ہر تصور ذہن سے ہم نے
تجھے وہ کس لئے اے چشم پر ہم یاد رہتے ہیں
فلکت دل کی منزل پر بھی اکثر ڈوبتے غم کو

تری زلفوں کے لہراتے ہوئے غم یاد رہتے ہیں
 ندیم ان دوستوں کو بھول جانا سخت مشکل ہے
 مسلسل یاد رہتے ہیں وہ پیہم یاد رہتے ہیں ۵۸۸

حسرت جعفری

حسرت جعفری کا نام محبوب حسین تھا۔ حسرت تخلص کرتے تھے اور فقہ جعفریہ سے تعلق کی بنا پر جعفری کا لاحقہ نام کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ ابتدا میں آپ محبوب حسرت کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ حسرت جعفری ۱۹۳۵ء میں بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ریاض کالونی کے باسی تھے۔ بالکل نفس اور مہین تھے۔ پنجابی دوہڑے، ماہیے اور گیت سن کر شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ شاعری کے ساتھ ہی موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ آپ اردو اور پنجابی زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ پنجابی زبان میں چونکہ زیادہ کہا اس لیے منجھے ہوئے شعراء میں شمار ہونے لگ گیا۔ بھیرہ میں ادب خدمت اور فروغ کے لیے ایک تنظیم بنائی۔ جس کا نام بزم حسرت رکھا اور اس کے صدر قرار پائے۔ آپ کلاسیکل مزاج کے شاعر تھے۔ پنجابی زبان میں کئی مسودے تیار کیے لیکن اردو کی طرف کم توجہ ہونے کے باعث تھوڑا لکھا۔ آپ شاعر اہل بیت کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔

حسرت جعفری نے چونٹھ سال کی عمر پا کر ۲۰۰۹ء میں وفات پائی۔ لالہ موسیٰ کے شاعر اہل بیت اور ذاکر جناب ذوالقرنین حیدر نے آپ کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے۔

وہ جا رہا تھا بڑی بے دلی کے ساتھ مگر میں اس کی یاد میں اک جان بھی جلانہ سکا
 وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھا شیرازی دیارِ قلب جو اجڑا تو کیوں بسا نہ سکا
 حسرت جعفری کو موسیقی کی شد بد تھی۔ وہ اس کے رموز سے آگاہ تھا۔ لہذا اس نے بڑے

خوبصورت پیرائے میں موسیقی کا تعارف پیش کیا ہے۔

سات سروں کی ہے موسیقی سانس کا بندھن گر بھگوان

تین گرام جسے ہیں کہتے مندر، تار اور مدھ استھان
 اک سُر سے کئی راگ ہیں نکلے راگوں سے کئی راگنیاں
 کوئل تیور ہر اک میں ہے پنجم قائم اور سُر دھان
 قفص نے جب دیکھ گیا اپنا تن من آپ جلایا
 سات سروں کی نظر کیے ہیں اس نے جانوں پر بلیدان
 سرگم پلٹا راگ کی صورت آڑو، گھاڑو، سپورن

سمجھ گرام حسرت سائیں

موسیقی ہے پہچان



حسین دل کو جگ میں ہر اک نے ستایا جسے دل دیا بے وفا اس کو پایا
 محبت کے ٹھکرائے، جائیں کدھر کو جنھوں نے ستم سہہ کے سر نہ اٹھایا
 ہزاروں جفائیں سہیں ان کی، دل پر محبت میں ہم نے جگر آزمایا
 کیے ناز جس کی محبت پہ میں نے اسی باغباں نے نشیمن جلایا
 نہیں کوئی سنتا مرا قصہ غم وہ ہی چل دیا ہم نے جس کو سنایا
 چلا چھوڑ کر حیف دنیا کی محفل مگر داغِ فرقت نہ اُن کو دکھایا

تھا خونِ جگر کا یہی جامِ حسرت

سمجھ کر جسے بادہ منہ کو لگایا ۵۸۹

تنویر ہاشمی

تنویر ہاشمی یا اجمل ہاشمی ایک ہی شخص کے دو ادبی حوالے یا نام ہیں۔ اصل نام محمد اجمل حسین ہاشمی تھا۔ کبھی تنویر اور کبھی اجمل تخلص کرتے۔ آپ ۸ فروری ۱۹۳۶ء کو مشرقی پنجاب میں ہانسی

کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۵ء تقسیم ہند کے بعد خاندان کے ہمراہ ہجرت کی اور پاکستان آ گئے۔ آپ نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ایم اے کیے اور پنجاب پبلک سروس کمیشن سے دونوں مضامین میں آپ کی سلیکشن ہوئی۔ آپ کا ارادہ پنجابی کو لے کر آگے چلنے کا تھا اور اسے ہی پڑھانے کا تھا لیکن پنجابی میں لیکچرار کی جگہ نہ ہونے کے باعث آپ کا اردو میں تقرر ہوا۔ دو ایم اے کے علاوہ آپ نے ایل ایل بی کی ڈگری بھی لی، ہومیو پیتھک میں بھی ڈپلومہ حاصل کیا۔ لیکچرار منتخب ہونے کے بعد آپ وکالت اور لیکچرار شپ دونوں کیلئے وقت نکالتے رہے۔ آپ ادبی مجالس میں بھی شرکت کرتے تھے۔ انجمن ترقی اردو کے اجلاسوں میں حاضر ہوتے۔ آپ کو ۱۹۷۰ء میں انجمن ترقی اردو نے ”نشانِ سپاس“ سے بھی نوازا۔ پروفیسر ہارون الرشید تبسم لکھتے ہیں

”وہ شعبہ اردو میں اسٹنٹ پروفیسر کے علاوہ ڈائریکٹر کالجز بھی

رہے۔ انہوں نے پروفیسر چوہدری محمد طفیل کے ساتھ مل کر ڈویژن بھر کے کالجز کے سربراہان میں رابطہ کروایا۔ اجمل ہاشمی گورنمنٹ کالج بھلوال سے تبدیل ہو کر گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج آئے۔ وہ نہایت ہنس مکھ اور ملنسار تھے۔“ ۱۹۹۱ء

سخنوران سرگودھا کے مطابق

”پنجابی شاعراں دے حالات زندگی ”سوہنیاں لاناں“ تے

اردو وچ ”مشہور نثر نگار و شعراء“ کتاباں دے مصنف نیں جیڑیاں کہ چھیتی

ای چھپ رہیاں نیں“

لیکن وہ کتابیں منظر عام پر نہ آسکیں بلکہ ان کی اردو شاعری کی کتاب ”رخسارِ غزل“ بھی

تیار تھی لیکن ان کے سارے کام وقت نے اپنے ہاتھ میں لے لیے اور وہ ۱۷ جنوری ۲۰۰۰ء کو اللہ کو

پیارے ہو گئے۔ وہ انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں اسٹنٹ پروفیسر تھے۔ انہیں سرگودھا کے بڑے

قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ان کی وفات پر طفیل ثاقب نے کہا تھا۔

کیا خوب شہر یار تھا اجمل حسین ہاشمی اک پیکرِ وقار تھا اجمل حسین ہاشمی
تھی نکہتِ وفاگری اس کے مزاج میں رچی اخلاص کی پکار تھا اجمل حسین ہاشمی
رنجش کسی رفیق کو اس کے وجود سے نہ تھی پیغامِ انکسار تھا اجمل حسین ہاشمی ۵۹۳

نعت

شب کی ظلمت کو زلفِ سیاہ کھا گئی شرق سے غرب تک روشنی چھا گئی
بزمِ کونین میں یوں ہوئے جلوہ گر گویا عالم میں بادِ بہار آ گئی
اس رخ و انضحیٰ کی ہو تعریف کیا چاندنی نے جو دیکھا تو شرما گئی
سدرۃ المنتہیٰ چلے خیر البشر آج مولا کو بندے کی یاد آ گئی
حق کی تنویر خود بن کے محبوبِ حق
ہم گنہ گار بندوں کو بخشا گئی ۵۹۴

غزل

تم سنبھلنے لگے دیکھتے دیکھتے دل مچلنے لگے دیکھتے دیکھتے
ضابطے، قاعدے، زائچے، زاویے سب بدلنے لگے دیکھتے دیکھتے
وہ تھا حسنِ جہاں یا عتابِ نظر ہم دہلنے لگے دیکھتے دیکھتے
دوستی، دشمنی کا عجب امتحاں سب کو کھلنے لگے دیکھتے دیکھتے
یہ محبت تھی یا کوئی جذبِ دروں
وہ ٹہلنے لگے دیکھتے دیکھتے ۵۹۵

طفیل ثاقب

محمد طفیل نام اور ثاقب تخلص تھا۔ آپ یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء کو قلمان ضلع سرگودھا میں دوست محمد
کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سکول ماسٹر تھے۔ اور ان کا تبادلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوتا رہتا

تھا۔ جہاں فیملی بھی ساتھ ہوتی۔

”آپ نے ۱۹۵۳ء میں پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ ہائی سکول بھاگٹانوالہ سے میٹرک کرنے کے بعد انبالہ مسلم کالج سے ۱۹۶۸ء میں گریجوایشن کیا۔ بعد ازاں D.L.S. (ڈپلومہ ان لائبریری سائنس) کیا اور ملازمت اختیار کر لی۔ آپ کی تقرری یکم جنوری ۱۹۷۲ء کو اسلامیہ کالج چنیوٹ میں ہوئی۔ جہاں سے آپ یکم ستمبر ۱۹۷۶ء کو انبالہ مسلم کالج میں تبدیل ہو کر آئے۔“ ۵۹۶

طفیل ثاقب نے ۳۵ سال لائبریرین کی حیثیت سے گزارے جن میں سے ۳۱ سال کا عرصہ انبالہ مسلم کالج میں گزار کر ۳۱ مارچ ۲۰۰۷ء کو پنشن پائی۔

طفیل ثاقب نے ۱۹۶۲ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ کالج کی آب و ہوا اور ماحول نے اس شوق میں شدت پیدا کی اور آپ نے عروض میں مہارت حاصل کی۔ لائبریرین ہونے کے بعد کالج کے جس بھی طالب علم کو شوقِ شعری ہوتا وہ آپ کے پاس آتا اور رہنمائی حاصل کرتا۔ یوں بہت سے طلباء کو آپ نے شاعری کی سیدھی ڈگر پر رواں کیا۔ آپ ایک شریف النفس انسان تھے اور وہی رویہ آپ کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ نظم ہو یا غزل آپ شعر کو بے لگام نہیں ہونے دیتے تھے۔ آپ کی اگرچہ ابھی تک کوئی کتاب تو شائع نہیں ہوئی۔ لیکن آپ نے جتنا لکھا ہے اس سے کئی کتابیں ترتیب پاسکتی ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمرہ کی ادائیگی کا شرف بخشا تو وہاں کی روداد چھ نظموں میں بیان کی۔ جو آپ کی دلی کیفیت کا اظہار ہے۔ جسے آپ نے سوغاتِ حرم کا نام دیا اس سعادت کے کچھ ہی عرصہ بعد ۲۰ اپریل ۲۰۱۰ء کو آپ نے سرگودھا میں وفات پائی لیکن آپ کی میت کو گاؤں لے جایا گیا اور وہاں تدفین ہوئی۔

زیارتِ مدینہ

میری بیتاب نگاہوں نے مدینہ دیکھا رنگ و انوار کا شاہکار مگینہ دیکھا

اب نہ طوفان کا ڈر ہے نہ بھنور کا خطرہ بحرِ رحمت میں رواں دل کا سفینہ دیکھا
 در پہ سرکار کے جاری اشکوں کی زباں عرض کرنے کا ادب اور قرینہ دیکھا
 گوشتے گوشتے ملی دل کو گواہی اُن کی حسنِ کردار کی معراج کا زینہ دیکھا
 اک سے اک منبر و محراب کے جلوے پائے یوں عجب شوق کا اظہار کہیں نہ دیکھا
 جس کی مہکا پہ قربان تھے خشک و عنبر خوش نصیبوں نے معطر وہ سینہ دیکھا

بھر گئی برکت و خیراتِ کرم سے جھولی

ہر طرف رحمتِ عالم کا خزینہ دیکھا ۵۹۷



ناممکن ہے رسمیں توڑیں، سنگِ رواجوں کو چیریں
 ملنا چاہو مل کب پاؤ کیسی ہیں یہ زنجیریں
 دل والوں نے اکثر دیکھے خواب سہانے الفت کے
 لیکن سب نے کب پائی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں
 سونے کے سو پھول سجا لو چاندی کے گلدانوں میں
 خوشبوئیں مہکا نہیں سکتیں یہ چمکیلی تدبیریں
 داغِ جگر کا مرہم کیا ہے کیا جانیں دنیا والے
 کب یہ گھاؤ بھر سکتی ہیں دل بہلاتی تقریریں
 دل کی مرضی جن پر آئے جس کو چاہے ٹھکرا دے
 پاگل دیکھے دشت نہ صحرا دیکھے کب یہ جاگیریں
 کیا رکھا ہے غم کے سوائے تنہائی کے جیون میں
 دکھتی یادیں، آنسو، آہیں، من سلگاتی تحریریں
 کیسے کیسے لوگ جہاں میں رنگِ جما کے خاک ہوئے
 وقت مٹا دیتا ہے ثاقب کیسی کیسی تصویریں ۵۹۸

حنیف ساجد

”محمد حنیف المتخلص ساجد ۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو رتھک (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ جب بنوارا ہوا تو محمد حنیف کی عمر ایک ماہ کے لگ بھگ تھی۔ اس کے والدین نے ہجرت کا ارادہ کیا۔ اور وہ اپنے والد اللہ دیا خان کی معیت میں پورے خاندان کے ساتھ رتھک سے چل کر پھلروان ضلع سرگودھا میں آ کر آباد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پھلروان سے حاصل کی۔ سرگودھا بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۶۳ء میں والدہ کے ہمراہ حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔“ ۵۹

حنیف ساجد نے ۱۹۸۰ء میں شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ اور اپنی رفتار خاصی تیز رکھی۔ گزشتہ ۲۸ سال میں ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ایک نعتیہ مجموعہ بھی شامل ہے۔ ”آتش خاموش، خاکِ بیبا، آدمِ خوابیدہ، اقلیمِ کرب اور نعتیہ مجموعہ کلام ”خورشید بطحا“۔ جبکہ وفات کے وقت ایک کتاب اشاعت کے لیے نعیم ساگر کے پاس کئی ماہ سے پڑی تھی۔ جس کی اشاعت کی رقم بھی وہ لے چکا تھا۔ آپ نے ۲۴ جولائی ۲۰۱۱ء کو وفات پائی اور ۲۵ جولائی کو پھلروان میں ہی آپ کی تدفین ہوئی۔

حنیف ساجد نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو روموز شاعری سیکھنے کیلئے ظہور عالم ظہور سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اگرچہ تجارت سے وابستہ رہے لیکن ساتھ ہی شعر و سخن، فروغ ادب اور صحافت کے لئے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ آپ ”انجمن ترقی اردو“ پھلروان کے صدر رہے اور سرگودھا سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ اخبار ”تابش“ کے سرپرست بھی رہے۔ آپ کی شاعری پر کئی دانش وروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بڑے طور پر ریمارکس سے نوازا ہے۔ ایوب جوہر (بنگلہ دیش) نے کہا ہے کہ:

”حنیف ساجد نے اپنی شاعری کو زندگی سے وابستہ اور مربوط

رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اس زندگی کی شاعری ہے جہاں

رنگینیاں بھی ہیں اور زندگی کے بیکراں دکھ بھی۔“

ظاہر اُدکھی نہ دکھائی دینے والا حنیف ساجد اندر سے کتنا ٹوٹا پھوٹا تھا۔ اسے کتنے دکھ تھے۔

وہ خارجی اور داخلی دونوں طرح کے دکھوں کو کس طرح زبان دیتا رہا یہ اس کی شاعری سے واضح ہوتا

ہے۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اسے اظہار کا طریقہ بھی آتا تھا۔ اور قرینہ بھی۔ اس کی شاعری ہمیں بتاتی

ہے کہ اس نے زمانے کو پڑھا بھی اور برتنے کی کوشش بھی کی۔ وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب

رہا ہے۔ اس کے درج ذیل اشعار سے اندازہ لگائیے۔

غزل

ستم کی راہ میں دیوار یوں اکثر بناتا ہوں

میں کربل کی زمینوں پر فصیلِ سر بناتا ہوں

سرِ ظلمت میری پلکوں پہ تارے رقص کرتے ہیں

شبِ تاریک میں جلوہ فگن منظر بناتا ہوں

کبھی آتش فشاں کو میں بجھاتا ہوں تیقن سے

کبھی موجوں پہ کاغذ ہی کے بام و در بناتا ہوں

تبسم ریز رہتی ہے مرے ادراک پر دنیا

جو راہوں سے نہیں واقف انہیں رہبر بناتا ہوں

مری مٹی پہ ظلمت کا کہیں پہرا نہیں ساجد

میں سورج ہوں سدا کرنوں ہی کے لشکر بناتا ہوں



گوہرِ اشک جو آنکھوں میں سجا کر رکھیں شہرِ جاں کو وہ عذابوں سے بچا کر رکھیں

دشت کربل کے بھی نقش مٹائیں کیونکر کس طرح سارے زمانے سے بنا کر رکھیں
 جبرگاہوں سے نہیں ہم تو ذرا بھی خائف جو صلیبوں سے ڈریں سر وہ جھکا کر رکھیں
 گرنے والوں کو کہیں پھر نہ سنبھلنے دے گا سیل گردش میں ذرا پاؤں جما کر رکھیں
 جن پر رشحاتِ قلم کے وہ دکھائے جوہر
 کیوں نہ اوراق وہ شیشوں میں سجا کر رکھیں ۶۰۲

غلام شبیر شاہد

نام غلام شبیر، ادبی حوالہ شبیر شاہد ۹ جولائی ۱۹۴۹ء ۶۰۳ کو تحصیل خوشاب کے ایک گاؤں
 جوئیہ میں محمد جہانگیر خان جوئیہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج جوہر آباد میں
 داخلہ لیا۔ جہاں یوسف شیدائی اور اسحاق قریشی جیسے اساتذہ کے علاوہ ف۔م ماجد جیسے پرنسپل نے ان
 کے اندر چھپے جوہر دیکھ لئے اور ادبی سرگرمیوں میں اُس کو فعال کیا۔ ۱۹۶۹ء میں انہوں نے بی اے کا
 امتحان پاس کیا۔

صاحب ”دیدہ خوش آب“ نے اُن کے بی اے کرنے کا سال ۱۹۷۹ء ۶۰۴ لکھا ہے۔ جو
 اس لحاظ سے بھی درست نہیں کہ شبیر شاہد نے ۱۹۷۱ء میں ایم اے کر لیا تھا مزید یہ کہ ”دیدہ خوش آب“
 میں رقم ہے: ”شبیر شاہد ۱۹۷۰ء کی دہائی میں جدید غزل کے حوالے سے ابھرنے والا اہم ترین نام
 ہے۔“ ۶۰۵

جبکہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آخر میں اُن کا کلام گورنمنٹ کالج جوہر آباد کے مجلہ ”جوہر“ میں
 شائع ہونے لگ گیا تھا۔ اس وقت اُنکی ایک غزل کے دو اشعار مجھے یاد آ رہے ہیں جو ۱۹۶۹ء میں
 شائع ہوئے تھے۔

دن ڈھلے آ کے ترے صحن میں بکھرا ہوتا سوچتا ہوں کہ مرا جسم بھی سایہ ہوتا
 شاخ امید پہ اک پھول سلامت ہے ابھی کاش اس کو بھی تری زلف نے مانگا ہوتا ۶۰۶

شبیر شاہد نے ایم اے کے لئے اوری انٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں اس کے ادبی ذوق کی مہمیز ملی۔ اور گورنمنٹ کالج جوہر آباد سے شاعری کی ابتداء کرنے والا یہ شخص ان دو سالوں میں لاہور کے ادبی افق پر واضح دکھائی دینے لگا۔ اس دوران احمد جاوید، حسن رضوی اور اجمل نیازی جیسے ادب دوست جو وہاں زیر تعلیم تھے کی محفل میں شبیر شاہد بھی شامل ہو گیا۔ اس پر مستزاد کہ یہ تمام لوگ سید سجاد باقر رضوی کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ جنہوں نے انہیں مزید پالش کیا۔

شبیر شاہد نے ایم اے (اردو) میں اول پوزیشن حاصل کی اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اس کے فوراً بعد ہی پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں ملازمت اختیار کر لی اور پھر وہ ایک دن اپنے ہی ایک شعر کی صورت میں ڈھل گیا۔

فرط حیرت سے بھرا گھر دیکھتا رہ جائے گا : ہم چلے جائیں گے دروازہ کھلا رہ جائے گا
اور ایسے ہی ہوا۔ ۱۹۷۴ء کی ایک صبح وہ گھر سے نکلا اور پھر اس کی راہ کھلے دروازے دیکھتے رہ گئے وہ واپس نہ لوٹا۔ شاید ایسے حساس لوگوں کا یہی المیہ ہوتا ہے۔ شکیب جلالی اور بعد میں آنس معین جیسے کئی بیٹا لوگ موت کو ہنس کر گلے لگانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ شبیر شاہد نے اپنے کھوجانے سے قبل اپنی شاعری جلادی تھی۔ البتہ جو باقی بیچ گئی یا کہیں شائع ہو کر اوراق میں محفوظ تھی۔ وہ ہم تک پہنچی۔ جسے ڈاکٹر ضیاء الحسن نے ”گمشدہ ستارہ“ کے عنوان سے حالات و شاعری کو ایک کتابی صورت میں یکجا کر دیا۔

شبیر شاہد جدید لہجے کا خود سر شاعر تھا جو خاندانی پس منظر اور جدید تغیر کے درمیان ایک عجیب سی شکست و ریخت کا شکار ہو گیا۔ دو غزلیں دیکھئے اور فیصلہ دیجئے۔

غزل

ابھی وہ نقش کمال بھولا نہیں ہے مجھ کو	وہ ساحلِ بے مثال بھولا نہیں ہے مجھ کو
وہ ریگ ساحل سے چاندنی میں لپٹی لہریں	وہ بحر و بر کا وصال بھولا نہیں ہے مجھ کو
وہ آسمانوں کی جھوک وہ کھاڑیوں کا پانی	وہ اس میں تاروں کا جال بھولا نہیں ہے مجھ کو

نفس میں آباد ہیں ابھی رس بھری ہوائیں وہ موسم بر شگال بھولا نہیں ہے مجھ کو
 نئے دنوں کے اداس خوابوں کے جمگھٹوں میں گئے دنوں کا خیال بھولا نہیں ہے مجھ کو
 سفر نے دھندلا دیئے ہیں ماضی کے عکس لیکن
 وطن سے رخصت کا سال بھولا نہیں ہے مجھ کو ۶۰۷



نئے فراغت کا آخری دور چل رہا تھا سبوکنارے وصال کا چاند ڈھل رہا تھا
 فراق کا گیت گارہا تھا معنیء شب فلک پہ صبح سفر کا تارا نکل رہا تھا
 وہ ساز کی لے کہ ناچتا تھا لہو رگوں میں وہ حدتِ مے کہ لمحہ لمحہ پکھل رہا تھا
 فضا میں لہرا رہے تھے افسردگی کے سائے عجب گھڑی تھی کہ وقت بھی ہاتھ مل رہا تھا
 ہوائے غربت کی لہر انفاس میں رواں تھی نئے سفر کا چراغ سینوں میں جل رہا تھا
 بدن پہ طاری تھا خوف گہرے سمندروں کا
 رگوں میں شوقِ شناوری بھی مچل رہا تھا ۶۰۸

محمد حسین جامی

جامی تخلص سے اگرچہ فارسیت کا احساس ہوتا ہے اور مولانا عبدالرحمن جامی نظروں کے
 سامنے آجاتے ہیں لیکن یہاں محمد حسین جامی ہیں جو اردو کے شاعر اور سرگودھا کے باسی تھے۔ آپ ۲۱
 اکتوبر ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوئے۔ انکے رکھ رکھاؤ اور چال ڈھال سے اُنکے تعلیم یافتہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔
 لیکن حقیقت میں وہ کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے اور فائر بریگیڈ کے محکمے میں ملازم ہو گئے تھے۔
 معاشی پریشانیوں نے اُسے شاعری کی طرف متوجہ کیا جو جوانی میں انہوں نے مشقِ سخن شروع کی لیکن
 جوانی میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ صرف ۳۲ سال کی عمر میں ۱۹۸۱ء میں انہوں نے وفات پائی۔
 محمد حسین جامی چھوٹی بحر میں بڑے پُر مغز شعر کہتے تھے۔ بقول ہارون الرشید تبسم:

”چھوٹی بحر میں شعر کہنا خاصا مشکل فن ہے۔ اس فن کو محمد حسین جامی نے اپنے طور پر نبھانے کی کوشش کی ہے۔ میر تقی میر کے تصورِ غم کی پیروی کرنے والوں میں محمد حسین جامی اسی قافلے کے رکن ہیں جو لوگ جامی صاحب کی محفل میں رہ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مرحوم عجیب بے چین طبیعت کے مالک تھے“۔ ۶۰۹

نعت رسول ﷺ

السلام اے رحمتہ للعالمین السلام اے ہادی دین میں
السلام اے آمنہ کے نورِ عین السلام اے فاتح بدر و حنین
السلام اے مربع انوارِ حق السلام اے مطلع اسرارِ حق
السلام اے ماہ تابانِ عرب السلام اے ارفع و عالی نسب
السلام اے سرورِ دنیا و دیں
السلام اے عرشِ اعلیٰ کے مکین ۱۱۰

☆

اپنے غم کا اسیر رہنے دے مفلسی میں امیر رہنے دے
بادشاہت کا اعتبار نہیں احتیاطاً فقیر رہنے دے
دل بیمار کو کیا ہو گیا ہے جنوں کی وسعتوں میں کھو گیا ہے
حکایتِ دلبری کی کہتے کہتے کوئی بسمل تڑپتا سو گیا ہے ۱۱۱

☆

پر جلے، سینہ جلا، آخر تڑپ کر مر گیا
صمد پھر دید کے قابل تھی پروانے کی لاش

ہو گیا ماتم پاپا گورِ غریباں چارسو
جس گھڑی مرقد میں تڑپی تیرے دیوانے کی لاش

سید ذکی الحسنین

سید ذکی الحسنین شاہ دسمبر ۱۹۴۹ء میں سید نذر حسین شاہ کے ہاں موضع میٹر تحصیل شاہ پور (حال ساہیوال) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا گاؤں مرکزِ رشد و ہدایت موضع سیال شریف کے نزدیک واقع ہے۔ تعلیم کے ضلع سرگودھا کے مختلف مقامات پر طے کیے یعنی پرائمری میٹر سے، مڈل نہنگ سے، نہم گورنمنٹ ہائی سکول گوندل سے اور میٹرک ہائی سکول نمبر ۱ سرگودھا شہر سے کیا۔ ۱۹۶۹ء میں آپ پاک فوج کے شعبہ میڈیکل کور میں بھرتی ہو گئے۔ جہاں آپ کو فزیوتھراپسٹ ٹریڈ دیا گیا۔ اور پھر آپ نے اسی کو مستقبل کا پیشہ بنا لیا۔ ۱۹۷۶ء میں لانس ٹائیک تھے جب آپ نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ یہ ریٹائرمنٹ انہوں نے جنرل محمد یحییٰ خان کے ایماء پر لی تھی جس کے آپ ذاتی فزیوتھراپسٹ رہے تھے۔ انہوں نے ذکی الحسنین کو امریکہ بھوانے کا وعدہ کیا تھا لیکن آپ کے والدین باہر بھیجنے پر راضی نہ ہوئے کیونکہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لہذا آپ نے میوہسپتال لاہور میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسی دوران آپ نے ایف ایس سی کیا۔ پھر ۱۹۹۲ء میں بی ایس سی کیا۔ بعد ازاں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے فزیوتھراپی کا کورس کیا۔ کچھ عرصہ آپ اسی کالج میں انسٹرکٹر رہے۔ ۱۹۹۶ء میں آپ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ جس کا علاج کروایا اور صحت یاب ہونے پر ۱۹۹۸ء پر کالج کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ لیکن آپ کو دل کا عارضہ لاحق ہو گیا اور یوں ۲۰۰۳ء میں بائی پاس کروانا پڑا۔ اب آپ نے العباس ہسپتال سرگودھا کو جوائن کر لیا۔ ساتھ ہی سیال ہسپتال ساہیوال میں بھی مریضوں کو دیکھا کرتے اور پھر شام کے بعد میڈ میں بھی گاؤں کے لوگوں کا علاج کرتے۔ آپ ہر روز ویگن یا بس پر گھر سے سرگودھا پھر ساہیوال اور پھر رات کو گھر واپس آتے۔ ۲۴ دسمبر ۲۰۱۱ء کو العباس ہسپتال سے فارغ ہو کر سیال ہسپتال میں آ کر اپنے کمرے میں

بیٹھے تھے کہ دل کا حملہ ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ۶۱۲

سید ذکی الحسنین نے فوج میں جانے کے بعد لکھنا شروع کیا تھا اور جو کچھ اور جیسا بھی لکھتے ایک طرف رکھ دیتے۔ کبھی کسی رسالے میں اپنی تحریریں بھیجنے یا شائع کروانے کا نہیں سوچا۔ آخری عمر میں معرفت ہمدانی نے آپ کو کھوج نکالا اور دریچہ انٹرنیشنل میں ان کی تحریروں کو جگہ دی اور مشاعروں میں بھی لانا شروع کیا۔ لیکن دونوں کی زندگی کے دن محدود تھے اور یکے بعد دیگرے دونوں نے عدم کا سفر اختیار کیا۔

سید ذکی الحسنین کی عزت بحیثیت انسان اپنے علاقے میں بہت زیادہ تھی۔ رستے میں بھی جہاں سے آپ گزر رہے ہوتے لوگ کھڑے ہو جاتے۔ اور بحیثیت انسان یہی سب سے بڑا اثاثہ ہوتا ہے جو شاہ کے پاس تھا۔

غزل

سکون و ضبط گیا دل سے دل لگی نہ گئی تمام عمر نگاہوں کی مفلسی نہ گئی
 وہ میرے گھر سے تو دریا کچھ اتنا دور نہ تھا مرے لبوں کی مگر پھر بھی تشنگی نہ گئی
 ساعتوں کو ہے مدت سے انتظار اس کا وہ ایک بات جو مجھ سے کبھی کہی نہ گئی
 گئی رتوں کا تعاقب نہ کر سکے لیکن دل و نظر سے ترے دل کی سادگی نہ گئی
 وہ جن کے نام پر تم نے حکومتیں پائیں
 اسی غریب کے دامن سے بے کسی نہ گئی ۶۱۳

☆

ترے خیال نے کیا کیا نہیں دیا ہے مجھے میں فرد ہو کے بھی رہتا ہوں انجمن کی طرح

☆

آگہی کے بہ سبب، خود بھکنی کے بہ طفیل دل کی تطہیر جو ہوتی ہے تو ہو جانے دو

جمال احسانی

”اردو شاعر جمال احسانی کی ولادت ۲۱ اپریل ۱۹۵۱ء کو کراچی

میں ہوئی۔“ ۱۱۳

”محمد جمال عثمانی کی ولادت ۲۱ اپریل ۱۹۵۰ء کو سرگودھا میں

ہوئی۔“ ۱۱۵

”جمال احسانی ۲۱ اپریل ۱۹۵۱ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔“ ۱۱۶

مندرجہ بالا تین حوالے معمولی اختلاف کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ لیکن یہاں میں

جمال احسانی کے شعری مجموعہ ”تارے کو مہتاب کیا“ سے اصل حوالہ دینا چاہوں گا۔

”۱۹۴۷ء کے آخر میں والدین بھارت کے ایک قصبے پانی پت

سے ہجرت کر کے سرگودھا میں آئے۔ پہلے ہی ان کے دو بڑے بھائی اور

دو روزن دیک کے عزیز واقرباء پانی پت سے آ کر جم چکے تھے۔ ۲۱ اپریل

۱۹۵۱ء کو سرگودھا ہی میں پیدا ہوا۔ وہیں سے مارے باندھے میٹرک کیا۔

ایک مکان کا نصف حصہ ابا نے بعد از طویل صبر آزما مقدمے بازی حاصل کیا

جسے ان کے انتقال کے بعد فوری اور اشد ضرورت کے ہاتھوں مجبوراً بیچنا پڑا

اور پھر کسمپرسی کی حالت میں کراچی آ گیا۔“ ۱۱۷

لہذا یہاں بلاشبہ کہنا پڑتا ہے کہ حوالہ نند کشور و کرم کا دیا شہر ولادت کے حوالے سے غلط

ہے۔ صابر براری کا دیا ہوا دوسرا حوالہ ایک سال کے فرق سے غلط ہے۔ البتہ تیسرا حوالہ زاہد حسین انجم

نے جو دیا ہے وہ صحیح ہے اور یہی حوالہ جمال احسانی کی اپنی تحریر کی تائید کر رہا ہے۔

جمال احسانی کا اصل نام محمد جمال عثمانی اور والد کا نام ظہور حسین عثمانی تھا۔ سرگودھا سے

کراچی جانے پر مختلف اداروں کے ساتھ وابستہ رہے۔ اور ملازمت کے انہی دنوں میں گریجوایشن

کیا۔ آپ کو شاعری کا شوق سرگودھا قیام کے دوران ہوا تھا جو کراچی کی محفلوں میں آ کر پروان چڑھا اور جسے احسان امر وہوی نے جمال عثمانی سے جمال احسانی بنا دیا۔ راغب شکیب ۱۹۶۸ء نے اپنی پہلی ملاقات سرگودھا میں جمال احسانی سے ہونے کا ذکر کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۹ء کا زمانہ ہوگا۔ جب راغب شکیب سرگودھا کے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان رکھتا تھا اور حلقہ ارباب ذوق کے جنرل سیکرٹری کے طور پر کام کر رہا تھا۔

کراچی چلے جانے کے بعد جمال احسانی نے مختلف ادبی رسائل، اخبارات اور جرائد میں لکھا۔ انہوں نے شاعری کے علاوہ تراجم بھی کئے، کہانیاں بھی لکھیں اور شخصی خاکے بھی۔ ”ستارہ سفر“ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی تقریب بھی سرگودھا میں ہوئی۔ اور جو مضمون ریاض احمد شاد نے پڑھا وہ بعد میں دوسرے شعری مجموعہ ”رات کے جاگے ہوئے“ میں بطور دیباچہ شامل کیا گیا۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم لکھتے ہیں:

”جمال ہر اعتبار سے ایک زندہ انسان تھا۔ مگر وہ ایک لاپرواہ

آدمی بھی تھا۔ وہ جملے بازی کا ماہر تھا اور بہت بلیغ جملے کہا کرتا تھا۔ اس نے

بڑے تیور کے ساتھ شاعری کی۔“ ۱۹

جمال احسانی کی بلاغت اور لہجے میں نیاپن بعد میں آنے والے تمام ناقدین اور شعراء کے لئے ایک فکر اور مواد مہیا کرتا رہا اور کرتا رہے گا۔ وہ آخری دنوں میں اسلام آباد میں جب زیر علاج تھا تو کراچی کو یعنی سمندری ہواؤں کو اکثر یاد کرتا تھا اور شاید اس لئے کہ اسلام آباد میں اس کی سوچ کی تازگی ختم ہو گئی تھی اور وہ پھر تازہ سمندری ہواؤں سے تازہ خیالات کشید کرنا چاہتا تھا۔ اعتبار ساجد اسلام آباد میں جمال احسانی سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اسلام آباد میں اس سے آخری سے پہلے کی ملاقات ہاسپٹل

کپلیکس میں اس کے چھوٹے سے کمرے میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ زیر علاج

تھا اور بڑے اضطراب میں تھا۔ بار بار کہتا تھا کہ: شہر تو اچھا ہے لوگ بھی

اچھے ہیں مگر سمندری ہوائیں بہت یاد آ رہی ہیں۔ وہ شہر اپنی طرف کھینچ رہا

ہے۔“ ۲۰

اور بالآخر سمندری ہواؤں اور کراچی نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ لیکن موت نے اسے ۱۰ فروری ۱۹۹۸ء بمطابق ۱۴۱۸ھ ۲۱ کو کراچی سے اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں عالمی اردو ادب نمبر ۲۲ میں شائع ۱۹۹۷ء کی تاریخ وفات کو میں ایک بار پھر رد کروں گا۔ کیونکہ یہاں مضمون نگار پھر غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔

نہ سننے میں، نہ کہیں دیکھنے میں آیا ہے
نئے سرے سے جل اٹھی ہے پھر پرانی آگ
نہ ہات میرے، نہ آنکھیں مری، نہ چہرہ میرا
جواز رکھتا ہے ہر ایک اپنے ہونے کا
ہے واقعہ ہدف سیل آب تھا کوئی اور
وہ راز وصل تھا جو نیند میں کھلا مجھ پر

جو ہجر وصل مرے تجربے میں آیا ہے
عجیب لطف تجھے بھولنے میں آیا ہے
یہ کس کا عکس مرے آئینے میں آیا ہے
یہاں پہ جو ہے، کسی سلسلے میں آیا ہے
مرا مکان تو بس راستے میں آیا ہے
یہ خواب ہجر ہے جو جاگتے میں آیا ہے

جمال دیکھ کے جیتا تھا جو کبھی تجھ کو
کہیں وہ شخص بھی کیا دیکھنے میں آیا ہے ۲۳

☆

جمال اب تو یہی رہ گیا پتہ اس کا
پھر ایک سایہ دروہام پر اتر آیا
کے خبر تھی کہ یہ دن بھی دیکھنا ہو گا
جو میرے ذکر پر اب قہقہے لگاتا رہا
مجھے تباہ کیا اور سب کی نظروں میں
سوکس سے کیجئے ذکرِ نزاکتِ خود خال

بھلی سی شکل تھی اچھا سا نام تھا اس کا
دل و نگاہ میں پھر ذکر چھڑ گیا اس کا
اب اعتبار بھی دل کو نہیں رہا اس کا
پچھڑتے وقت کوئی حال دیکھتا اس کا
وہ بے قصور رہا، یہ کمال تھا اس کا
کوئی ملا ہی نہیں صورت آشنا اس کا

جو سایہ سایہ شب و روز میرے ساتھ رہا گلی گلی میں پتہ پوچھتا پھرا اس کا
جمال اس نے تو ٹھانی تھی عمر بھر کے لئے
یہ چار روز میں کیا حال ہو گیا اس کا ۶۲۴

بلال اُمی

اصل نام غلام دستگیر تھا لیکن اپنے ادبی نام بلال اُمی سے اس طرح پہچان بنائی کہ لوگ غلام
دستگیر کو بھول گئے۔ آپ ایک بہت اچھے مصور تھے۔ آرٹ میں ہی آپ کو لوگوں نے جانا۔ اپنی کاوشوں
کی اور فن پاروں کی نمائش ملکی سطح پر کروائی اور بڑے بڑے آرٹسٹوں نے آپ کے کام کو سراہا۔ میرے
شعری مجموعہ ”رفاقوں کی فصیلیں“ کا ٹائٹل بھی آپ نے بڑی محنت اور محبت سے بنایا تھا۔
بلال اُمی ۱۹۵۲ء میں کلیاں تحصیل شاہ پور میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کا نام غلام محمد تھا۔ اس
نے ابتدائی تعلیم خوشاب اور بہاولپور میں حاصل کی۔ ۶۲۵

بلال اُمی نے مصوری باقاعدہ سیکھی اور اسے ہی معاشی مسئلے کا حل بنا لیا۔ زندگی میں شہروں
شہروں گھومنے کے بعد خوشاب میں آکر سکونت اختیار کی۔ آپ اگرچہ پنجابی زبان کے شاعر کی
حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں لیکن اردو میں بھی کبھی کبھی لکھتے تھے۔ مشاعروں میں بھی کئی دفعہ انہیں
سننے کا اتفاق ہوا وہ اپنا اردو کلام سنایا کرتے تھے۔ چونکہ سنگیت کی شُد بد رکھتے تھے لہذا سٹیج پر اپنی
موجودگی کا احساس دلوادیتے تھے۔ بلال اُمی نے چھیالیس سال کی عمر میں مئی ۱۹۹۸ء میں وفات
پائی۔ آپ کو اپنے آبائی گاؤں میں دفن کیا گیا۔

غزل

یہ رشتہ پیار کا ٹوٹے نہ بدگمانی میں خدا یہ لمحہ دکھائے نہ زندگانی میں
وہ کارواں سے پھڑٹتا تجھے تو یاد نہیں ابھی تو رقص ہے زلفوں کی اس جوانی میں
اسی کی شکل مرے ذہن سے نہیں اتری وہ ایک شخص ملا تھا جو قصہ جوانی میں

بتا وہ لوہے کہاں، لالہ الا للہ سکون ہم کو ملے گا اسی کہانی میں
 جہاں ملے نہ تحفظ کسی کی غربت کو مجھے نہ دین کرو ایسی راجدھانی میں
 مرے تو پاس ندامت کے چند قطرے ہیں
 یہی لٹا کے چلے اسی زندگی میں ۱۲۶

اے۔ ایچ انیس

امیر حسین نام، انیس تخلص جبکہ اے۔ ایچ۔ انیس کے ادبی نام سے اپنی پہچان رکھتے
 تھے۔ امیر حسین انیس ۱۰ جون ۱۹۵۳ء ۱۲۷ کو ساہیوال ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا
 نام محمد اللہ یار تھا۔ پرائمری تک تعلیم سکول نمبر ساہیوال سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان ہائی سکول
 ساہیوال سے پاس کیا اور پھر گورنمنٹ کالج سرگودھا سے بی۔ اے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم
 ہو گئے۔ اسی دوران پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری لی۔

اے۔ ایچ انیس نے ۱۹۷۲ء میں لکھنا شروع کیا۔ آپ کی توجہ نثر اور نظم کے علاوہ صحافت
 پر بھی یکساں تھی۔ آپ اردو، پنجابی، انگریزی اور فارسی ہر چہار زبان میں لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ
 ساہیوال میں ادبی تنظیموں کے بھی روح رواں تھے۔ اور ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔
 ”گوشہ ادب ساہیوال“ کے آپ جنرل سیکرٹری تھے۔ ادب تو آپ کے اندر سایا ہوا ہی تھا۔ آپ
 سماجی کاموں میں بے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ”اشکوں میں ڈوب کر“ (ناول) اور ”سوانح
 عمری حضرت قاری عبدالشکور ترمذی“ آپ کی مطبوعہ تصانیف ہیں۔ جبکہ ”اور وہ مرگئی“ (ناول) اور
 ایک شعری مجموعہ بھی ترتیب دے چکے تھے۔ ان کے علاوہ آپ کے کالم اور وہ تحریریں جو ابھی تک یکجا
 نہیں کی گئی تھیں وہ بھی آپ کی بیوہ کے پاس محفوظ ہیں۔ وہ چونکہ ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں اور شعبہ
 تعلیم سے وابستہ ہیں۔ اس لئے امید ہے ان کو ان تحاریر کی اہمیت کا احساس ہوگا:

”اے۔ ایچ انیس نے ۱۱ فروری ۱۹۹۷ء کو ساہیوال ضلع سرگودھا میں ہی

نعت

سب کی قسمت کو جگانے پاک احمد آ گئے عالم انسانیت کو نیک راہ دکھلا گئے
 زہد و تقویٰ، دردِ انساں میں ہی عظمت ہے چھپی عظمتِ آدم کا وہ مفہوم یہ بتلا گئے
 چار سو پھیلی ہوئی تھی نفرتوں کی تار رات دل ہوئے ایماں سے روشن نور وہ پھیلا گئے
 لے کے مشعل ہاتھ میں اللہ کے پیغام کی کفر کی تاریکیوں پہ غلبہ پانے آ گئے

اے انیسو! اے رفیقو! آؤ ہم بھی وہ کریں

جو خدا کے لاڈلے محبوب ہیں فرما گئے ۱۲۹

غزل

میری ہر بات لگی ان کو فسانوں کی طرح میں تو ذہنوں میں رہا الجھے سوالوں کی طرح
 جانے احباب میرے مجھ سے گریزاں کیوں ہیں میں تو مخلص تھا کسی ماں کی دعاؤں کی طرح
 حسرتیں ٹھیک رہیں گی اے مرے پگے جنوں خوشیاں گھر بار جلاتی ہیں شراروں کی طرح
 دولتِ درد نے غربت کا نہ احساس دیا اپنی اس کنیا میں رہتا ہوں میں شاہوں کی طرح

جو جھلستی ہوئی اس دھوپ میں سایہ تھے انیس

اب وہی روٹھ گئے روٹھی بہاروں کی طرح ۱۳۰

عبدالستار آثم

تحقیق میں کچھ نکات رد کرنے پڑتے ہیں اور نئے لانے پڑتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ
 ایک بات کبھی لکھ دی دوبارہ تحقیق سے پتہ چلا کہ وہ تو غلط تھی۔ تو ایسے ہی یہاں آج تردید اور تصدیق
 سے واسطہ پڑا ہے۔ اور وہ یہ کہ ”اردو ادب اور عسا کرِ پاکستان“ ۱۳۱ میں عبدالستار آثم کو میں نے
 صوبیدار لکھا تھا لیکن اس کی بیوہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ”آثم حوالدار تھا جب اس کا

کورٹ مارشل ہوا۔“ ۱۳۲

عبدالستار آثم ۱۳ اپریل ۱۹۵۴ء کو ماڑی انڈس کے مقام پر کالے خان کے ہاں پیدا ہوا۔ آپ کے والدین ہجرت کر کے یہاں آ کر مقیم ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم ماڑی انڈس سے حاصل کی جبکہ میٹرک کا امتحان میانوالی سے پاس کیا۔ چندے بیکاری کے بعد فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ ای ایم ای کے شعبہ میں تھا۔ حوالدار کے عہدے پر تھا کہ سعودی عرب عسکری خدمات کے سلسلے میں جانے کا موقع ملا۔ تین سال وہاں رہا۔ اسی دوران حج کی ادائیگی کا شرف بھی حاصل ہوا۔

عبدالستار آثم نے سکول کے زمانے سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ جب آپ فوج میں تھے تو عسکری اور ادبی رسائل میں اُن کی نگارشات شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اسی دوران اُس کی منگنی ملتان کے ایک گھرانے میں اس کے والدین نے کر دی۔ سسرال نے یہ شرط رکھی کہ لڑکی بیاہ کر ماڑی انڈس نہیں جائے گی۔ لہذا آثم سرگودھا میں دلہن کو بیاہ کر لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

”سعودی عرب سے واپسی پر یونٹ میں حالات بگڑ گئے اور کسی افسر سے جھگڑا کر بیٹھے جس بنا پر انہیں کورٹ مارشل کی سزا دی گئی۔ گھر آنے پر بحالی کی اگرچہ کوشش کی لیکن بے سود۔ اور یوں تقریباً ساڑھے تین سال بیکاری کے عالم میں رہ کر ۱۹۹۸ء میں وفات پائی۔“ ۱۳۳ آثم کی بیٹی نے انگریزی میں ایم اے کر رکھا ہے اور انگریزی میں وہ شعر کہہ کر والد کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جبکہ اس کا بیٹا اپنا کاروبار کر رہا ہے۔

غزل

وہ لوگ جو چڑھتے رہے حالات کی سولی
وہ دیکھو فدا شمع پہ ہوتے ہیں پتنگے
کس شان سے نکلا ہے محبت کا جنازہ
ہم کیسے یقین ان کی وفاؤں کا دلائیں
کہتے ہیں اسے لوگ تو اعجازِ محبت
کب ان کا مقدر تھی یہ صدمات کی سولی
اور شمع کی تقدیر ہے اک رات کی سولی
احباب نے دی ہے ہمیں بارات کی سولی
ہر شخص ہمیں دیتا ہے آفات کی سولی
ہے زیب گلو اُن کے حسیں ہاتھ کی سولی

بے ربط سی رسموں میں گھرے اہلِ محبت
آٹم بھی چڑھا اُن ہی خرافات کی سولی ۱۳۴



عشق خانہ خراب لے ڈوبا پیار کا ارتکاب لے ڈوبا
حسن کا ماہتاب لے ڈوبا آپ کا یہ شباب لے ڈوبا
وقتِ رخصت وہ اعتراف جفا قصہ لاجواب لے ڈوبا
زندگی اک حسین وادی تھی خوفِ روزِ حساب لے ڈوبا
حق پرستوں کو آج آٹم کیوں
نفرتوں کا عذاب لے ڈوبا ۱۳۵

مقصود احمد راہی

مقصود احمد نام اور راہی تخلص تھا۔ آپ ۳ مئی ۱۹۵۵ء ۱۳۶۶ھ کو جناب عبدالغنی کے ہاں سرگودھا شہر میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ خالقیہ ہائی سکول سرگودھا سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ ابھی میٹرک کا طالب علم تھا جب شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی جناب حافظ محمد یوسف آزاد کی شاگردی اختیار کر لی۔ استاد سے رموز شاعری سیکھے اور اس قربت میں استاد کی طرح شاگرد کے اندر بھی موسیقی پنپنے لگی۔ شاعری اور موسیقیت ویسے بھی لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن کچھ بحر میں ایسی ہوتی ہیں جو موسیقاروں کی من پسند ہوتی ہیں اور انہیں ہی وہ موسیقی کی ”سارے گاماپا“ پر پرکھتے ہیں۔

مقصود کو اللہ تعالیٰ نے ترنم بھی ودیعت فرمایا تھا۔ جس بنا پر سکول کے زمانے میں ہی آپ کے چاہنے والوں کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ جب شعر کہنا شروع کیا تو کچھ عرصہ استاد کے ساتھ شعری محافل میں جاتے رہے لیکن ان کی وفات کے بعد یہ سلسلہ بہت کم کر دیا۔

مقصود احمد راہی ایک دن دفتر میں کام کر رہے تھے کہ سر میں درد ہوا۔ شاید بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ جس سے دماغ کی شریان پھٹ گئی اور صرف ۴۵ سال کی عمر میں یہ ستارہ ۲۲ جون ۲۰۰۰ء کو ڈوب گیا۔ آپ کو سرگودھا میں ہی دفن کیا گیا اور بعد میں آپ کی قبر پر یہ شعر کندہ کر دیا گیا۔

میں مرچکا ہوں مگر رونے والی آنکھوں میں
عقیدتوں کا نشانِ سپاس کیسا ہے

پروفیسر ہارون الرشید تبسم لکھتے ہیں:

”ان کے شعروں میں پختگی بھی ہے اور روانی بھی۔ کرب و الم کا اظہار بھی ہے اور ٹوٹے بکھرنے اور بکھر کے سمٹنے کے جذبات بھی نمایاں ہیں۔ انہوں نے غم دوراں اور غم جاناں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ معاشی حالات ان کی راہ میں حائل رہے۔ پریشانیوں نے ان کا راستہ روکا۔ حساس شخصیت ہونے کی وجہ سے مقصود احمد راہی نے زندگی کے تمام دکھ اپنی ذات میں سمیٹ لئے۔“ ۱۳۸

غزل

مقام آہ و فغاں سے گزر گیا ہوں میں
ہر ایک سمت سے اٹھتی ہیں انگلیاں مجھ پر
تری طلب میں کہاں سے گزر گیا ہوں میں
کبھی جو کوئے بتاں سے گزر گیا ہوں میں
یہ لگ رہا ہے جہاں سے گزر گیا ہوں میں
نگاہِ برق پتاں سے گزر گیا ہوں میں
شب فراق بھی روئی ہے سسکیاں لے کر
کبھی جو دردِ نہاں سے گزر گیا ہوں میں

ہر ایک عضو بدن یوں ہے مضمحل راہی
کہ جیسے عہدِ جواں سے گزر گیا ہوں میں ۱۳۹



سورج، زمین، چاند، ستارے بدل گئے
 بدلی تری نگاہ تو سارے بدل گئے
 طوفاں کی سمت موج کے دھارے بدل گئے
 کشتی کے ڈوبتے ہی کنارے بدل گئے
 بھڑکی کچھ اس طرح سے مرے آشیاں میں آگ
 تنکے جو تھے وہ راکھ میں سارے بدل گئے
 نکلا تھا آب و تاب سے کل چودھویں کا چاند
 بکھری جو تیری زلف، نظارے بدل گئے
 بیٹھے تھے بزم غیر میں، جب میں نظر پڑا
 پہلو وہ اپنا شرم کے مارے بدل گئے
 اے راہی سخت وقت میں نظریں چرا گئے
 وہ لوگ جو تھے جان سے پیارے بدل گئے ۱۳۰

صلاح الدین ساجد

صلاح الدین نام اور ساجد تخلص ہے۔ آپ ۱۹۵۷ء میں انصاری قوم کے جناب نسیم الدین کے ہاں پھلروان میں پیدا ہوئے۔ پھلروان میں ہی تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی سکول پھلروان نے اپنے طالب علموں کی علمی اور ادبی دونوں طرح کی تربیت کی ہے۔ صلاح الدین نے بھی اگرچہ ادبی تربیت حاصل کی لیکن ادبی سفر کا آغاز بڑی خاموشی سے کیا۔ اور پھر اسی خاموشی اور گمنامی سے چلتے رہے۔

پہلی بار ”سخن آواز“ کی ترتیب میں ان کی دو غزلیں اور ایک نظم شائع ہوئی تو یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ شاید کل کلام یہی ہے۔ شاید تلاش یا انتخاب میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ لیکن جب افضل

گوہران کا ایک مسودہ میرے پاس دیا چچے کے لئے لائے تو کلام پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ جس میں میں نے تحریر کیا تھا کہ:

”ریت کی دیوار“ استعارا ہی موت کا ہے۔ ریت کی دیوار جب کھڑی ہوتی ہے۔ تو بس..... ”اساری“ اور گری۔ بس اتنی ہی زندگی ہے جس کے پیچھے موت رواں ہے اور موت کا یہ استعارا صلاح الدین کی شاعری میں بہت استعمال ہوا ہے۔ پھر یوں لگتا ہے وہ زندگی سے زیادہ موت کو یاد کرتا تھا۔ ”ریت کی دیوار“ میں موت کے حوالے سے اتنے اشعار ہیں کہ باقی موضوعات اس میں دب کر رہ گئے ہیں اور یہ مومن کی پہچان ہے کہ وہ موت کو یاد رکھتا ہے۔

ساجد نے زندگی کو موت کے سہارے یا موت کے لئے ہی بسر کیا ہے اور جہاں غمِ زمانہ غمِ جاناں، غمِ دل اور غمِ جاں وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں ان سب غموں سے چھٹکارا اور ان کا انت صرف موت کو ہی قرار نہیں دیا سمجھا بھی ہے اور عمل بھی کیا ہے۔ اس نے موت کو بھی ”دکھ دکھ“ پہلوؤں اور زاویوں سے دیکھا ہے۔

دل برباد ساری رونقیں برباد نہ کر دے
تمہاری انجمن سے اب مرا اٹھ جانا بہتر ہے
ہمارے رتجگے اے دوستو اب ختم ہوتے ہیں
کہ بوجھل ہو گئیں آنکھیں ہمیں اب نیند آتی ہے“ ۶۴۱

صلاح الدین ساجد نے ابھی زندگی کو پوری طرح دیکھا اور پرکھا بھی نہیں تھا کہ فرشتہ اجل نے آن کر سانس کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اور پچھ سو کچھ ”۱۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء بروز جمعہ“ ۶۴۲ کو ہوا۔ پھلوان ضلع سرگودھا ہی آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔

نوٹ: ۲۰۰۸ء میں صلاح الدین ساجد کا شعری مجموعہ ”ریت کی دیوار“ کی بجائے ”عجلت“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس میں راقم کے لکھے ہوئے پیش لفظ میں سے مندرجہ بالا پیرا جو ”ریت کی دیوار“ کے حوالے سے ہے نکال دیا گیا ہے۔ نیز ”کہیں تم میکدے کا یہ سماں تبدیل کر لیتے“ غزل بھی ”عجلت“ میں شامل نہیں ہے۔

غزل

کہیں تم مے کدے کا یہ سماں تبدیل کر لیتے ارادہ پھر تو ہم پیرِ مغان تبدیل کر لیتے
 زمانے کا گلہ کرتے ہیں جو ان سے مخاطب ہوں ستارے چاند سورج آسماں تبدیل کر لیتے
 بہاروں کے ہی شیدائی اگر ہوتے تو ہم شاید خزاں آنے سے پہلے آشیاں تبدیل کر لیتے
 خموشی بھی تو اک انداز ہے اپنا، شکایت کا وگرنہ ہم یہ اندازِ فغان تبدیل کر لیتے
 نہیں میں نے کیا یہ جرم یارو پُر یقیں تم تھے نہ کرتے ہم یہ احساں تم بیاں تبدیل کر لیتے
 جو کہنا تھا وہ سب کچھ کہ لیا ہوتا مگر ساجد سرِ محفل یہ انداز بیاں تبدیل کر لیتے
 یہ کم ہمت ہیں ساجد یہ پلٹ آئیں گے رستے سے
 خبر ہوتی تو ہم بھی کارواں تبدیل کر لیتے! ۲۳۳



تیری رسوائی نہ ہو، اس خوف سے تڑپا نہ دل ورنہ کس دن یہ بتا تیرے لئے دھڑکا نہ دل
 دار تک لے جائے نہ تجھ کو تری دیوانگی لاکھ سمجھاتا رہا لیکن کبھی سمجھا نہ دل
 جب میں روٹھا پیار سے دل نے منایا اس گھڑی آج تک حیران ہوں مجھ سے کبھی روٹھا نہ دل
 لاکھ دل کی منتیں کیں آج میرے ساتھ چل آ گیا میں تیری محفل میں مگر آیا نہ دل
 دیکھ ساجد زندگی بھر تجھ کو تڑپائے گا یہ
 مجھ کو تم دفنا چلے کیوں میرا دفنا یا نہ دل ۲۲۸



منیر ایاز

نام محمد منیر اور ایاز تخلص ہے۔ آپ ۱۱ اپریل ۱۹۶۱ء ۱۳۵ کو خوشاب شہر میں محمد نذیر کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۷۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج جوہر آباد سے گریجوایشن کی ڈگری لی۔ کالج کے دوران ساحر کی نظم ”خودکشی سے پہلے“ پڑھی جو آپ کو شاعری کی طرف لانے کا سبب بنی۔ اس نظم نے آپ کے اندر کے شاعر کو جہاں جگایا وہاں ایک اتھل پتھل بھی کر دی اور جب تک آپ باوا طاہر شاہ کی بیعت نہ ہوئے اس کے حصار میں رہے۔ باوا طاہر شاہ کے بیعت کے بعد آپ ایک اور توڑ پھوڑ کے عمل سے گزرے اور پھر حالات آپ کو ایسی ڈگر پر لے گئے کہ منیر ایاز کو دیکھ کر رشک آتا تھا۔

منیر ایاز بزم فکرو فن کے بانی ممبران میں سے تھے اور پنجابی ادبی سنگت سے بھی آپ کا ناٹھ رہا۔ چونکہ آپ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اس لئے ان دونوں تنظیموں کے اجلاس اور محافل میں شرکت کرتے۔ پھر تصوف کی سمت کا ان کا یہ سفر انہیں سماجیات اور جمالیات کے ماضی سے تھوڑا دور لے گیا۔ انہوں نے مجاز سے حقیقت کا سفر شروع کیا اور یہ سفر ابھی جاری ہی تھا کہ رمضان المبارک ۲۰۰۸ء میں آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کے پرانے کلام میں سے اسلوب نگارش ملاحظہ ہو۔

غزل

مجھ کو اس دور نے اک دخترِ عریاں بخشی
تم جہانگیر ہوئے بھی تو ہمیں کچھ نہ ملا
فاقدِ مستی بھی سرِ شام کو مہماں بخشی
ہم فقیروں نے تمہیں مسندِ شاہاں بخشی
اس نے لاچاری بھی بخشی تو نمایاں بخشی
اور پھر ڈھلتی ہوئی عمرِ گریزاں بخشی

مجھ سے ایاز کو بچوایا ہے کالا پتھر

بے یقنی بھی مجھے آپ نے یزداں بخشی ۱۳۶



مجھ کو خدا کی بن کے پہچان مل گیا ہے
 فن کی اجودھیا میں روشن ہے دیپ مالا
 حسنِ خدا رسیدہ تیرے ہی چہچہوں سے
 اے دل خموش ہو جا گستاخیاں نہ کر تو
 دشتِ جنوں میں آ کر عقل رسا یہ بولی
 ایاز چھوڑ جینا مرنے کی جستجو کر
 دل کی حویلیوں کو مہمان مل گیا ہے
 شاید مکینِ دل کو بھگوان مل گیا ہے
 میری سماعتوں کو ایمان مل گیا ہے
 کرنے دے مجھ کو سجدے یزداں مل گیا ہے
 مجھ کو قسم خدا کی عرفان مل گیا ہے
 لوگوں کو زندگی کا سامان مل گیا ہے ۱۳۷

عمر دراز ساجد

خاندانی نام عمر دراز اور تخلص ساجد ہے۔ آپ ۳ اگست ۱۹۶۱ء ۱۳۸ کو پدھراڑ تحصیل
 خوشاب ضلع سرگودھا میں خدمت علی کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے تعلیمی ریکارڈ کے بارے میں
 عباس کا کہنا ہے:

”۱۹۷۸ء میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول مکڑوال ضلع

میانوالی سے پاس کیا۔ ۱۹۹۲ء میں نجی حیثیت سے ایف اے اور ۱۹۹۸ء میں

نجی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔“ ۱۳۹

عمر دراز ساجد نے میٹرک کرنے کے بعد پنجاب پراونشل کوآپریٹو بینک میں ملازمت
 اختیار کر لی اور عمر کا زیادہ حصہ منڈی بہاؤالدین میں گزار دیا۔ بینک کی مصروفیات بھی عجیب ہوتی
 ہیں۔ صبح سے شام تک ہندسوں کا کھیل۔ اس سے وقت نکال کر ادب کے لئے کچھ مختص کرنا بڑی بات
 ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمر دراز ساجد نے بہت کم لکھا۔ یہ تو خوشاب کا سالانہ مشاعرہ یا کبھی کبھی دوستوں
 سے ملاقات تھی جو اسے تحریک دیتے رہے وگرنہ وہ کب کا شعر و سخن کی دنیا سے کٹ گیا ہوتا۔

عمر دراز ساجد نے جو کچھ لکھا اس میں فکری اور فنی پختگی تو بہر حال ہے، لیکن اس کی فکر کے بارے بدر منیر کا خیال ہے کہ:

”عمر دراز کے ہاں سماجی ناہمواریوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گھٹن کارِ عمل بڑا بھرپور ہے۔ آج کے فرد اور معاشرے کا کرب کسی بھی صاحبِ دل انسان کے لئے بلاشبہ ایک تکلیف دہ امر ہے۔ عمر دراز بھی ایک متحرک، حساس اور باشعور تخلیق کار کے طور پر اپنے فریضہ سخن کی تقدیس کا پوری طرح ادراک رکھتے ہوئے زندگی کے سماجی اور نفسیاتی حقائق کی عکاسی احسن انداز سے کرتے ہیں۔ انسان کے داخل میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ، دم توڑتی اخلاقی اقدار اور روزمرہ زندگی کے دیگر المیوں کو انہوں نے جس طرح اپنے انفرادی محسوسات سے ہم آہنگ کیا ہے، وہ قابلِ غور ہے۔“ ۱۵۰

اور پھر اسی ٹوٹ پھوٹ نے ایک دن انہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ ۳ جولائی ۲۰۱۱ء کو منڈی بہاؤ الدین میں ملازمت کے دوران ہی اس دنیا سے ناطہ توڑ گئے۔ آپ کی تدفین آپ کے گاؤں پدھراڑ میں کی گئی۔

غزل

جو روح بن کے زیست کے دیوار و در میں تھا
 آسب تھا وہ جسم کے سونے کھنڈے میں تھا
 اک موج درد تھی مرے سینے میں موجزن
 اس کا خیال سوچ کے گہرے بھنور میں تھا
 شب بھر، گئے دنوں کی صدا گونجتی رہی
 اک ٹوٹا سا عکس مری چشمِ تر میں تھا
 اس سے نظر ملا کے ہوائیں پلٹ گئیں

کچھ ایسا حوصلہ ابھی بوڑھے شجر میں تھا
 اس جو رقص مور کی آنکھوں میں اشک تھے
 کیا آگہی کا زہر بھی اس جانور میں تھا
 ساجد مرے جنوں سے بھی وہ طے نہ ہو سکا
 اک مرحلہ جو شوق کے اندھے سفر میں تھا ۱۵۱



پچھڑ کے یاد نہیں کتنے ماہ و سال ہوئے
 ہم اپنا آپ کہیں راستے میں چھوڑ آئے
 ترے خیال میں ہم کتنے بے خیال ہوئے
 ترے ہی فیض سے پہنچے عروجِ زعمِ تلک
 سیاہ لے کے چلے تھے سفید بال ہوئے
 روشِ روش پہ ہمیں روشنی نے بھٹکایا
 ترے کرم ہی سے ہم صاحبِ زوال ہوئے
 قدم قدم پہ اندھیروں سے مالا مال ہوئے
 سکت نہیں تھی ترا ہاتھ تھام لینے کی
 سفر سے لوٹے تو ہم اس قدر نڈھال ہوئے
 تری تلاش میں بے چہرہ ہو گئے ساجد
 کہ صرف تیرے ہی رستے میں خدوخال ہوئے ۱۵۲

یوسف خورشید

زندگی نے کب کسی کا ساتھ دیا ہے۔ ایک وقت وہ ضرور آتا ہے جب موت غلبہ پالیتی
 ہے۔ میں سوچتا ہوں ایک آدمی ایک عرصے سے دل کا مریض چلا آ رہا ہے۔ مکمل علاج کے بعد اللہ
 تعالیٰ اسے صحت عطا فرماتا ہے۔ ڈاکٹر مشورہ دیتا ہے کبھی کبھی چیک اپ ضروری ہے۔ ایک دن وہ
 شخص ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ ڈاکٹر اسے چیک کرنے کے بعد کہتا ہے:
 ”ماشاء اللہ اب آپ مکمل صحت یاب ہیں۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔“
 وہ شخص ہسپتال سے باہر نکلتا ہے۔ کار کا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگتا ہے کہ موت کا فرشتہ پہنچ کر

امانت وصول کر لیتا ہے اور وہ امانت جس کے بارے ہر مسلمان کو یقین ہے کہ:

”اس کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جاتا ہے۔“

ہے نا عجیب بات! لیکن زندگی اور موت کے کھیل میں کچھ عجیب نہیں۔ موت نے آنا ہے۔

اس کا وقت مقرر ہے۔ اور یہ وقت ۳۱ مارچ ۲۰۰۷ء کا یوسف خورشید کیلئے مقرر تھا۔ ڈاکٹر جو بھی کر لیتا

موت کو روک نہیں سکتا تھا اور بیماری صحت میں بدل جانے کے بعد بھی یہ تو ہونا ہی تھا۔ وہ شخص اردو کا

شاعر، ضلع سرگودھا کے گاؤں شریفہ کا باسی محمد یوسف المعروف ”یوسف خورشید کیم جنوری ۱۹۶۴ء کو اسی

گاؤں شریفہ میں پیدا ہوا تھا۔“ ۱۵۳ راقم کی اس سے پہلی ملاقات ۱۹۸۴ء کے ایک مشاعرہ میں

ہوئی۔ اس نے ابھی نیا نیا شعر کہنا شروع کیا تھا اور ان دنوں شاید خوشاب میں مقیم تھا۔ کیونکہ غزل سے

پہلے جو شعر اس نے پڑھا تھا مجھے آج بھی یاد ہے۔

دیکھو تمہارے واسطے سستا گیا ہوں میں ورنہ خوشاب شہر سے اکتا گیا ہوں میں

شاید اس کے ستانے کا مقصد تعلیم کی تکمیل تھی۔ گورنمنٹ کالج جوہر آباد میں وہ بی۔ اے

کا طالب علم تھا۔ ۱۹۸۳ء میں کالج کے دور طالب علمی میں ہی اسے شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ کالج کے

مجلد ”جوہر“ نے اس کی صلاحیتوں کو ابھارا۔ جس کے ادارتی حلقہ میں بھی وہ شامل رہا۔ مزید یہ ہے کہ

آپ کو یہ شوق اپنے خاندان کے دیگر افراد ”خورشید گوہر قلم، ڈاکٹر شعیب احمد اور ڈاکٹر معین نظامی

وغیرہ سے ملا تھا جبکہ پروفیسر شعیب اور پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی نے اسے Polish کیا۔ اور یوسف

خورشید بھی ان کی شاگردی پر نازاں تھا۔“ ۱۵۴

یوسف خورشید نے بی۔ اے کرنے کے بعد اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا اور اپنی درویشی و

عاجزی کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں کامیاب رہا۔ آپ میں اگرچہ گوندلوں والا رکھ رکھاؤ اور اپنے

والا مولا بخش گوندل والا ایک دبدبہ سا تھا لیکن دوستوں اور احباب کے ساتھ آپ کا رویہ اتنا عاجزانہ

اور مخلصانہ ہوتا کہ رشک آنے لگتا تھا۔ جب تک وہ تعلیم حاصل کرتا رہا خواہ دھرمیہ ہو یا جوہر آباد اس

میں وہ رگ موجود رہی۔ جو وراثتاً چلی آرہی تھی۔ آپ کا خاندان چونکہ علم و فضل میں بھی نمایاں تھا تو

ان اثرات کا اس میں درآنا بھی کوئی عجیب بات نہیں۔ اور یہ دل کا درد بھی انہیں والد کی طرف سے حصے میں ملا تھا۔ کیونکہ ان کے والد بھی دل کے دورے سے اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ پھر بھائی کی وفات نے اس کے اندر بھی ایک آگ جلا دی۔ یوسف خورشید شاعری کے ساتھ ساتھ کالم بھی لکھنے لگا۔ بہت سے رسائل میں اس کی نثر اور نظم شائع ہونے لگی۔ شاید یہی اس کا وہ Turn تھا جس میں ہم نے اسے دیکھا۔ اور ۲۰۰۲ء میں ”آئینوں کے اپنے دکھ“ اس کا شعری مجموعہ شائع ہوا۔ وہ واقعی ایک آئینہ تھا اور اس کے اپنے دکھ تھے جنہیں وہ جھیل بھی رہا تھا اور ان میں آہستہ آہستہ ڈھل بھی رہا تھا۔ اوپر سے مسکرا کر ملنے والا اندر سے شاید ٹوٹ چکا تھا اور پھر وہ لمحہ آ گیا جو ہر ذی نفس پر آتا ہے۔ خورشید عالم گوہر قلم کا کہنا ہے:

”یوسف خورشید زندگی کا ایک ایسا ورق ہے کہ جس سے کسی طور

انکار نہیں ہو سکتا۔ اس نے زندگی میں جو سختیاں برداشت کیں وہ شاید اس کی

تربیت کیلئے ضروری تھیں۔ کیونکہ ریگستان میں کھلنے والا پھول بہر حال

دوسرے پھولوں کی نسبت زیادہ تحسین کا مستحق ہوتا ہے۔

یوسف خورشید کا رواں انداز، سادگی کے ساتھ بے پناہ جذبے کا ظہار اور

بناوٹ کے بغیر حقیقت کا اعتراف اس کی شاعری کے نمایاں پہلو ہیں۔“ ۶۵۵

برف لوگوں نے جو ہاتھوں پہ اٹھائے سورج پھر بہت دور سمندر نے چھپائے سورج

اس نے اک بار کیا تھا جو اندھیروں کا گلا ہم نے تا عمر پھر آنگن میں اگائے سورج

لوگ کہتے ہیں کہ تب جس بہت ہوتا ہے جب بھی ساحل پہ سر شام نہائے سورج

ہم کو پھر بھول گئے اپنے ہی گھر کے رستے جب سے اس چاند نے آنکھوں میں سجائے سورج

صفحہ خاک پہ کل میں نے اندھیرا لکھا

اس نے پھر میری ہتھیلی پہ بنائے سورج ۶۵۶



منزل نہ کوئی دوستو رستہ دکھائی دے رہبر بھی آج تو مجھے اندھا دکھائی دے
 ضد ہے کہ چاند روشنی بانٹے نہ شہر میں اور یہ بھی شوق ہے کہ وہ پورا دکھائی دے
 حالانکہ ایک پیار کا دریا تھا چار سو لیکن حدِ نگاہ پہ صحرا دکھائی دے
 اس نے تعلقات کو دی ہے نئی روش ہر شخص اب تو شہر میں اس کا دکھائی دے
 دل کے مکان میں کوئی ٹھہرا تھا عمر سے آنسو کے روپ میں کوئی بہتا دکھائی دے
 کاجل ہے اور آنکھ میں کچھ رتجگا بھی ہے آنچل بھی اس کا تیج پہ بھیگا دکھائی دے
 خود ہی تو ترکِ دوستی کا فیصلہ کیا کیوں اشک تیری آنکھ میں ڈھلتا دکھائی دے
 یوسف غزل کو ہیر کے سانچے میں ڈھال دو

اس کو ہر ایک شعر میں رانجھا دکھائی دے ۶۵۷

سید معرفت ہمدانی

جواں مرگ سید معرفت ہمدانی کا اصل نام سید ادریس احمد شاہ ہمدانی اور آپ کے والد کا
 نام سید عبدالعزیز شاہ ہمدانی تھا۔ ”آپ ۱۹۶۳ء میں موضع لکھی وال تحصیل ساہیوال ضلع سرگودھا میں
 پیدا ہوئے۔“ ۶۵۸ آپ کا خاندان مذہبی، ادبی اور علمی تھا۔ یہاں ہے اس لئے نہیں لکھا کہ اب اس
 گھرانے کے حالات علمی و ادبی نہیں رہے۔ صرف دور کے رشتہ دار سید احمد سعید ہمدانی علم و ادب میں
 اپنا ایک نام لئے پھر رہے ہیں۔ آپ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

”آپ کو تجسس اور حیرانی ہوگی کہ میں بارہ یا تیرہ برس کی عمر میں

محنت مزدوری کی خاطر کراچی گیا۔ ۱۹۶۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ کراچی میں نہ کوئی

ہمارا سرپرست تھا نہ کوئی رشتہ دار اور نہ کوئی ہمدرد۔ جب ہم سات برس کے

تھے تو والدہ وفات پا گئیں اور پندرہ یا چودہ برس کی عمر میں والد بزرگوار دنیا

سے اٹھ گئے اور ہم سایہ پداری سے محروم ہو گئے۔ بچپن اورنگی ٹاؤن سیکٹر نمبر ۱۲

میں گزارا۔“ ۱۵۹

دراصل معرفت ہمدانی مکمل طور پر اپنی شخصیت کو بنانے میں اپنی ذات کے زیر اثر تھا۔ اگرچہ مجھے انہوں نے بتایا تھا کہ میں ۹ جماعت تک پڑھا ہوں لیکن اس میں بھی حقیقت نہیں۔ اس نے بہت کم تعلیم حاصل کی تھی۔ ساری زندگی محنت مزدوری کی لیکن مطالعہ اس کا بہت وسیع تھا۔ سن ولادت کے بارے میں بھی ان کی دورائیں شاید اسی باعث ہوں کہ محنت مزدوری نے انہیں اس طرف سوچنے کا موقع ہی نہ دیا ہو۔ البتہ علم کی اس کمی کو پورا کرنے اور پیاس بجھانے کیلئے ہزاروں کتابیں مختلف علوم پر پڑھ ڈالیں۔ ان کی کتابوں کی ذاتی Collection بھی عمدہ اور ہزاروں میں تھی۔

سید معرفت ہمدانی کراچی سے آنے کے بعد حاصل پور، بہاولنگر اور ساہیوال (سرگودھا) میں اپنا کاروبار کرتا رہا اور بالآخر سرگودھا منتقل ہو گیا۔ اس کے اندر ایک ادبی ہلچل موجود تھی لیکن تنہا روی اور کوئی احساس اسے لوگوں سے ملنے میں مانع تھا۔ وہ خاموشی سے شعر کہتا اور پھاڑتا رہا۔ وہ شعر سننے سنانے کا بھی شوقین نہیں تھا۔ باتیں کرنے کا بھی اسے کوئی شوق نہیں تھا البتہ باتیں سنتا بڑے غور سے تھا اور اچھی بات پلے باندھ لیتا تھا یعنی تمام عمر طالب علمی میں گزارتا رہا۔ اور کبھی کبھار ریڈیو پر کوئی فرمائش بھیج دیتا یا کوئی غزل کسی کی پڑھ کر پسند آتی تو خط لکھ دینا۔ اسی طرح نذیراے قمر سے اس کا رابطہ ہوا۔ نذیراے قمر سپین میں مقیم ہے۔ دونوں نے مل کر سرگودھا سے ”دریچہ انٹرنیشنل“ کے نام سے ایک ادبی جریدہ جاری کیا۔ اس پرچے پر معرفت ہمدانی نے بہت محنت کی۔ اور اسے معیاری حوالے سے واقعی بین الاقوامی بنا دیا۔ پہلے شمارے کی اشاعت کے ساتھ ہی ان کا اپنا شعری مجموعہ ”میری شرط محبت ہے“ بھی شائع ہوا تو لوگوں کو ان کے شاعر ہونے کا علم ہوا۔

”میری شرط محبت ہے“ میں انہوں نے کئی شاعرانہ پیش گوئیاں بھی کیں۔ جس میں سے ایک ان کی موت کی بھی ہے۔ اگرچہ موت سے مفر نہیں لیکن جب اسے زیادہ یاد کیا جائے تو مطلب کچھ اور ہی اخذ کیا جاتا ہے۔

معرفت ہمدانی دوستوں کا دوست تھا اور خاموشی سے دوستی نبھانے کو عبادت سمجھتا تھا۔

معرفت کی زندگی کے آخری پانچ دن میری اس سے زیادہ ملاقاتیں رہیں۔ کیا پتہ تھا کہ یہ خلوص و محبت کا پیکر اپنے دکھوں میں اندر ہی اندر گھلتا ہوا ۱۵ جون ۲۰۰۷ء کی شب کو ہمیں یوں ہی ایک نئے دکھ سے آشنا کر کے چلا جائے گا۔

معرفت ہمدانی چونکہ گھر میں اپنے معذور بھائی کے ساتھ اکیلا رہتا تھا۔ اس کا بھائی بولتا نہیں تھا مکمل خاموشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس لئے رات وفات کے بعد جو سب سے پہلی اطلاع تھی وہ اس کے پڑوسیوں نے مجھے دی۔ اور میں نے رات بارہ ایک بجے تک مختلف دوستوں کو اس سانحہ سے آگاہ کر دیا۔ دوسرے دن صبح ان کی میت آبائی گاؤں لکھیوال لے جا کر اپنے والد کے نزدیک دفن کی گئی۔

”میری شرط محبت ہے“ کے علاوہ معرفت ہمدانی نے ”دریچہ انٹرنیشنل“ کا ماں نمبر جس خوبصورتی اور محنت سے ترتیب دیا تھا۔ وہ بھی قابل تحسین اور ایک دستاویز ہے۔ اسی طرح جب ۲۰۰۵ء میں زلزلہ آیا تو اس شمارے میں اس حوالے سے بہت سا مواد جمع کرنا اس کے اندر کے انسان کو سمجھنے کے لئے خاصی معاونت دیتا ہے۔

”دریچہ انٹرنیشنل“ معرفت ہمدانی کی وفات کے بعد اسدا عوان (ساہیوال) کے پاس چلا گیا۔ جس نے دوسرا شمارہ ”معرفت ہمدانی نمبر“ نکال کر اپنی محبتوں اور نذیراے قمر کی دوستی کی لاج رکھ لی۔ راقم (شا کر کنڈان) نے ”میری شرط محبت ہے“ کے پیش لفظ میں اس کی فکری پرواز کے بارے میں یہ الفاظ تحریر کئے تھے:

”آج ”میری شرط محبت ہے“ کا مسودہ پڑھتے ہوئے معرفت

پر قدوسی طاقت کے اثرات کا مجھے بھرپور ادراک ہوا۔ اور میں اس کی جبلت کی لطافت اور فکر کی پرواز سے آشنا ہوا۔ وہ جب کہتا ہے۔

اس اجالے کے بعد کیا ہوگا یہ اجالا جو تیرگی سا ہے تو اس کے فکر کی پرواز نہ جانے کس عالم کے افق پر ہوتی ہے۔ حال کو وہ بڑی

بارکی سے دیکھنے کے بعد مستقبل کے اندھیروں میں جھانک رہا ہوتا ہے۔ جسے ہم اجالے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں کتنی سیاہی ہے اور اس کے بعد مزید جس سیاہی نے ہمیں حصار میں لینا ہے معرفت ان لمحوں کی سوچ رکھتا ہے۔“ ۶۱۰

معرفت نے شاعری میں غزل، نظم اور ماہیا کی اصناف کو برتا ہے۔ افسوس کہ ”میری شرط محبت ہے“ کے بعد کی شاعری یا اس میں سے بچی ہوئی شاعری کا نجانے کیا ہوا۔ کیونکہ بچے بہت چھوٹے ہیں۔ اور بھائی اس قابل نہیں کہ سنبھال سکیں۔

غزل

یہی وقت ہے مانگ لو ہم سے اب کچھ محبت میں ہم بھول جائیں گے سب کچھ
چمن میں اسے روبرو گل کے دیکھا حسین لگ رہا تھا وہاں پر عجب دیکھا
چلو بھیک ہی مانگ کر دیکھتے ہیں عطا وہ جو کرتا نہیں بے طلب کچھ
نہیں صرف تارے ہی ٹوٹے فلک سے زمیں پر بھی دیکھے گئے جاں بلب کچھ
یہی اک سبب ہے تجھے چاہنے کا تجھے چاہنے کا نہیں ہے سبب کچھ
لو پھر بج انھیں گھنٹیاں دھڑکنوں کی
مجھے اس نے شاید کہا زیر لب کچھ ۶۱۱



ہر وقت ذہن میں جو یہ مرنے کا ڈر رہے بہتر ہے اس عذاب سے انسان مر رہے
یہ بھی مرے نصیب کی تاثیر سے ہوا اشجار میرے کھیت کے جو بے ثمر رہے
کوئی عطا کرے مجھے اشکوں کا سلسلہ تنہائیوں کی دھوپ میں دامن تو تر رہے
جن کو زمین پر کوئی منزل نہ مل سکی بالائے آسمان بھی وہ در بدر رہے
میرا کہا تو ایک بھی مانا نہیں گیا
لیکن انگشت غیر پر وہ ناچ کر رہے ۶۱۲

عامر انصاری

”عامر انصاری کا خاندانی نام شجاع الدین تھا۔ آپ ۴ اپریل ۱۹۶۳ء کو پھلروان ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔“ ۱۶۳ آپ کے بڑے بھائی اصلاح الدین ساجد بھی شعر کہتے تھے لیکن وہ کبھی سامنے نہ آئے اور گمنامی میں رہے۔ آپ کے والد کا نام نسیم الدین انصاری تھا۔

عامر انصاری نے میٹرک تک تعلیم پھلروان سے حاصل کی۔ بعد ازاں سرگودھا سے ڈی کام کی ڈگری لی۔ جب میٹرک کے طالب علم تھے تو شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ چونکہ شوکت راز بھی اسی سکول میں تدریسی شعبے سے وابستہ تھے۔ عامر نے ان سے شاعری کے اصول سیکھنے کے لئے شاگردی اختیار کی۔ ڈی کام کے بعد جب واپس پھلروان میں فراغت سے وقت گزارنے کا موقع ملا تو مجلس فکر و شعور اور تنویر ادب پھلروان کی تنظیموں سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۸۸ء میں عامر اکیڈمی کے نام سے اپنی ایک ادبی تنظیم بنائی۔ اس تنظیم نے اگرچہ ادب کے فروغ کے لئے کوئی زیادہ کام نہیں کیا لیکن عامر کی ساری کتابیں اسی تنظیم کے تحت شائع ہوئیں۔ عامر انصاری کی جو تصانیف شائع ہوئیں ان کے نام ہیں:

(۱) دراڑیں (۲) انگور بیٹھے ہیں (۳) خیالوں کا سفر (۴) زرد آدمی

(۵) بجھتے دیپ (۶) جدائی

جو شعری مجموعے تشنہء اشاعت رہے ان کے نام ہیں:

”عکس“۔ ”سناٹا“۔ ”شیشہ اور میں“۔ ”صدیوں کا سفر“۔ ”رات کے مسافر“۔ ”یہ شیشہ ٹوٹ

جاتا ہے“ ۱۶۳

عامر انصاری کے خاندان میں ہیپاٹائٹس کا موزی مرض کئی جانیں لے چکا ہے اور اسی

بیماری میں عامر نے بھی ۸ ستمبر ۲۰۰۴ء ۱۶۵ کو پھلروان میں ہی وفات پائی۔

عامر انصاری نے غزل اور قطعات میں اپنا بہت سا کلام چھوڑا اور ان میں تجربات سے

بھی گزرے۔ خاص طور پر غزل میں طویل بحر کو بھی اپنایا۔ نظم بھی کہی۔ اور پوری شاعری میں اپنی ذات کا عکس چھوڑ گئے۔

جو سب سے پہلے گرے گی مری سواری ہے کہ قتلِ عام میں اس بار میری باری ہے
 ہزاروں پھانسیاں دیں جس نے بے گناہوں کو اسی جلاد نے گردن مری اتاری ہے
 وہ بدلا لے رہا ہے اپنی آپ بیتی کا جو کل شکار تھا خود آج وہ شکاری ہے
 جو اپنی چھاؤں میں سب کو بٹھایا کرتا تھا اُس درخت کے سینے پہ آج آری ہے
 کیا ہے اس قدر حالت نے ہمیں لاغر بدن پر اپنے ہی سر کا وزن ہی بھاری ہے
 دکھوں کی کھیتیاں پکتی ہیں اس سے عامر آج
 مری زمیں پہ جو ہر سمت اشک باری ہے



الاؤ بڑھ گیا انسان جلنے والا ہے زمین کی کوکھ سے لاوا ابلنے والا ہے
 لہو سے کھیلتی ہے پھر جنوں کی کٹ پتلی لہو میں کس کا بدن پھر اترنے والا ہے
 چلو اب اور کہیں دیکھیں بے کفن لاشے فصیلِ شہر کا منظر اجڑنے والا ہے
 ہر ایک سمت ہیں پانی میں ماتمی چینیں سمندر آج کسی کو نکلنے والا ہے
 وہ خود کو لائے گا خیر البشر کے سائے میں وہ روز و شب کے قلق سے نکلنے والا ہے
 بچا لو جسم کو شعلے گریں گے عامر اب
 شبیہ وقت کا سورج پکھلنے والا ہے ۲۶۶

شاہدراہی

شاہدراہی کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے سبط الم کی یاد آگئی۔ انہوں نے پبلشر کو اپنا شعری مجموعہ دیا تو جلدی اشاعت کے سلسلے میں ہر روز اس کے پاس چکر لگاتے۔ پبلشر وعدہ یاد دلا

دیتا کہ ابھی تو اتنے دن باقی ہیں۔ ایک دن پہلے شام کو پبلشر کے پاس گئے کہ مجھے بہت جلدی ہے۔ اور پھر دوسرے دن یعنی مقررہ تاریخ کو کتاب چھپ گئی لیکن پبلشر انتظار کرتا رہا اور سبب الم نہ آئے تو وہ خود ایک کاپی لے کر ان کے گھر گیا۔ دیکھا تو صفِ ماتم پچھی ہے اور وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ایسا ہی شاہد راہی کے ساتھ ہوا۔ کتاب جب شائع ہو کر اس کے گھر پہنچی تو وہ اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ یہ بھی ”اتفاقات ہیں زمانے کے“۔

شاہد راہی ۲۵ مارچ ۱۹۶۸ء کو چک نمبر ۲۲ شمالی تحصیل بھلووال میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۷ء پانچویں جماعت کے طالب علم تھے جب شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ اور پھر فراغت کے بعد ۱۹۹۰ء میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔ ابتدا گیت سے ہوئی بعد میں وقت کے ساتھ ساتھ ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی۔ وہ اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

”آغاز شاعری سے ۱۹۹۶ء تک کا عرصہ لاہور میں گزرا جہاں ذہن و قلب دنیاوی جدت طرازیوں سے آشنا ہوئے مگر شاعری میں ایک ایسی کلاسیکی چھاپ لگ چکی تھی کہ اسے بدلنا میرے اختیار سے باہر ہو گیا۔ اسی طرزِ سخن کو جاری رکھتے ہوئے ماضی قریب میں ایک وقت آیا کہ مجھے لہجے پر فخر ہونے لگا۔“ ۱۶۸

شاہد راہی ۱۹۹۶ء میں گاؤں واپسی آیا تو سرگودھا رائٹرز کلب کے اجلاسوں میں بھی شرکت کرنے لگا۔ بھلووال کے شعراء سے ملا تو سوچ اور خیالات میں پختگی آئی۔ وہ جو ایک نغمہ نگار تھا اور گیت لکھنے کے فن سے آگاہ تھا اسے بھی آزما یا اور غزل کی جانب متوجہ ہوا۔

”مری مفلسی مرا جرم ہے“ شاہد راہی کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ جس کا تعارف اُس نے خود لکھا اور اس پر ۱۶ اپریل ۲۰۰۱ء کی تاریخ لکھی۔ اس مجموعہ کلام کی اشاعت کی تاریخ ۲۰ مئی ۲۰۰۱ء ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ شاہد کی وفات ۱۶ اپریل اور ۲۰ مئی کے درمیان ہوئی ہوگی۔ میں جب چک نمبر ۲۲ شمال گیا تو وہاں بھی وہی ”جائگہ“ نظام کہ صحیح تاریخ تو یاد نہیں۔

تیری سوچوں کا محور ہو گیا ہوں کہ میں ذرے سے گوہر ہو گیا ہوں
 مجھے غم کا خزانہ مل گیا ہے کہ اب میں بھی سکندر ہو گیا ہوں
 غمِ الفت نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ میں تیرا مقدر ہو گیا ہوں
 ابھی طوفان مجھ سے کھیلتے ہیں سمجھ لو میں سمندر ہو گیا ہوں
 ستمگر وقت سے لڑنا ہے مجھ کو تمناؤں کا لشکر ہو گیا ہوں
 تمہارے حسن کی تعریف لکھ کے چلو میں بھی سخنور ہو گیا ہوں
 کہ راہی دیکھ کر تصویر تیری

شناسائے مصور ہو گیا ہوں ۱۶۹



تیری آنکھوں سے لڑ گئی آنکھیں کسی مصیبت میں پڑ گئی آنکھیں
 اور نکلتی نہیں کسی شے پر تیری چوکھٹ پہ اڑ گئی آنکھیں
 جانے کیسے نشے میں رہتی ہیں جانے کیوں کر بگڑ گئی آنکھیں
 اب بہاتی ہیں خون کے آنسو اب کسی سے بچھڑ گئی آنکھیں
 حسرت دید جان لے لے گی ہائے سول پہ چڑھ گئی آنکھیں
 ان میں راہی ترا بسیرا ہے
 تم گئے تو اجڑ گئی آنکھیں ۱۷۰

ساغر چشتی

ساغر چشتی کا تعلق اگرچہ میرے گاؤں موضع کنڈان سے ہے لیکن اُس سے میری پہلی ملاقات خوشاب میں ہوئی۔ جب اُس کو والدین کے ساتھ یہاں منتقل ہوئے تقریباً تیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اُس کے والد مشتاق احمد سے گاؤں میں میری صرف دور نزدیک کی

”سلامائیکی“ تھی۔ مشتاق کی شادی کا بھی مجھے علم ہے اور ساغر کی پیدائش کا بھی۔ ساغر چشتی کا اصل نام محمد اسلم تھا۔ ساغر اُس کا تخلص تھا وہ سید مبارک علی شاہ صاحب آف جہی شریف سے بیعت ہیں جن کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ اسی نسبت سے چشتی کو نام کا حصہ بنا لیا۔

محمد اسلم ۱۱ نومبر ۱۹۶۹ء کو موضع کنڈان کلاں تحصیل شاہ پور ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں سکول جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ محمد خان جو نیجو کے دور میں جب روشنی سکول کھلے تو محمد اسلم نے بھی داخلہ لے لیا۔ گیارہ دن لگاتار سکول جاتا رہا۔ اُس کے بعد انیس دن تک کسی مجبوری کے تحت نہ جاسکا۔ جب بیسویں دن گیا تو سکول بند ہو چکے تھے۔ کیونکہ انہیں دنوں میں الیکشن ہوئے اور حکومت کی تبدیلی روشنی سکولوں کا خاتمہ کر گئی۔ اسلم کے لئے یہ خبر افسردہ کر دینے والی تھی۔ سو اسی دن واپس لوٹنے پر یہ شعر کہا:

قدرت کا یہ عجوبہ نرالا ہے دوستو : مکتب ہوا جو بند مرا ذہن کھل گیا
اور پھر اس دن سے لے کر بقول بدر منیر ع وہ جب ملتا ہے اک تازہ غزل کے
ساتھ ملتا ہے۔ ساغر چشتی کا کہنا ہے:

”یہ پیر و مرشد کی نظر فیض ہے کہ اندرون شش لسان من شعری
گویم۔ یکے پنجابی دوئم اردو، سوئم فارسی، چہارم سرائیکی، پنجم انگریزی و ششم
سندھی۔“ ۱۷۱

اور یہ واقعی ایک عجوبہ ہے کہ جو شخص کنڈان اور خوشاب سے کہیں باہر نہیں گیا۔ کسی سے کچھ
پڑھا نہیں اور وہ چھ زبانوں میں شعر کہتا ہے تو یہ واقعی کوئی خاص بات ہے گویا اللہ تعالیٰ کے نظام کو تسلیم
کئے بغیر یہاں چارہ نہیں۔

ساغر چشتی درویشانہ اور جلالی فطرت کا مالک تھا۔ جوش میں آتا تو ہوش سے بیگانہ ہو جاتا۔
اس وقت اُس کی گفتگو سننے والی اور حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ پروفیسر بدر منیر کا کہنا ہے :
”ساغر چشتی درویشانہ اور قلندرانہ مسلک رکھنے کے باوجود اپنی

شاعری میں ایک جلال اور تمکنت رکھتے ہیں۔ ان کے وجود میں سلگنے والا اضطراب اور بے چینی جب شعروں میں ڈھلتی ہے تو ان کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں حقیقت اور مجاز کے رنگ اس طرح گھلتے ملتے ہیں کہ کوئی تیسری کیفیت وجود میں آ جاتی ہے۔“ ۲۳۶

واقعی ساغر چشتی، ساغر صدیقی کی آج کی تصویر تھا۔ جو صرف اچھا شعر ہی نہیں کہتا اپنا الگ رنگ بھی رکھتا تھا۔ وہ خوشاب کی مائز میں مزدوری کرتا تھا اور پھر ۴ جون ۲۰۱۲ء کو سخت گرمی اور جس کے باعث مائیں کے اندر ہی سانس گھٹنے سے دم توڑ گیا۔

جو میری آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ میں نہیں ہوں
 جو میرے کانوں سے سن رہا ہے وہ میں نہیں ہوں
 ہے وہ بھی کوئی مجھے جگا کر جو سو گیا ہے
 سلا کے جو مجھ میں جاگتا ہے وہ میں نہیں ہوں
 عیاں ہے لوگو تمہاری آنکھوں سے میرا ظاہر
 جو میرے اندر چھپا ہوا ہے وہ میں نہیں ہوں
 جو اس کو خود میں چھپا رہا ہے وہ میں ہوں بیشک
 جو خود ہی مجھ میں عیاں ہوا ہے وہ میں نہیں ہوں
 میں اپنی خاطر کما رہا ہوں تو کھا رہا ہوں
 جو ساری خلقت کو پالتا ہے وہ میں نہیں ہوں
 بھلے زباں اور ہونٹ چشتی کے ہل رہے ہیں
 غزل تمہیں جو سنا رہا ہے وہ میں نہیں ہوں ۲۷۳



تھا نیا نیا پہ عتیق تھا اسے کیا ہوا وہ عدو نہیں تھا رفیق تھا اسے کیا ہوا

میرے حال کو نہ سمجھ سکا یہ جہاں تو کیا ہوا میرے جال میں وہ عمیق تھا اسے کیا ہوا
 بڑے الجھے الجھے سوال تھے میرے ذہن میں جو سوال خاص دقیق تھا اسے کیا ہوا
 میں تو سیم تھا تبھی رونقیں نہیں لا سکا وہ تو خاص یعنی عمیق تھا اسے کیا ہوا
 تھا وہ خاص صاحبِ خلق بھی میرے واسطے بڑا مہرباں شفیق تھا اسے کیا ہوا

سرِ راہ چستی وہ جو ملے تو میں پوچھ لوں

جو قلندروں کا طریق تھا اسے کیا ہوا ۱۷۷۳

☆☆☆

ماخذات

- ۱۔ مکتوب محمد صادق قصوری (برج کلاں - قصور) بنام راقم (سرگودھا)، ۱۹ مئی ۲۰۰۷ء
- ۲۔ خفتگان خاک لاہور، پروفیسر محمد اسلم، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۳ء
- ۳۔ تذکرہ علمائے پنجاب، حصہ دوم، اختر راہی، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۳۶۹
- ۴۔ ماہنامہ شام و سحر (نعت نمبر ۲) لاہور، جنوری فروری ۱۹۸۲ء، ص ۲۸۸
- ۵۔ نور خوارق حیدری، سید حافظ حسن علی شاہ گیلانی چشتی حیدری، آستانہ عالیہ جی شریف ضلع سرگودھا، ۱۳۹۵ھ، ص ۵
- ۶۔ تقویم تاریخی، عبدالقدوس ہاشمی، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، طبع دوم، ۱۹۸۷ء، ص ۳۱۹
- ۷۔ نور خوارق حیدری، ایضاً، ص ۷
- ۸۔ ایضاً ص ۴۰۱
- ۹۔ مقناطیس الوجدت، حضرت مخدوم سید حیدر شاہ خنی چشتی قادری سلیمانی، لاہور، ۱۹۰۷ء مختلف صفحات سے اشعار لیے
- ۱۰۔ نور خوارق حیدری، ایضاً ص ۳۲۸
- ۱۱۔ بیسویں صدی کے رسول نمبر تحقیقی و تعارفی جائزہ، پروفیسر محمد اقبال جاوید، فروغ ادب اکادمی، گوجرانوالہ، ۱۹۹۹ء، ص ۵۱۲
- ۱۲۔ تاریخ مشائخ نقشبندیہ، پروفیسر صاحبزادہ محمد عبدالرسول لہمی، زاویہ۔ دربار مارکیٹ، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۵۳۰
- ۱۳۔ ایضاً ص ۳۹۵
- ۱۴۔ ماہنامہ شمس الاسلام، بھیرہ، فروری ۱۹۳۹ء، ص ۲
- ۱۵۔ تذکار بگوبہ، جلد اول، ڈاکٹر صاحبزادہ انوار احمد بگوبہ، موکیزیہ مجلس حزب الانصار پاکستان، بھیرہ، بار دوم ۲۰۰۷ء، ص ۳۹۱
- ۱۶۔ تاریخ بھیرہ، ابوشاہین فاروقی ہفت روزہ تبسم، سرگودھا، بار دوم، ۱۹۹۳ء، ص ۳۵۹
- ۱۷۔ سخنوران سرگودھا، محمود اسیر، ادارہ شائین ادب سرگودھا، ۱۹۸۳ء، ص ۳۸۰
- ۱۸۔ پنجابی ادب دی کہانی، عبدالغفور قریشی، پنجابی ادبی بورڈ لاہور، ۱۹۸۷ء
- ۱۹۔ تقویم تاریخی، ایضاً ص ۳۲۳
- ۲۰۔ پھل کڑانہ بار دے، ملک جاوید کھنجر، راوی پبلشرز اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۶
- ۲۱۔ تاریخ بھیرہ، ایضاً ص ۳۵۹
- ۲۲۔ تذکار بگوبہ، ایضاً ص ۳۹۹
- ۲۳۔ واصف علی واصف۔ احوال و آثار، پروفیسر محمد ظہیر بدر، القمر انٹر پرائز اردو بازار لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۹
- ۲۴۔ واصف علی واصف کا سوانحی خاکہ، ثروت طارق حبیب، مشمولہ: سہ ماہی شیبہ، خوشاب، اپریل تا ستمبر ۱۹۹۹ء
- ۲۵۔ واصف علی واصف۔ احوال و آثار، ایضاً ص ۱۹

The History of Sargodha, Prof. Sahibzada Muhammad Abdul Rasul, - ۲۶
University of Sargodha, 2006, P-269

۲۷۔ آئینہ حق نما، مولوی محمد امین خوشابی، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور، س ن، ص ۳

۲۸۔ ایضاً ص ۱۲، ۱۱

۲۹۔ تذکارِ بگویہ، ایضاً ص ۲۱۸

۳۰۔ ایضاً ص ۲۲۳

۳۱۔ ایضاً ص ۱۶۳

۳۲۔ سوہ جرنی مع غزل و کافی، مولوی عبد المجید، کرم الدین تاجران کتب، لاہور، س ن، ص ۱۵، ۱۶

۳۳۔ تذکارِ بگویہ، ایضاً ص ۶۱۰

۳۴۔ باب الاعوان، مولوی نور الدین سلیمانی، لاہور، ۱۳۱۹ھ، ص ۳

۳۵۔ ایضاً ص ۲۰۳

۳۶۔ ایضاً ص ۲۰۵

۳۷۔ تقویم تاریخی، ایضاً ص ۳۲۳

۳۸۔ وادی سون سیکسر، محمد سرور اعوان، لوک ورثہ اسلام آباد، س ن، ص ۱۵۱

۳۹۔ ایضاً ص ۱۵۲

۴۰۔ باب الاعوان، ایضاً ص ۱

۴۱۔ ہندو دھرم کی عظمت، جی این نندا، لاہور، س ن، ص ۷، ۸

۴۲۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۱۷۷

۴۳۔ اخلاقِ عاطف (سرگودھا) سے راقم کی تحریر ملی

۴۴۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۱۷۷

۴۵۔ جانِ رحمت، مرتبہ: اخلاقِ عاطف، مجلسِ خدامِ اسلام سرگودھا، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۶

۴۶۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۱۷۹

۴۷۔ اظہارِ حقیقت، باوا محمد عمر رند خوشابی، سرگودھا، س ن

۴۸۔ وفياتِ نامورانِ پاکستان، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلج، اردو سائنس بورڈ لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۷۵۵

۴۹۔ سلسلہ طیبہ نقشبندیہ مجددیہ، حضرت مولانا محمد شفیع سرگودھوی، خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ مجددیہ کنڈیاں شریف، ۱۳۲۵ھ

۵۰۔ گل دیدہ دور، پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، بزمِ علم و فن سرگودھا، ۲۰۰۵ء، ص ۳۳

۵۱۔ سلسلہ طیبہ نقشبندیہ مجددیہ، ایضاً

- ۵۲۔ نعت گویان سرگودھا، شا کرکنڈان، ادارہ فروغ ادب پاکستان، سرگودھا، ۲۰۰۶ء ص ۱۰۳
- ۵۳۔ تاریخ بھیرہ، ایضاً ص ۳۵۹
- ۵۴۔ وفیات ناموران پاکستان، ایضاً ص ۶۳۱
- ۵۵۔ غزلیات اردو در باعیات، حافظ فضل کریم گوندل، بھیرہ ضلع سرگودھا، ۱۹۷۰
- ۵۶۔ مکتوب، مقصود وارثی (چک نمبر ۲۴ جنوبی) بنام: اخلاق عاطف (سرگودھا) ۱۹۸۳ء
- ۵۷۔ جانِ رحمت، ایضاً ص ۱۶۶
- ۵۸۔ ماہنامہ کامران، سرگودھا، اگست ۱۹۵۵ء ص ۱۱
- ۵۹۔ گجرات دے پنجابی شاعر، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلج، غیر مطبوعہ
- ۶۰۔ ماہنامہ کامران، سرگودھا، اگست ۱۹۵۵ء ص ۱۱
- ۶۱۔ روزنامہ امروز، لاہور یکم جون ۱۹۷۱ء
- ۶۲۔ ماہنامہ بیسوی صدی، دہلی، اگست ۱۹۶۵ء
- ۶۳۔ ماہنامہ کامران، سرگودھا، جلد ۱۲، شماره ۲
- ۶۴۔ تذکار بگویہ، ایضاً ص ۳۳۳
- ۶۵۔ تذکرہ، صاحبزادہ ابرار احمد بگوی المعات احمد بگوی، مرکزی مجلس حزب الانصار پاکستان، بھیرہ، ۱۳۲۳ھ ص ۱۸
- ۶۶۔ تقویم تاریخی، ایضاً ص ۳۲۰
- ۶۷۔ تذکار بگویہ، ایضاً ص ۳۲۳
- ۶۸۔ سخوران سرگودھا، ایضاً ص ۱۵۴
- ۶۹۔ گلہائے عقیدت، ایم احمد بخش ریاض، سرگودھا، ۱۹۶۸ء ص ۶
- ۷۰۔ ایضاً ص ۵۱، ۲۷، ۹
- ۷۱۔ جنھیں ہم بھول بیٹھے ہیں، پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، بزمِ علم و فن کوٹ فرید، سرگودھا، ۲۰۰۳ء ص ۱۰۲
- ۷۲۔ ماہی کامران، سرگودھا، جلد ۱۲، شماره ۱
- ۷۳۔ بشکر یہ اخلاق عاطف
- ۷۴۔ سخوران سرگودھا، ایضاً ص ۳۰۲
- ۷۵۔ ایضاً
- ۷۶۔ جانِ رحمت، ایضاً ص ۷۹
- ۷۷۔ ماہنامہ نعت، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۹۶ء ص ۳۷۵
- ۷۸۔ سخوران سرگودھا، ایضاً ص ۳۰۲

- ۷۹۔ گجرات کے اردو نعت گو شعراء، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلج، ماہنامہ نعت، لاہور، فروری ۱۹۹۸ء
- ۸۰۔ لوح مزار، بڑا قبرستان، سرگودھا
- ۸۱۔ مقام شوق، راجا محمد یعقوب الحفیظ، شوق پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۹۱ء
- ۸۲۔ نوائے شوق، پروفیسر ہارون الرشید تبسم، شوق پبلی کیشنز، سرگودھا، ۲۰۰۳ء
- ۸۳۔ مقام شوق، ایضاً ۱۵ مئی ۲۰۰۶ء
- ۸۴۔ ملاقات محمد صفدر خان (عبدالغنی ناز کے ہم کار) سرگودھا، ۲۳ فروری ۲۰۰۶ء
- ۸۵۔ وادی سون سیکسر، ایضاً ص ۱۶۷
- ۸۶۔ صدیق اکبر، عبدالغنی ناز، خورشید بک ڈپو پبل ضلع سرگودھا، ۱۹۶۲ء ص ۴
- ۸۷۔ ملاقات محمد صفدر خان، ایضاً
- ۸۸۔ ایضاً
- ۸۹۔ ملاقات عبدالرشید نائی (پیل میں عبدالغنی ناز کا پڑوسی) سرگودھا، ۵ جنوری ۲۰۰۴ء
- ۹۰۔ صدیق اکبر، ایضاً ص ۱۷
- ۹۱۔ ہفت روزہ ہلال، راولپنڈی، ۱۷ اگست ۱۹۷۹ء
- ۹۲۔ ملاقات بھائی ظفر، ساہیوال ضلع سرگودھا، ۲۹ جولائی ۲۰۱۲ء
- ۹۳۔ ملاقات محمد اشفاق ونی، ساہیوال ضلع سرگودھا، ۲۹ جولائی ۲۰۱۲ء
- ۹۴۔ جانِ رحمت، ایضاً ص ۱۴۷
- ۹۵۔ توار دکاشک ہے
- ۹۶۔ بشکریہ بھائی ظفر (ساہیوال) ادیب
- ۹۷۔ ملاقات پروفیسر عبدالقیوم رانا ولد فراق کنگروی، سرگودھا، ۵ جولائی ۲۰۰۸ء
- ۹۸۔ ایضاً
- ۹۹۔ فراق کنگروی کی ذاتی ڈائری سے نقل
- ۱۰۰۔ تفکرات فراق، فراق کنگروی، ترتیب و انتخاب: قیوم رانا، نقش گر راولپنڈی، س ن ص ۶۳
- ۱۰۱۔ ملاقات سید صوفی نقوی، بھلوال، ۱۳ جنوری ۲۰۰۲ء
- ۱۰۲۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۳۲۲
- ۱۰۳۔ اشہاک، سید اقبال محمد صوفی نقوی، اکاظم پبلی کیشنز، بھلوال، س ن ص ۱۳
- ۱۰۴۔ سید اقبال محمد صوفی نقوی کی شخصیت اور شاعری، محمد خان، مقالہ برائے ایم اے، گورنمنٹ کالج سرگودھا، ۱۹۹۹ء
- ۱۰۵۔ ملاقات سید محمد حسین رضا نقوی، بھلوال، ۱۷ نومبر ۲۰۰۲ء

- ۱۰۶۔ انہماک، ایضاً ص ۸۷
- ۱۰۷۔ ایضاً ص ۱۷۲، ۱۷۳
- ۱۰۸۔ بہر زماں بہر زباں صلی اللہ علیہ وسلم، نور احمد میرٹھی، ادارہ فکر نو کورنگی کراچی، ۱۹۹۶ء ص ۲۳۶
- ۱۰۹۔ ماہنامہ فلمی ستارے، دہلی، دسمبر ۱۹۸۶ء
- ۱۱۰۔ بساط، مرتب: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، مکتبہ کوہسار بہرہ پور، بھاگلپور، انڈیا، ۱۹۸۹ء
- ۱۱۱۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۱۳۵
- ۱۱۲۔ پندرہ روزہ ترجمان، سرگودھا، ۱۵ تا ۱۹ مئی ۱۹۹۱ء
- ۱۱۳۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۱۳۵
- ۱۱۴۔ ایضاً ص ۱۳۶
- ۱۱۵۔ ایضاً ص ۱۳۷
- ۱۱۶۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۱۱۹
- ۱۱۷۔ ملاقات، افضل عباس شیرازی ولد سید وزیر شیرازی، سرگودھا، ۱۷ اگست ۱۹۸۵ء
- ۱۱۸۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۲۸۳
- ۱۱۹۔ اب انہیں ڈھونڈ جاؤ، رخ زیبائے کر، پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، بزم علم و فن کوٹ فرید، سرگودھا، ۲۰۰۳ء ص ۱۹۱
- ۱۲۰۔ خیابان نجات، سید وزیر حسین شیرازی، مکتبہ تمکین بلاک نمبر ۱۹ سرگودھا، ۱۹۷۷ء ص ۵۶
- ۱۲۱۔ نقوش سرگودھا، عابد خورشید / ذوالفقار احسن، سرگودھا رائٹرز کلب سرگودھا، ۲۰۰۲ء ص ۶۹
- ۱۲۲۔ اردو ادب اور عساکر پاکستان، جلد اول، حصہ اول، شاہ کونڈان، ادارہ فروغ ادب پاکستان، کنڈان، ۱۹۹۷ء ص ۲۷۲
- ۱۲۳۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۲۹۵
- ۱۲۴۔ ایضاً ص ۲۹۶
- ۱۲۵۔ مکتوب حافظ محمد رمضان ولد حاجی سلطان احمد سالک (نور پور تھل) بنام راقم (سرگودھا) ۱۳ فروری ۲۰۰۶ء
- ۱۲۶۔ ایضاً
- ۱۲۷۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۱۲۵
- ۱۲۸۔ مزارات اولیائے کرام، میاں عطا محمد نعیمی، مشمولہ: روزنامہ عوامی رائے، سرگودھا، ۲۲ جنوری ۲۰۰۶ء
- ۱۲۹۔ ملاقات نصرت چوہدری، سرگودھا، ۱۵ جنوری ۲۰۰۶ء
- ۱۳۰۔ ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، حضرت مولانا عبد المجید سوہدروی، مسلم پبلی کیشنز اردو بازار لاہور، ص ۴۲
- ۱۳۱۔ ایضاً

۱۳۲۔ غیر مسلموں کی نعت گوئی، راجا رشید محمود، (خصوصی اشاعت) ماہنامہ نعت، لاہور، نومبر ۱۹۹۵ء ص ۷۸
ایضاً

۱۳۳۔ نور سخن، نور احمد میرٹھی، ادارہ فکر نو کورنگی کراچی، ۱۹۸۸ء ص ۶۱

۱۳۵۔ ایضاً ص ۶۲

۱۳۶۔ بہر زماں بہر زباں صلی اللہ علیہ وسلم، ایضاً ص ۱۹۰

۱۳۷۔ ایضاً ص ۱۹۱

۱۳۸۔ خیر البشر کے حضور، ممتاز حسن، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۷۵ء ص ۱۰۷

۱۳۹۔ ایضاً

۱۴۰۔ Biographical Encyclopedia of Pakistan, Tahawar Ali Khan,
Biographical Research Institute, Pakistan, Edition 1987-88

۱۴۱۔ دیدہ خوش آب، بدر منیر، خزنہ علم و ادب، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۵۳

۱۴۲۔ جوہر، گورنمنٹ کالج جوہر آباد کا مجلہ، ۲۰۰۰ء تا ۲۰۰۳ء ص ۵۳

۱۴۳۔ دیدہ خوش آب، ایضاً ص ۵۵

۱۴۴۔ ملاقات خالد یوسفی ابن یوسف آزاد، سرگودھا، ۱۳ مارچ ۲۰۰۶ء

۱۴۵۔ حافظ یوسف آزاد کی قلمی بیاض

۱۴۶۔ ایضاً

۱۴۷۔ جذباتِ دل، میاں فضل الرحمان بسمل، انجینئر محمود مجیب اصغر، ۲۰۰۲ء

۱۴۸۔ ایضاً

۱۴۹۔ اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ، محسن عباس، مقالہ برائے ایم فل، ۲۰۰۷ء علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ص ۷۵

۱۵۰۔ نعت گو یان سرگودھا، ایضاً ص ۱۴۳

۱۵۱۔ اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ، ایضاً ص ۸۶

۱۵۲۔ ماہنامہ الرشید، لاہور، اپریل ۱۹۹۷ء

۱۵۳۔ لوح محفوظ، جوہر نظامی، مکتبہ تخلیق میلکین روڈ لاہور، ۱۹۷۸ء

۱۵۴۔ وہم رسا، جوہر نظامی، نیرنگ خیال پبلی کیشنز لیاقت روڈ راولپنڈی، ۱۹۸۸ء

۱۵۵۔ تنقیدی اشکال، غلام نبی اعوان، اسامہ ٹریڈرز مسجد روڈ کوئٹہ، ۱۹۹۳ء ص ۶۶

۱۵۶۔ لوح محفوظ، ایضاً

۱۵۷۔ وہم رسا، ایضاً ص ۵۳

- ۱۵۸۔ تذکار بگویہ، ایضاً ص ۹۰۷
- ۱۵۹۔ ماہنامہ نعت لاہور، اکتوبر ۱۹۹۳ء
- ۱۶۰۔ لوح مزار غلام نبی میر ناسک، بڑا قبرستان، سرگودھا
- ۱۶۱۔ خیابان بدر، بدرالدین بدر، سرگودھا، ۱۹۸۵ء ص ۴
- ۱۶۲۔ اب نہیں ڈھونڈ چہ راغ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۲۰۸
- ۱۶۳۔ جمال بدر، بدرالدین بدر، سرگودھا، ۱۹۷۸ء ص ۶
- ۱۶۳۔ ایضاً ص ۷
- ۱۶۵۔ اب نہیں ڈھونڈ چہ راغ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۲۰۹
- ۱۶۶۔ جمال بدر ایضاً ص ۱۰
- ۱۶۷۔ ایضاً ص ۳۹
- ۱۶۸۔ ایضاً ص ۴۰
- ۱۶۹۔ ضلع خوشاب تاریخ، ثقافت، ادب، امتیاز حسین امتیاز، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور، ۱۹۹۹ء ص ۲۹۳
- ۱۷۰۔ ادبی سیریز صدائے سخن، خوشاب، فروری ۱۹۹۰ء
- ۱۷۱۔ ملاقات کمپین محمد یونس آف ہڈالی، راولپنڈی، ۱۵ نومبر ۲۰۰۰ء
- ۱۷۲۔ اردو ادب اور عساکر پاکستان، ایضاً ص ۲۷۸
- ۱۷۳۔ ملاقات کمپین محمد یونس آف ہڈالی، راولپنڈی، ۲۳ نومبر ۲۰۰۰ء
- ۱۷۴۔ دیوان خادم، کپتان ملک خادم حسین خان، دارالتجلید اردو بازار لاہور، ایڈیشن دوم، ۱۹۸۶ء
- ۱۷۵۔ دیوان خادم، جمعدار ملک خادم حسین خان، لکھنؤ، باراول، ۱۹۳۳ء
- ۱۷۶۔ دیوان قیصر، ڈاکٹر محمد شریف قیصر، تازیانہ پبلی کیشنز گجرات، سن
- ۱۷۷۔ قلمی ڈائری مرزا مامول انور، بوساطت، سلیم حسن مرزا ابن مرزا مامول انور، ۵ فروری ۲۰۰۸ء
- ۱۷۸۔ نقوش سرگودھا، ایضاً ص ۶۳
- ۱۷۹۔ داستان سرگودھا، افضل حسن انصاری، پندرہ روزہ اکبر حافظ آباد، ۲۰۰۷ء ص ۲۲۵
- ۱۸۰۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۲۵۸
- ۱۸۱۔ اب نہیں ڈھونڈ چہ راغ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۱۰۱
- ۱۸۲۔ ہفت روزہ مقالہ، سرگودھا، ۲۹ اگست ۱۹۳۲ء ص ۱
- ۱۸۳۔ اشتہار مشاعرہ، عبدالغفور جوہر (نظامی) سیکرٹری بزم ادب سرگودھا، ۲۰ دسمبر ۱۹۳۶ء
- ۱۸۴۔ داستان سرگودھا، ایضاً ص ۵۲۲

- ۱۸۵۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر، ایضاً ص ۱۰۴
- ۱۸۶۔ قانونِ مکافات، مرزا مامول انور، ندیم اکیڈمی سوسائٹی، سرگودھا، ۱۹۹۰ء ص ۱
- ۱۸۷۔ ذاتی ڈائری مرزا مامول انور، ایضاً
- ۱۸۸۔ باب جبریل، غلام فخر الدین سیالوی، رہبر پرنٹرز ایبٹ روڈ لاہور، سن ۹
- ۱۸۹۔ فخر نامہ، اصغر علی نظامی، مشمولہ: ماہنامہ لہراں، لاہور، جون ۱۹۹۹ء
- ۱۹۰۔ باب جبریل، ایضاً ص ۱۳
- ۱۹۱۔ داستانِ سرگودھا، ایضاً ص ۲۸۳
- ۱۹۲۔ نعت گویانِ سرگودھا، ایضاً ص ۱۵۵
- ۱۹۳۔ باب جبریل، ایضاً ص ۳۹
- ۱۹۴۔ مایہ حیات بو ظفر نور محمد، حکیم حاجی نور محمد، شاہ پور شہرہ ۱۹۶۷ء ص ۳
- ۱۹۵۔ ایضاً
- ۱۹۶۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۳۰۷
- ۱۹۷۔ گجرات میں اردو شاعری، پروفیسر کلیم احسان بٹ، ناوک پبلی کیشنز جلالپور جٹاں (گجرات) ۱۹۹۶ء
- ۱۹۸۔ سخنورانِ جہلم، قاضی غلام کبریا راصل، جہلم، ۱۹۶۲ء
- ۱۹۹۔ ایضاً
- ۲۰۰۔ انتخاب، حلقہ اربابِ ذوقِ گجرات، طاہر پبلی کیشنز گجرات، ۱۹۷۳ء
- ۲۰۱۔ نعت گویانِ سرگودھا، ایضاً ص ۱۵۷
- ۲۰۲۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۲۰۳
- ۲۰۳۔ نقوشِ سرگودھا، ایضاً ص ۴۴
- ۲۰۴۔ عبدالرشید اشک کی یاد میں، انور سدید، مشمولہ: ماہنامہ اوراق لاہور، مارچ اپریل ۱۹۸۶ء ص ۷۳
- ۲۰۵۔ قلمی ڈائری میر عبدالرشید اشک، ملکیت: ارشد محمود (بیٹا) ۱۱ نومبر ۲۰۰۶ء
- ۲۰۶۔ ایضاً
- ۲۰۷۔ ملاقات: محمد نعیم پسر غلام سرور نعیمی، سرگودھا، ۷ جولائی ۲۰۰۸ء
- ۲۰۸۔ احادیثِ اربعین فی شانِ رئیسِ الغریبین، غلام سرور نعیمی، سرگودھا ۱۴۰۸ھ ص ۷
- ۲۰۹۔ ایضاً ص ۱۷
- ۲۱۰۔ ایضاً ص ۲۸
- ۲۱۱۔ ایضاً ص ۶۷

۲۱۲۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۲۹۸

۲۱۳۔ تاریخ بھیرہ، ایضاً ص ۳۶۱

۲۱۴۔ ملاقات فیاض احمد خان (سلیم بھٹی کا بھانجا) بھیرہ، ۲۲ اگست ۲۰۱۲ء

۲۱۵۔ تذکار بگوییہ، جلد دوم ڈاکٹر صاحبزادہ انوار احمد بگویی، مجلس مرکزیہ حزب الانصار پاکستان، بھیرہ، ۲۰۰۹ء ص ۸۷۳

۲۱۶۔ سہ ماہی نلہ دل، بھیرہ، اپریل ۲۰۱۰ء ص ۷۵ ستمبر ۲۰۱۰ء ص ۴۹

۲۱۷۔ وفيات مشاہیر پاکستان، پروفیسر محمد اسلم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۰ء ص ۳۰

۲۱۸۔ داغ بیل، الطاف مشہدی، عوامی کتب خانہ سرگودھا، ۱۹۵۰ء ص ۹

۲۱۹۔ شاخ گل، الطاف مشہدی، ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل لاہور، ۱۹۵۳ء

۲۲۰۔ گلہائے رنگ رنگ (انتخاب) جلد دوم، محمد شمس الحق، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء ص ۶۳۰

۲۲۱۔ ہمارے اہل قلم، زاہد حسین انجم، ملک بک ڈپو اردو بازار لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۱۰۲

۲۲۲۔ اب انہیں ڈھونڈ چہراغ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۲۹

۲۲۳۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۸۶

۲۲۴۔ شعرستان (تذکرہ شعرائے پاکستان) نعمان تاثیر و مظہر صدیقی، مکتبہ پرچم حسن آنندی روڈ، کراچی، ۱۹۵۲ء

۲۲۵۔ ایضاً

۲۲۶۔ شاخ گل، ایضاً، فلیپ

۲۲۷۔ ایضاً

۲۲۸۔ ماہنامہ اردو زبان، سرگودھا، مئی جون ۱۹۸۴ء ص ۲۷

۲۲۹۔ گیت الطاف مشہدی، حکیم محمد یوسف حسن، مشمولہ: ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور، دسمبر ۱۹۶۰ء ص ۵

۲۳۰۔ ماہی کی بیعت کا قضیہ، شا کر کنڈان، مشمولہ: سہ ماہی دریچہ انٹرنیشنل پاکستان، پٹین، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵ء ص ۷

۲۳۱۔ وفيات ناموران پاکستان، ایضاً ص ۱۵۸

۲۳۲۔ تذکرہ ماہ و سال، مالک رام، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۹۱ء ص ۶۱

۲۳۳۔ گل گفتار، کرم حیدری، مکتبہ محمود، سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی، ۱۹۹۹ء ص ۷۵

۲۳۴۔ داغ بیل، ایضاً ص ۱۱، ۱۰

۲۳۵۔ لذت رنگ و بو، الطاف مشہدی، عوامی کتب خانہ، سرگودھا، ۱۹۷۷ء ص ۴۶

۲۳۶۔ تاریخ بھیرہ، ایضاً ص ۳۳۶

۲۳۷۔ چھیمائی لیکھ، لاہور، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء ص ۵۸

۲۳۸۔ شخصیات سرحد، محمد شفیع صابر، یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور، ۱۹۸۹ء ص ۹۳۶

۲۳۹۔ تاریخ بھیرہ، ایضاً

۲۴۰۔ ہم قلم، تاج سعید، مکتبہ ارژنگ ظہیر آباد پشاور، ۱۹۷۷ء ص ۱۵۹، ۱۶۰

۲۴۱۔ ماہنامہ ادب لطیف، لاہور، فروری ۱۹۵۶ء

۲۴۲۔ نیا پرائیڈ، ادارہ علم و فن پاکستان، دارالاشاعت ادارہ علم و فن پاکستان، پشاور، ۱۹۷۹ء

۲۴۳۔ بے باک حریت پسند شاعر اختر سردی، راجہ محمد یعقوب حفیظ، مشمولہ: ماہنامہ ماہ نو، لاہور، اپریل ۱۹۹۷ء ص ۷۲

۲۴۴۔ کوہاٹ کاؤچی ارتقاء، احمد پراچہ، مکتبہ مستجاب پراچہ محلہ پراچگان کوہاٹ، ۱۹۸۴ء ص ۱۱۳

۲۴۵۔ شخصیات سرحد، ایضاً ص ۱۰۲

۲۴۶۔ نیا پرائیڈ، ایضاً ص ۱۷

۲۴۷۔ لالہ اردو، مولانا اختر سردی، ہارون الرشید تبسم، دیدہ ورا کادمی کوٹ فرید سرگودھا، ۱۹۹۱ء

۲۴۸۔ نیا پرائیڈ، ایضاً

۲۴۹۔ ایضاً

۲۵۰۔ ملک شاہ سوار علی ناصر ارڑہ۔ خوشاب، بنام راقم، سرگودھا، ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۲۵۱۔ داستان حسرت، شیر محمد اسیر، کند ضلع خوشاب، ۱۹۹۷ء ص ۵

۲۵۲۔ ایضاً ص ۴

۲۵۳۔ مکتوب ملک شاہ سوار علی ناصر، ایضاً

۲۵۴۔ داستان حسرت، ایضاً ص ۴

۲۵۵۔ ایضاً ص ۴۲

۲۵۶۔ دیوان عیش، عیش بخاری، کلیارر ناؤن سرگودھا، ص ۲

۲۵۷۔ ایضاً ص ۳

۲۵۸۔ ایضاً ص ۱۶

۲۵۹۔ مجموعہ رباعیات، عیش بخاری، لاہور، ص ۱۱

۲۶۰۔ کیسریا، احمد ندیم قاسمی، شفیق پہلی کیشنز چوک گڑھی شاہولا ہور، ۱۹۹۹ء، فلیپ

۲۶۱۔ احمد ندیم قاسمی، شریف کنجاہی، مشمولہ ہفت روزہ کامرانیاں، کنجاہ (گجرات) ۱۱ تا ۲۰ فروری ۲۰۰۶ء

۲۶۲۔ میری بہترین نظم (خود شعراء کی منتخب نظموں کا مجموعہ)، مرتبہ: محمد حسن عسکری، کتابستان، الہ آباد (ہندوستان) ۱۹۴۲ء

۲۶۳۔ دشت وفا، احمد ندیم قاسمی، التحریر اردو بازار لاہور، بار چہارم ۱۹۸۱ء

۲۶۴۔ احمد ندیم قاسمی عالمی سیمینار و مشاعرہ، اظہار حیدر، پاک ادب سوسائٹی ایڈیشن، ۱۹۸۸ء

۲۶۵۔ مکتوب مضطر دھریموی، دھریمہ، بنام اخلاق عاطف، سرگودھا، ۱۷ جون ۱۹۸۳ء

- ۲۶۶۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۲۶۰
- ۲۶۷۔ اب انہیں ڈھونڈ چہرا رخ زیبائے لے کر، ایضاً ص ۱۳۱
- ۲۶۸۔ جانِ رحمت، ایضاً ص ۱۶۰
- ۲۶۹۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۲۶۲
- ۲۷۰۔ اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ، ایضاً ص ۱۷۱
- ۲۷۱۔ دیدۂ خوش آب، ایضاً ص ۱۰۵
- ۲۷۲۔ اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ، ایضاً
- ۲۷۳۔ دیدۂ خوش آب، ایضاً
- ۲۷۴۔ اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ، ایضاً ص ۳۵
- ۲۷۵۔ دیدۂ خوش آب، ایضاً ص ۱۰۵
- ۲۷۶۔ ایضاً ص ۱۰۶
- ۲۷۷۔ علوی اعوان قبیلہ مختصر تعارف، علامہ محمد یوسف جبریل، ادارہ تحقیق الاعوان پنجاب، واہ کینٹ، ۲۰۰۰ء ص ۱۵۴
- ۲۷۸۔ ایضاً ص ۱۵۵
- ۲۷۹۔ علامہ محمد یوسف جبریل حیات و خدمات، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ضیائے ادب اردو بازار لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۱۳۲
- ۲۸۰۔ ایک درویش دانشور، علامہ یوسف جبریل، شاگردان، مشمولہ: سہ ماہی دریچہ انٹرنیشنل پاکستان، پشین، جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء ص ۲۵
- ۲۸۱۔ خواب جبریل، علامہ محمد یوسف جبریل، ادارہ افکار جبریل واہ کینٹ، سن ۶۵
- ۲۸۲۔ سوز جبریل، علامہ محمد یوسف جبریل، ادارہ افکار جبریل واہ کینٹ، ۲۰۰۷ء ص ۳۲
- ۲۸۳۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۱۷۵
- ۲۸۴۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۱۸۰
- ۲۸۵۔ جانِ رحمت، ایضاً ص ۱۳۰
- ۲۸۶۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۱۸۱
- ۲۸۷۔ غلام جیلانی اصغر کی اردو نثر نگاری، سلمیٰ چوہدری، مقالہ: برائے ایم اے اردو، گورنمنٹ کالج سرگودھا، ۲۰۰۱ء
- ۲۸۸۔ خوش کلام۔ غلام جیلانی اصغر، پرویز بزمی، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء ص ۳۶
- ۲۸۹۔ یعنی وہ ہمیشہ خوش گماں نہ رہا، شاگردان، مشمولہ: سہ ماہی اسالیب، سرگودھا، مئی تا جولائی ۲۰۰۷ء ص ۷
- ۲۹۰۔ میں اور میں، غلام جیلانی اصغر، آئینہ ادب چوک اتارکلی، لاہور ۱۹۸۳ء ص ۵۴
- ۲۹۱۔ ایک ذرا شام سے پہلے، غلام جیلانی اصغر، راجیل ایسوسی ایٹ کلب روڈ سرگودھا، ۲۰۰۲ء ص ۶۸
- ۲۹۲۔ ملاقات صوفی فقیر محمد، سرگودھا، یکم نومبر ۲۰۰۳ء

۲۹۳۔ آدابِ نعت، صوفی فقیر محمد ادارہ گلستانِ اسلام، سرگودھا، ۲۰۰۳ء، ص ۶۳

۲۹۴۔ ایضاً

۲۹۵۔ صوفی فقیر محمد۔ اپنی طرز کا انوکھا شاعر، شا کر کنڈان، مشمولہ: سہ ماہی اسالیب، سرگودھا، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۳۸

۲۹۶۔ آدابِ نعت، ایضاً ص ۷۹

۲۹۷۔ یارانِ نو، انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن لاہور، دسمبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۲۵

۲۹۸۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۲۰۶

۲۹۹۔ ایضاً ص ۲۰۷

۳۰۰۔ ایضاً ص ۲۰۸

۳۰۱۔ نعت گو یانِ سرگودھا، ایضاً ص ۲۶۸

۳۰۲۔ ماہنامہ دنیائے ادب کراچی، ستمبر ۲۰۰۲ء

۳۰۳۔ پندرہ روزہ گلِ حنا، سرگودھا، یکم تا ۱۶ جنوری ۲۰۰۲ء

۳۰۴۔ مکتوب شبلی پانی پتی، سرگودھا، بنام راقم، چھوڑ (سندھ) ۳ جون ۱۹۹۸ء

۳۰۵۔ نعت گو یانِ سرگودھا، ایضاً ص ۲۶۹

۳۰۶۔ ملاقات شبلی پانی پتی، سرگودھا، ۱۱ جنوری ۲۰۰۶ء

۳۰۷۔ مکتوب خلیل بدایونی، بنام راقم، سرگودھا، ۱۲ فروری ۲۰۰۶ء

۳۰۸۔ ایک گمنام شاعر اور شخص۔ خلیل بدایونی، شا کر کنڈان، مشمولہ: سہ ماہی "سفیر اردو" لیوٹن برطانیہ، ستمبر ۲۰۰۶ء

۳۰۹۔ News Letter, University Sargodha, June 2009, P-8

۳۱۰۔ بوستانِ خلیل، خلیل بدایونی، سرگودھا، ۲۰۰۳ء، ص ۲۹

۳۱۱۔ ایضاً ص ۳۱

۳۱۲۔ اب انہیں ڈھونڈ چرائی رخ زیبائے کر، ایضاً ص ۲۱۳

۳۱۳۔ ایضاً ص ۲۱۵

۳۱۴۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۸۱

۳۱۵۔ ایضاً ص ۸۳

۳۱۶۔ اردو ادب میں خوشاب کا حصہ، ایضاً ص ۱۱۰

۳۱۷۔ دیدہ خوش آب، ایضاً ص ۶۵

۳۱۸۔ علوی اعوان قبیلہ۔ مختصر تعارف، ایضاً ص ۱۳۶

۳۱۹۔ کربِ دوراں، دوست محمد محبت، ادارہ تصانیفِ جبریل نواب آباد واہ چھاؤنی، ۱۹۹۰ء، ص ۶۹

- ۳۲۰۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۱۵۹
- ۳۲۱۔ ملاقات اخلاق عاطف، سرگودھا، ۱۴ مارچ ۲۰۰۸ء
- ۳۲۲۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۶۶
- ۳۲۳۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۱۵۹
- ۳۲۴۔ ایضاً ص ۱۶۰
- ۳۲۵۔ نذیر احمد چودھری کے ہاتھوں کی تحریر راقم کے پاس موجود ہے۔
- ۳۲۶۔ ہمارے اہل قلم، ایضاً ص ۴۷۹
- ۳۲۷۔ ماہنامہ لہراں لاہور، جون جولائی ۱۹۹۰ء ص ۱۶
- ۳۲۸۔ جھیمپاہی کھوج، لاہور، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۶ء ص ۳۱
- ۳۲۹۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۴۳۰
- ۳۳۰۔ ملاقات عزیز احمد و رانج، چک نمبر ۹۵ جنوری، یکم مارچ ۲۰۰۴ء
- ۳۳۱۔ جھیمپاہی کھوج، لاہور، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۶ء ص ۳۴
- ۳۳۲۔ محاکے، ڈاکٹر خیال امر و ہوی، ماہنامہ سپونٹک لاہور، فروری ۱۹۹۶ء ص ۱۳۳
- ۳۳۳۔ نقوش سرگودھا، ایضاً ص ۱۳۳
- ۳۳۴۔ گل دیدہ، ایضاً ص ۱۵۰
- ۳۳۵۔ نقوش سرگودھا، ایضاً ص ۱۳۵
- ۳۳۶۔ ایضاً ص ۱۳۸
- ۳۳۷۔ ملاقات، سید واحد حسین نشان، سرگودھا، ۱۲۸ اپریل ۱۹۹۸ء
- ۳۳۸۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۱۸۹
- ۳۳۹۔ درود دل، سید واحد حسین نشان، غیر مطبوعہ
- ۳۴۰۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۱۹۴
- ۳۴۱۔ پاکستانی اہل قلم کی ڈائریکٹری، نگہت سلیم، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء ص ۵۸
- ۳۴۲۔ ہمد غزل، بزم فکر و ادب، ہنگامی، ۱۹۵۹ء ص ۳۲
- ۳۴۳۔ ہمارے اہل قلم، ایضاً ص ۱۲۶
- ۳۴۴۔ مکتوب، قمر حجازی، اوکاڑا، بنام راقم، سرگودھا، ۲۳ اگست ۲۰۰۷ء
- ۳۴۵۔ بات تری ورق ورق، بشیر احمد بشیر، عمیر پبلشرز، اردو بازار لاہور، بار دوم، ۱۹۹۶ء ص ۴
- ۳۴۶۔ مکتوب قمر حجازی، ایضاً

- ۳۴۷۔ بات تری ورق ورق، ایضاً ص ۸۷
- ۳۴۸۔ ایضاً ص ۱۲۶
- ۳۴۹۔ چبک انھی لفظوں کی چھاگل، مصور سبزواری، مشمولہ: ماہنامہ کاغذی پیرہن، لاہور، مئی جون ۲۰۰۵ء، ص ۳۷
- ۳۵۰۔ دیکھو دھنک پھیل گئی، وزیر آغا، کاغذی پیرہن لاہور، ۲۰۰۳ء
- ۳۵۱۔ چبک انھی لفظوں کی چھاگل، وزیر آغا، کتب نما میکلوڈ روڈ، لاہور ۱۹۹۸ء
- ۳۵۲۔ نوائے انور، پروفیسر ہارون الرشید تبسم، بزمِ علم و فن پاکستان، سرگودھا، ۱۹۹۹ء ص ۱۳
- ۳۵۳۔ ایضاً ص ۱۸۶
- ۳۵۴۔ ملاقات عزیز انبالوی، سرگودھا، ۱۴ مارچ ۲۰۰۳ء
- ۳۵۵۔ ماہنامہ اردو زبان، سرگودھا، مئی جون ۱۹۸۸ء ص ۲۵
- ۳۵۶۔ ذاتی بیاض، عزیز انبالوی، ۱۴ مارچ ۲۰۰۳ء
- ۳۵۷۔ تاریخ بھیرہ، ایضاً ص ۳۴۸
- ۳۵۸۔ ہمارے اہل قلم، ایضاً ص ۳۶۱
- ۳۵۹۔ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۸ فروری ۲۰۰۰ء
- ۳۶۰۔ وفيات نامورانِ پاکستان، ایضاً ص ۷۹۰
- ۳۶۱۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۲۵۵
- ۳۶۲۔ نعت گویانِ سرگودھا، ایضاً ص ۲۰۵
- ۳۶۳۔ ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۰ء
- ۳۶۴۔ مکتوب پروفیسر محمد منور، لاہور، بنام اخلاق عاطف، سرگودھا، ۱۶ ستمبر ۱۹۸۳ء
- ۳۶۵۔ حرف ملاقات، عمران نقوی، علم و عرفان پبلشرز، مال روڈ، لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۶۳
- ۳۶۶۔ مرزا محمد منور ایک بالغہ، ڈاکٹر محمد صدیق شبلی، مشمولہ: روزنامہ نوائے وقت، اسلام آباد، ۳۰ مئی ۲۰۰۰ء
- ۳۶۷۔ ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۰ء
- ۳۶۸۔ ماہنامہ سیارہ لاہور، مارچ اپریل ۲۰۰۲ء
- ۳۶۹۔ وفيات نامورانِ پاکستان، ایضاً ص ۷۹۰
- ۳۷۰۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۶ء
- ۳۷۱۔ سہ ماہی کامران، سرگودھا، جنوری تا مارچ ۱۹۶۱ء
- ۳۷۲۔ نعت گویانِ سرگودھا، ایضاً ص ۱۹۹
- ۳۷۳۔ مکتوب سید محمد حسن واسطی بنام راقم، سرگودھا، ۱۸ مارچ ۲۰۰۶ء

- ۳۷۴۔ ملاقات سید محمد حسن واسطی، سرگودھا، ۲۹ جنوری ۲۰۰۷ء
- ۳۷۵۔ ماہنامہ عارفین، سرگودھا، ستمبر ۱۹۹۲ء
- ۳۷۶۔ تفسیر تبیین القرآن حصہ اول، شیخ الحدیث والتفسیر حضرت علامہ سید محمد حسین نیلوی، ادارہ گلستان اسلام، سرگودھا، ۱۹۹۷ء ص ۳۹۵
- ۳۷۷۔ مہکتی ڈال، خیرالدین انصاری، انصاری پبلی کیشنز، جھنگ، ۲۰۰۰ء ص ۸۱
- ۳۷۸۔ آواز، رفعت سلطان، باہو پبلشرز دربار حضرت سلطان العارفین باہو جھنگ، ۱۹۷۴ء
- ۳۷۹۔ آفاق، رفعت سلطان، تخلیق مرکز شاہ عالم مارکیٹ لاہور، ۱۹۸۶ء
- ۳۸۰۔ ساقیا، مسعود ساقیا، راولپنڈی، ۱۹۷۲ء
- ۳۸۱۔ اردو ماہیا، سید مہدی مدنی، سرگودھا ۱۹۷۶ء
- ۳۸۲۔ ملاقات ظفر گل، پسر مہدی مدنی، چک نمبر ۱۱۰ ایم ایل تحصیل بھلووال، ۲۸ جولائی ۲۰۰۳ء
- ۳۸۳۔ ایضاً
- ۳۸۴۔ ملاقات شوکت راز، مہدی مدنی کا دوست، پھلروان، ۱۹ جولائی ۲۰۰۳ء
- ۳۸۵۔ اردو ماہیا، ایضاً
- ۳۸۶۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۲۷۳
- ۳۸۷۔ اب انہیں ڈھونڈ جاؤ چراغ رخ زیبائے کر، ایضاً ص ۲۳۵
- ۳۸۸۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۹۶
- ۳۸۹۔ ایضاً ص ۹۷
- ۳۹۰۔ لوح مزار، بشیر راجن ادیب، بڑا قبرستان سرگودھا، ۱۵ مئی ۲۰۰۶ء
- ۳۹۱۔ ہمارے اہل قلم، ایضاً ص ۲۱۱
- ۳۹۲۔ اب انہیں ڈھونڈ جاؤ چراغ رخ زیبائے کر، ایضاً ص ۱۳۶
- ۳۹۳۔ ہمارے اہل قلم، ایضاً ص ۲۱۱
- ۳۹۴۔ اب انہیں ڈھونڈ جاؤ چراغ رخ زیبائے کر، ایضاً ص ۱۳۷
- ۳۹۵۔ ایضاً ص ۱۳۸
- ۳۹۶۔ ایضاً ص ۱۳۸، بحوالہ رسالہ الجماعۃ، ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء
- ۳۹۷۔ ماہنامہ نقاد، کراچی، ستمبر ۱۹۵۳ء ص ۶۸
- ۳۹۸۔ ماہنامہ سفید چھتری، سرگودھا، نومبر دسمبر ۱۹۹۲ء
- ۳۹۹۔ ماہنامہ قلم قافلہ، کھاریاں، جون ۱۹۸۳ء
- ۴۰۰۔ پیش لفظ، ڈاکٹر وزیر آغا، مشمولہ تنہا چاند، عزیز علوی، ندیم پبلی کیشنز سرگودھا، ۱۹۹۳ء

- ۳۰۱۔ ملاقات ذوالفقار احسن، سرگودھا، یکم فروری ۲۰۰۶ء
- ۳۰۲۔ رشتے درد کے، عزیز علوی، ندیم پہلی کیشنز رحمان پورہ سرگودھا، ۱۹۷۴ء
- ۳۰۳۔ تنہا شانہ، ایضاً
- ۳۰۴۔ اردو ادب اور عسا کر پاکستان، جلد اول، حصہ اول، ایضاً ص ۳۱۶
- ۳۰۵۔ تصویر وطن، صابر ملک، ملک پہلی کیشنز، خوشاب، سن ۵، ص ۵
- ۳۰۶۔ مفت روزہ ہلال، راولپنڈی، ۷ مئی ۱۹۶۷ء
- ۳۰۷۔ دیدہ خوش آب، ایضاً ص ۹۷
- ۳۰۸۔ وفیات ناموران پاکستان، ایضاً ص ۳۱۷
- ۳۰۹۔ تصویر وطن، ایضاً
- ۳۱۰۔ تحریک پاکستان کے کارکن شاعر و ادیب۔ عصمت علیگ، پروفیسر ہارون الرشید قسم، مشمولہ: روزنامہ عوامی رائے، سرگودھا، ۹ فروری ۲۰۰۳ء
- ۳۱۱۔ نقوش سرگودھا، ایضاً ص ۱۱۳
- ۳۱۲۔ علی حسنین شیفتہ کی تحریر راقم کے پاس موجود ہے۔
- ۳۱۳۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۲۲۸
- ۳۱۴۔ ایضاً ص ۲۳۰
- ۳۱۵۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۲۱۸
- ۳۱۶۔ ایضاً ص ۲۴۰
- ۳۱۷۔ تشدد کی داستان، شیخ مجید افضل پراچہ، افضل سنز بلاک نمبر ۱۱ سرگودھا، ۱۹۷۷ء
- ۳۱۸۔ تذکار بگوبہ، جلد دوم، ایضاً ص ۸۷۹
- ۳۱۹۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۲۴۰
- ۳۲۰۔ ایضاً ص ۲۴۱، ۲۴۲
- ۳۲۱۔ The Musing Spring, Muhammad Nazir Shahzada, Iqra Academy
Sargodha, 1999
- ۳۲۲۔ شعریات، محمد نذیر شیرزادہ، اقراء اکیڈمی سرگودھا، ۱۹۹۹ء ص ۳
- ۳۲۳۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۲۱۸
- ۳۲۴۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۱۸۳
- ۳۲۵۔ ایضاً ص ۱۸۴
- ۳۲۶۔ ایضاً ص ۱۸۵

- ۴۲۷۔ واصف علی واصف کا سوانحی خاکہ، ایضاً ص ۵۰
- ۴۲۸۔ ضلع خوشاب، تاریخ ثقافت ادب، ایضاً ص ۲۹۷
- ۴۲۹۔ دیدہ خوش آب، ایضاً ص ۲۹
- ۴۳۰۔ Daily "The Nation" Lahore, Tuesday, January 19, 1993.
- ۴۳۱۔ واصف علی واصف، احوال و آثار، ایضاً ص ۳۷
- ۴۳۲۔ ملاقات: علامہ محمد یوسف جبریل، واہ کینٹ، ۲۷ جولائی ۲۰۰۰ء
- ۴۳۳۔ علامہ محمد یوسف جبریل، حیات و خدمات، ایضاً ص ۱۱۲
- ۴۳۴۔ ایضاً ص ۱۱۳
- ۴۳۵۔ شب چراغ، واصف علی واصف، کاشف پہلی کیشنز: جوہر ٹاؤن لاہور، سن ۱۸
- ۴۳۶۔ ایضاً ص ۱۲۸
- ۴۳۷۔ ملاقات، نصرت چوہدری، سرگودھا، ۷ جون ۲۰۰۲ء
- ۴۳۸۔ دبستان سرگودھا کا روشن ستارہ، نصرت چوہدری، شاہ کونڈان، مشمولہ: سہ ماہی دریچہ انٹرنیشنل پاکستان، پشین، اپریل تا ستمبر ۲۰۰۶ء ص ۳۵
- ۴۳۹۔ زینہ صدا، نصرت چوہدری، ممتاز نصرت سرگودھا، ۷ جون ۱۹۷۷ء ص ۳۳
- ۴۴۰۔ پتے پھیل کے، نصرت چوہدری، مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۰ء ص ۵۶
- ۴۴۱۔ مکتوب نواب علی مخمور، بھکڑوان، بنام اخلاق عاطف، سرگودھا، ۱۶ مئی ۱۹۸۳ء
- ۴۴۲۔ ملاقات، رانا سعید دوشی، بھکڑوان، ۳ جنوری ۲۰۰۸ء
- ۴۴۳۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۱۷۱
- ۴۴۴۔ سخن آثار، نعیم ساگر، صنور یز پہلی کیشنز ملتان، ۲۰۰۲ء ص ۱۲۱
- ۴۴۵۔ ایضاً ص ۱۲۲
- ۴۴۶۔ ساقی الحسینی، شخصیت و فن، جعفر بلوچ، مشمولہ: اشارات از ساقی الحسینی، مرتبہ: جعفر بلوچ، دارالتذکیر اردو بازار لاہور، ۲۰۰۰ء ص ۷
- ۴۴۷۔ ایضاً ص ۸
- ۴۴۸۔ تاثرات، پروفیسر عاصی کرنالی، مشمولہ: اشارات، ایضاً ص ۱۹
- ۴۴۹۔ اشارات، ساقی الحسینی، ایضاً ص ۸۰
- ۴۵۰۔ ایضاً ص ۱۶
- ۴۵۱۔ مشہور شعراء، جلد ششم، محمد ظفر اقبال، ادارہ شاہین پہلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۵ء ص ۲۰

- ۳۵۲۔ شعرستان تذکرہ شعرائے پاکستان، ایضاً ص ۵۷
- ۳۵۳۔ وفيات نامورانِ پاکستان، ایضاً ص ۱۵۵
- ۳۵۴۔ شعرستان، ایضاً
- ۳۵۵۔ ایضاً
- ۳۵۶۔ وفيات نامورانِ پاکستان، ایضاً
- ۳۵۷۔ پاکستانی اہل قلم کی ڈائریکٹری، ایضاً ص ۱۴۴
- ۳۵۸۔ شعرستان، ایضاً ص ۵۹
- ۳۵۹۔ پیش لفظ، رشک ترابی، مضمولہ، چاہتوں کے گلاب از ظہیر الدین ظہیر، الخیر پبلی کیشنز، سرگودھا، ۱۹۹۰ء ص ۲۱
- ۳۶۰۔ چاہتوں کے گلاب، ظہیر الدین ظہیر، ایضاً ص ۲۴۱
- ۳۶۱۔ ایضاً ص ۱۰۱
- ۳۶۲۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۱۸۹
- ۳۶۳۔ روزنامہ ٹھنڈی آگ لالہ موسیٰ، ۲۶ جون ۲۰۰۶ء
- ۳۶۴۔ ماہنامہ ماہِ نو، لاہور، جولائی ۲۰۰۵ء
- ۳۶۵۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۱۱۳
- ۳۶۶۔ ایضاً
- ۳۶۷۔ ملاقات یوسف خالد، سرگودھا، ۲۳ فروری ۲۰۰۸ء
- ۳۶۸۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۵۸
- ۳۶۹۔ کتبہ مرقد، سید مصطفیٰ حسین تاجدار دہلوی، بڑا قبرستان سرگودھا
- ۳۷۰۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۱۱۵
- ۳۷۱۔ نقوشِ سرگودھا، ایضاً ص ۵۱
- ۳۷۲۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۳۰۰
- ۳۷۳۔ جانِ رحمت، ایضاً ص ۷۴
- ۳۷۴۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۳۰۰
- ۳۷۵۔ العظمت للہ، احمد حسین رشک ترابی، انصار آرٹ پریس بلاک نمبر ۱۰ سرگودھا، ۲۰۰۱ء ص ۷
- ۳۷۶۔ علامہ رشک ترابی کی شخصیت اور شاعری، طارق محمود، مقالہ برائے ایم اے، گورنمنٹ کالج سرگودھا، ۱۹۹۸ء
- ۳۷۷۔ ماہنامہ زردبان، سرگودھا، اکتوبر نومبر ۱۹۹۲ء
- ۳۷۸۔ مشعل آفاق، رشک ترابی، الفرید مطبوعات اردو بازار سرگودھا، ۱۴۰۲ھ

- ۳۷۹۔ علامہ رشک ترابی، پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، بزمِ علم و فن کوٹ فرید، سرگودھا، ۲۰۰۳ء
- ۳۸۰۔ علامہ رشک ترابی کی شخصیت اور شاعری، ایضاً
- ۳۸۱۔ تحفہ درویش، علامہ احمد حسین رشک ترابی، سرگودھا، سن
- ۳۸۲۔ ملاقات پیر عمران صابر صابری (بھتیجا صاحبزادہ گلزار حسن شاہ)، سرگودھا، ۲۵ جنوری ۲۰۰۶ء
- ۳۸۳۔ جنوبی پنجاب، سندھ، بلوچستان میں اولیائے کرام کے قدیمی تاریخی روحانی مقامات، ایم زمان کھوکھری ڈوکیٹ، یاسراکینڈی گجرات، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳۶
- ۳۸۴۔ گلزار طیبہ، صاحبزادہ گلزار حسین شاہ صابری، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۸۶
- ۳۸۵۔ ایضاً ص ۱۰۱
- ۳۸۶۔ کلیب جلالی فن اور شخصیت، مرتبہ: ذوالفقار احسن، نقش گریپلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰
- ۳۸۷۔ کلیات کلیب جلالی، کلیب جلالی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء
- ۳۸۸۔ اپنی بات، ذوالفقار احسن، کلیب جلال، فن اور شخصیت، ایضاً ص ۱۰
- ۳۸۹۔ کلیب جلالی، شہزاد احمد، مشمولہ، کلیب جلالی فن اور شخصیت، ایضاً ص ۳۶
- ۳۹۰۔ ایضاً
- ۳۹۱۔ کلیب، روشنی اور احسن، شا کر کنڈان، مشمولہ: ماہنامہ روزن انٹرنیشنل گجرات، جون ۲۰۰۵ء
- ۳۹۲۔ روشنی اے روشنی، کلیب جلالی، ماورا پبلشرز بہاولپور روڈ، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴
- ۳۹۳۔ ایضاً ص ۲۶
- ۳۹۴۔ گجرات بار، ریاض مفتی، گجرات، ۱۹۹۴ء، ص ۵۲
- ۳۹۵۔ گجرات کی بات، اسحاق آشفہ، لالہ موسیٰ، ۱۹۹۱ء، ص ۴۱۳
- ۳۹۶۔ گجرات بار، ایضاً
- ۳۹۷۔ خفگان خاک گجرات، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلج، سلج پبلی کیشنز، گجرات، ۱۹۹۶ء، ص ۲۷۷
- ۳۹۸۔ ماہنامہ زجاج گجرات، جون جولائی ۱۹۹۱ء
- ۳۹۹۔ کوئٹل، مرتبہ: عبدالرحمن رتزا، کوئٹل پبلی کیشنز، گجرات، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۸
- ۵۰۰۔ ہمارے اہل قلم، ایضاً ص ۱۷۶
- ۵۰۱۔ مقتل میں چراغ، حسن اختر جلیل، نیرنگ خیال پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۶ء
- ۵۰۲۔ ٹیلی فونک رابطہ پروفیسر مظفر حسن منصور (برادر حسن اختر جلیل) جوہر آباد، ۳۰ مارچ ۲۰۰۸ء
- ۵۰۳۔ دیدہ خوش آب، ایضاً ص ۳۰
- ۵۰۴۔ مقتل میں چراغ، ایضاً
- ۵۰۵۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۲۰۵

- ۵۰۶۔ جانِ رحمت، ایضاً ص ۱۱۵
- ۵۰۷۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۳۳۳
- ۵۰۸۔ اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ، ایضاً ص ۲۳۱
- ۵۰۹۔ دیدہ خوش آب، ایضاً ص ۷۷
- ۵۱۰۔ ملاقات قاضی خضر جمال، خوشاب، ۷ جون ۲۰۰۷ء
- ۵۱۱۔ ایضاً
- ۵۱۲۔ ماہنامہ اسلوب کراچی، اکتوبر نومبر ۱۹۸۳ء
- ۵۱۳۔ ہمارے اہل قلم، ایضاً ص ۸۳
- ۵۱۴۔ سخنورانِ سرگودھا، ایضاً ص ۷۵
- ۵۱۵۔ ۱۰۰ مشہور ادیب، جلد چہارم، ایضاً ص ۲۳۳
- ۵۱۶۔ عالمی اردو ادب ۱۹۹۸ء جلد ۱۶، ہندوستان و کرم، دہلی ۱۹۹۹ء، ص ۱۹۳
- ۵۱۷۔ پذیرائی، ملک مقبول احمد، مقبول اکیڈمی لاہور، جنوری ۲۰۰۷ء ص ۵۰
- ۵۱۸۔ مکتوبِ اظہر جاوید، مشمولہ: سہ ماہی کامران سرگودھا، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء ص ۴۱
- ۵۱۹۔ ماہنامہ نیرنگ خیال، راولپنڈی، سالنامہ ۱۹۷۳ء ص ۲۶۱
- ۵۲۰۔ ماہنامہ سیپ، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹ء ص ۲۶۳
- ۵۲۱۔ اردو غزل انتخاب ۱۹۷۶ء-۱۹۷۹ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء ص ۷۲
- ۵۲۲۔ ملاقات، سلیم حسن مرزا، سرگودھا، ۳ جنوری ۲۰۰۸ء
- ۵۲۳۔ ایضاً
- ۵۲۴۔ ملاقات، شفیع ضامن، راولپنڈی، ۲۳ اپریل ۲۰۰۰ء
- ۵۲۵۔ تمنا بے تاب، ڈاکٹر رشید امجد، حرف اکادمی پشاور روڈ، راولپنڈی، ۲۰۰۱ء ص ۲۲۷
- ۵۲۶۔ ٹیلی فونک رابطہ، پروفیسر ڈاکٹر عابد سیال، اسلام آباد، ۷ اپریل ۲۰۰۸ء
- ۵۲۷۔ اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ، ایضاً ص ۲۳۱
- ۵۲۸۔ ماہنامہ فنون لاہور، اکتوبر نومبر ۱۹۷۷ء ص ۲۳۱
- ۵۲۹۔ ہم سے شامیں سجائیں غزل درغزل، گل شیربٹ، الحمد پبلی کیشنز رانا چیمبرز لیک روڈ لاہور، ۱۹۹۷ء ص ۱۳۳
- ۵۳۰۔ مکتوبِ ثاقب ملک، ہردوسودھی، بنام راقم، سرگودھا، ۱۳ فروری ۲۰۰۵ء
- ۵۳۱۔ اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ، ایضاً ص ۸۲
- ۵۳۲۔ سانول سُرنگیت، ثاقب ملک، ماڈرن بک ڈپو میلوڈی مارکیٹ اسلام آباد، ۱۹۹۲ء ص ۹

- ۵۳۳۔ سلگتی چاندنی، ثاقب ملک، ماڈرن بک ڈپو میلوڈی مارکیٹ اسلام آباد، ۲۰۰۶ء ص ۳۲
- ۵۳۴۔ سانول سُرنگیت، ایضاً ص ۵۳
- ۵۳۵۔ ملاقات محمد صفدر خان، سرگودھا، ۱۵ اپریل ۲۰۰۵ء
- ۵۳۶۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۳۱۸
- ۵۳۷۔ عاشق تے دریام، افتخار وراج کالر وی، سُرسانجھ پنجاب کالرہ دیوان سنگھ (گجرات)، ۲۰۰۹ء ص ۳۵۷
- ۵۳۸۔ نعت روزہ تازیانہ، گجرات، ۳۱ دسمبر ۱۹۷۴ء
- ۵۳۹۔ نعت روزہ تازیانہ، گجرات، ۱۴ مارچ ۲۰۱۱ء
- ۵۴۰۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۱۷۴
- ۵۴۱۔ فشار (کلیات) شوکت راز، شوکت راز اکیڈمی پھلروان (سرگودھا)، ۲۰۰۳ء ص ۵
- ۵۴۲۔ آئینہ احساس، ڈاکٹر شفقت قاضی، انجمن ارباب ذوق حجرہ شاہ مقیم ضلع اوکاڑہ، ۱۹۸۶ء، ص ۲۱۲
- ۵۴۳۔ مکتوب شوکت راز، پھلروان، بنام: اخلاق عاطف، سرگودھا، ۲۷ فروری ۱۹۸۵ء
- ۵۴۴۔ رد عمل، شوکت راز، مکتبہ فکر و شعور پھلروان (سرگودھا)، ۱۹۹۰ء، فلیپ
- ۵۴۵۔ ایضاً ص ۹۰
- ۵۴۶۔ توشہ، شوکت راز، شوکت راز اکیڈمی پھلروان (سرگودھا)، ۲۰۰۱ء ص ۹۱
- ۵۴۷۔ حضرت خواجہ نظام الدین کا خانقاہی پس منظر، طارق حبیب، مشمولہ: سہ ماہی شبیہ، خوشاب (حضرت غلام نظام الدین نمبر) جنوری ۱۹۹۷ء تا ستمبر ۱۹۹۸ء ص ۳۸
- ۵۴۸۔ حضرت خواجہ غلام نظام الدین۔ احوال و سوانح، مشمولہ: سہ ماہی شبیہ، ایضاً ص ۵۰
- ۵۴۹۔ حضرت خواجہ غلام نظام الدین کا خانقاہی پس منظر، ایضاً ص ۳۸
- ۵۵۰۔ سہ ماہی شبیہ، ایضاً ص ۱۶۷
- ۵۵۱۔ ایضاً ص ۱۷۳
- ۵۵۲۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۲۳۵
- ۵۵۳۔ خودنوشت، حاجی گل بخشالوی، قلم قافلہ کھاریاں، ۱۹۸۷ء ص ۱۱۳
- ۵۵۴۔ بزم رسالت، حاجی گل بخشالوی، قلم قافلہ کھاریاں، ۱۹۸۵ء ص ۲۱۶
- ۵۵۵۔ جانِ رحمت، ایضاً ص ۱۶۳
- ۵۵۶۔ خودنوشت، ایضاً ص ۱۱۳
- ۵۵۷۔ ہڈالی دے بجرے پھل، محمد علی اسد بھٹی، مشمولہ، مہینہ وار پنجابی ادب، لاہور اپریل ۲۰۱۲ء
- ۵۵۸۔ ماہنامہ دنیائے ادب، کراچی، ستمبر ۲۰۰۲ء

- ۵۵۹۔ ملاقات پروانہ شاہ پوری، سرگودھا، ۲۷ دسمبر ۲۰۰۵ء
- ۵۶۰۔ ملاقات پروانہ شاہ پوری، سرگودھا، ۱۷ اپریل ۱۹۹۸ء
- ۵۶۱۔ ملاقات پروانہ شاہ پوری، سرگودھا، ۲۷ دسمبر ۲۰۰۵ء
- ۵۶۲۔ ہمارے اہل قلم، ایضاً ص ۱۵۳
- ۵۶۳۔ پاکستانی اہل قلم کی ڈائریکٹری، ایضاً ص ۶۹
- ۵۶۴۔ فاصلے مجبوریاں اور انتظار، مرتبہ: طاہر محمود نوید، عباس پبلی کیشنز بہاولپور، ۱۹۹۸ء ص ۷۳
- ۵۶۵۔ نعت حضور اور سرگودھا کے شعراء، شاکر کنڈان، ماہنامہ لغت، لاہور، ستمبر ۱۹۹۸ء
- ۵۶۶۔ فضل القرآن، محمد نواز نسیم (مرحوم)، ادارہ انجمن آستان فضل سرگودھا، س ن
- ۵۶۷۔ وفيات ناموران پاکستان، ایضاً ص ۱۱۲
- ۵۶۸۔ ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد، اپریل مئی ۲۰۰۲ء
- ۵۶۹۔ ماہنامہ شاعر، بسبئی (ہم عصر اردو ادب نمبر) مئی ۱۹۹۷ء تا دسمبر ۱۹۹۸ء (جلد اول)
- ۵۷۰۔ ہمارے اہل قلم، ایضاً ص ۵۹
- ۵۷۱۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۶۰
- ۵۷۲۔ خوابوں کے بے نام جزیرے، اختر امان، یاسر پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء
- ۵۷۳۔ خاکی خاکے، سید ضمیر جعفری، مشمولہ: ماہنامہ نیرنگ خیال راولپنڈی، مارچ ۱۹۸۸ء
- ۵۷۴۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۶۰
- ۵۷۵۔ خوابوں کے بے نام جزیرے، ایضاً ص ۹
- ۵۷۶۔ ایضاً ص ۵۴
- ۵۷۷۔ ایضاً ص ۱۶
- ۵۷۸۔ مکتوب عاشق حسین عاشق، راولپنڈی، بنام راقم، ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء
- ۵۷۹۔ تذکرہ نعت گویان راولپنڈی، اسلام آباد، قمر ربیعینی، انجمن پبلشرز، کمال آباد، راولپنڈی، ۲۰۰۳ء ص ۵۵
- ۵۸۰۔ مکتوب عاشق حسین عاشق، ایضاً
- ۵۸۱۔ ایضاً
- ۵۸۲۔ ملاقات ورد بزمی ابن عاشق حسین عاشق، سرگودھا، ۲۰ دسمبر ۲۰۰۸ء
- ۵۸۳۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۳۳۳
- ۵۸۴۔ مکتوب ندیم حیدر بلوچ، جوہر آباد، بنام راقم، سرگودھا، ۱۵ فروری ۲۰۰۵ء
- ۵۸۵۔ ملاقات ندیم حیدر بلوچ جوہر آباد، ۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ء

- ۵۸۶۔ ٹیلی فونک رابطہ، ملک محمد حسین، جوہر آباد، ۱۶ فروری ۲۰۰۸ء
- ۵۸۷۔ نیم تاریک سڑک، ندیم حیدر بلوچ، جوہر آباد، ۲۰۰۰ء ص ۳۰
- ۵۸۸۔ ایضاً ص ۶۶
- ۵۸۹۔ سہ ماہی نالہ دل، بھیرہ، اپریل ۲۰۱۰ء ص ۷۴
- ۵۹۰۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۴۰۰
- ۵۹۱۔ اب انہیں ڈھونڈ چہ ابرغ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۱۸۴
- ۵۹۲۔ ایضاً
- ۵۹۳۔ جادہ پیا (گورنمنٹ ایم اے کا سرگودھا کا مجلہ)، ۲۰۰۱ء ص ۳۲۳
- ۵۹۴۔ جانِ رحمت، ایضاً ص ۹۸
- ۵۹۵۔ سہ ماہی شبیہ، خوشاب اکتوبر ۱۹۹۸ء تا مارچ ۱۹۹۹ء ص ۵۱
- ۵۹۶۔ ٹیلی فونک رابطہ، طفیل ثاقب، سرگودھا، ۱۹ اپریل ۲۰۰۸ء
- ۵۹۷۔ ملاقات، طفیل ثاقب، سرگودھا، ۸ جولائی ۲۰۰۸ء
- ۵۹۸۔ سہ ماہی شبیہ، خوشاب، اپریل تا ستمبر ۱۹۹۹ء ص ۶۷
- ۵۹۹۔ مکتوب حنیف ساجد، بھلروان، بنام راقم، سرگودھا، ۱۱۲ اپریل ۲۰۰۴ء
- ۶۰۰۔ خورشیدِ بطحا، حنیف ساجد، تابش پبلی کیشنز، سرگودھا، ۲۰۰۶ء
- ۶۰۱۔ خاکِ مینا، حنیف ساجد، تابش پبلی کیشنز، سرگودھا، ۱۹۹۳ء
- ۶۰۲۔ اقلیمِ کرب، حنیف ساجد، تابش پبلی کیشنز، سرگودھا، ۲۰۰۴ء
- ۶۰۳۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۲۳۳
- ۶۰۴۔ دیدۂ خوش آب، ایضاً ص ۶۱
- ۶۰۵۔ ایضاً
- ۶۰۶۔ جوہر مجلہ، گورنمنٹ کالج جوہر آباد، ۱۹۶۸ء۔ ۱۹۶۹ء ص ۷۵
- ۶۰۷۔ دیدۂ خوش آب، ایضاً ص ۶۲
- ۶۰۸۔ دیدۂ خوش آب، ایضاً ص ۶۴
- ۶۰۹۔ اب انہیں ڈھونڈ چہ ابرغ رخ زیبالے کر، ایضاً ص ۲۳۸
- ۶۱۰۔ روزنامہ مشرق، لاہور، ۳۱ جنوری ۱۹۸۰ء
- ۶۱۱۔ سخنوران سرگودھا، ایضاً ص ۳۳۹
- ۶۱۲۔ ملاقات، بھائی ظفر و اشفاق دنی، ساہیوال ضلع سرگودھا، ۲۹ جولائی ۲۰۱۲ء

- ۶۱۳۔ سہ ماہی دریچہ انٹرنیشنل، پاکستان، پین، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۰ء
- ۶۱۴۔ عالمی اردو ادب نمبر ۱۹۹۸ء ایضاً
- ۶۱۵۔ تاریخِ رفتگاں، جلد دوم، صابر براری، ادارہ فکر نو کورنگی، کراچی، ۱۹۹۸ء
- ۶۱۶۔ ہمارے اہل قلم، ایضاً ص ۱۵۸
- ۶۱۷۔ تاریخ کو مہتاب کیا، جمال احسانی، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
- ۶۱۸۔ سفر ہم سفر، راغب کلیب، مکتبہ ہم زبان، کراچی، ۱۹۹۸ء
- ۶۱۹۔ ہفت روزہ اخبار جہاں، کراچی، ۱۵ تا ۱۹ مارچ ۱۹۹۸ء
- ۶۲۰۔ میرے اجنبی میرے آشنا، اعتبار ساجد، ماہنامہ سپونک لاهور، جنوری ۲۰۰۰ء
- ۶۲۱۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۲۴۷
- ۶۲۲۔ عالمی اردو ادب نمبر ۱۹۹۸ء، ایضاً
- ۶۲۳۔ ستارہ سفر، جمال احسانی، شعیب پبلشرز علامہ اقبال روڈ، لاهور، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۳ء
- ۶۲۴۔ ایضاً
- ۶۲۵۔ ضلع خوشاب، تاریخ ثقافت ادب، ایضاً ص ۳۱۴
- ۶۲۶۔ سہ ماہی شبیہ، خوشاب، جون ۱۹۹۳ء ص ۳۸
- ۶۲۷۔ مکتوب عقیقہ بتول (بیوہ اے۔ ایچ انیس) ساہیوال (سرگودھا) بنام راقم، سرگودھا، ۱۸ ستمبر ۲۰۰۵ء
- ۶۲۸۔ ایضاً
- ۶۲۹۔ جانِ رحمت، ایضاً ص ۹۳
- ۶۳۰۔ ماہنامہ قلم قافلہ، کھاریاں، اپریل مئی ۱۹۹۱ء
- ۶۳۱۔ اردو ادب اور عساکر پاکستان، جلد اول، حصہ اول، ایضاً ص ۲۹۲
- ۶۳۲۔ ملاقات، بیوہ عبدالستار آثم، سرگودھا، ۲۸ جنوری ۲۰۰۶ء
- ۶۳۳۔ ایضاً
- ۶۳۴۔ ماہنامہ ”شمع“، کراچی، فروری ۱۹۸۷ء ص ۴۰
- ۶۳۵۔ سوچ رت، حاجی گل بخشالوی، ادارہ علم و فن پاکستان، کھاریاں، ۱۹۸۴ء ص ۱۳۳
- ۶۳۶۔ ملاقات مقصود راہی، سرگودھا، ۱۳ جون ۱۹۹۸ء
- ۶۳۷۔ نعت گویان سرگودھا، ایضاً ص ۲۵۴
- ۶۳۸۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ ربخ زیبائے کر، ایضاً ص ۱۹۵
- ۶۳۹۔ ماہنامہ نردبان، سرگودھا، جولائی اگست ۱۹۹۹ء

- ۶۳۰۔ نقوش سرگودھا، ایضاً ص ۹۶
- ۶۳۱۔ دیباچہ، شاکر کنڈان، مشمولہ: مجلت از صلاح الدین ساجد، ساگر پبلشرز پھلروان، ۲۰۰۸ء
- ۶۳۲۔ سخن آثار، ایضاً ص ۲۷
- ۶۳۳۔ مجلت، صلاح الدین ساجد (مرحوم) ایضاً ص ۷۳
- ۶۳۴۔ ایضاً ص ۸۹
- ۶۳۵۔ ضلع خوشاب، تاریخ، ثقافت، ادب، ایضاً ص ۳۲۱
- ۶۳۶۔ سہ ماہی شبیہ، خوشاب، دسمبر ۱۹۹۲ء
- ۶۳۷۔ مشاعرہ، خوشاب، ۲۱ دسمبر ۱۹۸۵ء
- ۶۳۸۔ دیدہ خوش آب، ایضاً ص ۱۲۹
- ۶۳۹۔ اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ، ایضاً ص ۲۳۶
- ۶۵۰۔ دیدہ خوش آب، ایضاً ص ۱۲۹
- ۶۵۱۔ ایضاً ص ۱۳۲
- ۶۵۲۔ ایضاً ص ۱۳۰
- ۶۵۳۔ ملاقات، یوسف خورشید، چاودہ، ۴ ستمبر ۲۰۰۵ء
- ۶۵۴۔ ایضاً
- ۶۵۵۔ آئینوں کے اپنے دکھ، یوسف خورشید، علم و عرفان پبلشرز اردو بازار لاہور، ۲۰۰۲ء ص ۱۴
- ۶۵۶۔ ایضاً ص ۲۴
- ۶۵۷۔ ایضاً ص ۵۷
- ۶۵۸۔ ملاقات سید معرفت ہمدانی، سرگودھا، ۶ فروری ۲۰۰۳ء
- ۶۵۹۔ سید معرفت ہمدانی کی بیاض، مشمولہ: سہ ماہی دریچہ انٹرنیشنل، پاکستان، پٹین، مارچ ۲۰۰۸ء ص ۴
- ۶۶۰۔ محبت کے اسرار و رموز اور پاکیزگیوں کا شاعر، شاکر کنڈان، مشمولہ: میری شرط محبت ہے از معرفت ہمدانی، نستعلیق مطبوعات، لاہور ۲۰۰۶ء ص ۹
- ۶۶۱۔ میری شرط محبت ہے، سید معرفت ہمدانی، ایضاً ص ۳۷
- ۶۶۲۔ ایضاً ص ۱۱۷
- ۶۶۳۔ ملاقات، عامر انصاری، پھلروان، ۱۶ اگست ۲۰۰۳ء
- ۶۶۴۔ جدائی، عامر انصاری، عامر اکیڈمی، پھلروان، ۲۰۰۰ء
- ۶۶۵۔ ماہنامہ دنیائے ادب، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۳ء

- ۶۶۶۔ زرد آدی، عامر انصاری، عامر اکیڈمی، پھلروان، سن
 ۶۶۷۔ ملاقات، ذوالفقار احسن (شاہد راہی کا دوست) سرگودھا، ۱۰ جولائی ۲۰۰۵ء
 ۶۶۸۔ مری مفلسی مراجرم ہے، شاہد راہی، ایچی پبلشرز بلال گنج، لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۸
 ۶۶۹۔ ایضاً ص ۲۷
 ۶۷۰۔ ایضاً ص ۳۲
 ۶۷۱۔ ملاقات، ساغر چشتی، خوشاب، ۱۷ جولائی ۲۰۰۴ء
 ۶۷۲۔ دیدہ خوش آب، ایضاً ص ۱۸۱
 ۶۷۳۔ ایضاً ص ۱۸۲
 ۶۷۴۔ ایضاً ص ۱۸۳

کتابیات

- ۱۔ آداب نعت، صوفی فقیر محمد، ادارہ گلستان اسلام، سرگودھا ۲۰۰۳ء
- ۲۔ آفاق، رفعت سلطان، تخلیق مرکز شاہ عالم مارکیٹ، لاہور ۱۹۸۶ء
- ۳۔ آواز، رفعت سلطان، باہو پبلشرز دربار حضرت سلطان العارفین باہو، جھنگ ۱۹۷۴ء
- ۴۔ آئینوں کے اپنے دکھ، یوسف خورشید، علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار، لاہور ۲۰۰۶ء
- ۵۔ آئینہ احساس، ڈاکٹر شفقت قاضی، انجمن ارباب ذوق حجرہ شاہ مقیم ضلع اوکاڑہ ۱۹۸۶ء
- ۶۔ آئینہ حق نما، مولوی محمد امین خوشابی، قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور، سن
- ۷۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغ ریخ زیبالے کر، پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، بزم علم و فن کوٹ فرید، سرگودھا ۲۰۰۳ء
- ۸۔ احادیث اربعین فی شان رئیس الغریبین، غلام سرور نعیمی، سرگودھا ۱۴۰۸ھ
- ۹۔ احمد ندیم قاسمی عالمی سیمینار و مشاعرہ، اظہار حیدر، پاک ادب سوسائٹی ابو ظہبی ۱۹۸۸ء
- ۱۰۔ اردو ادب اور عساکر پاکستان جلد اول حصہ اول، شاکر کنڈان، ادارہ فروغ ادب پاکستان، کنڈان ۱۹۹۷ء
- ۱۱۔ اردو غزل انتخاب ۶۱۹۷ء تا ۱۹۷۹ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۱۹۸۰ء
- ۱۲۔ اردو ماہیا، سید مہدی مدنی، سرگودھا ۱۹۷۶ء
- ۱۳۔ اشارات، ساقی الحسین، مرتبہ: جعفر بلوچ، دارالاند کیر اردو بازار، لاہور ۲۰۰۰ء
- ۱۴۔ اظہار حقیقت، باوا محمد عمر رند خوشابی، سرگودھا، سن
- ۱۵۔ اقلیم کرب، حنیف ساجد، تابش پبلی کیشنز، سرگودھا ۲۰۰۴ء
- ۱۶۔ اک ذرا شام سے پہلے، غلام جیلانی اصغر، راحیل ایسوسی ایٹ، کلب روڈ سرگودھا ۲۰۰۲ء
- ۱۷۔ العظمت للہ، احمد حسین رشک ترابی، انصار آرٹ پریس، سرگودھا ۲۰۰۱ء

- ۱۸۔ انتخاب، حلقہ ارباب ذوق گجرات، طاہر پہلی کیشنز، گجرات ۱۹۷۳ء
- ۱۹۔ انہماک، سید اقبال محمد صوفی نقوی، اکاظم پہلی کیشنز، بھلووال، سن
- ۲۰۔ باب الاعوان، مولوی نور الدین سلیمانی، لاہور ۱۳۱۹ھ
- ۲۱۔ باب جبریل، غلام فخر الدین سیالوی، رہبر پرنٹرز ایبٹ روڈ، لاہور، سن
- ۲۲۔ بات ترقی ورق ورق، بشیر احمد بشیر، عمیر پبلشرز، اردو بازار، لاہور، دوم ۱۹۹۶ء
- ۲۳۔ بزم رسالت، حاجی گل بخشالوی، قلم قافلہ، کھاریاں ۱۹۸۵ء
- ۲۴۔ بساط، مرتبہ: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، مکتبہ کوهسار برہ پور، بھگلپور، انڈیا ۱۹۸۹ء
- ۲۵۔ بوستانِ خلیل، خلیل بدایونی، سرگودھا ۲۰۰۳ء
- ۲۶۔ بہر زماں بہر زباں، نور احمد میرٹھی، ادارہ فکر نو، کورنگی کراچی ۱۹۹۶ء
- ۲۷۔ بیسویں صدی کے رسول نمبر تحقیقی و تعارفی جائزہ، پروفیسر محمد اقبال جاوید، فروغ ادب اکادمی گوجرانولہ، ۱۹۹۹ء
- ۲۸۔ پاکستانی اہل قلم کی ڈائریکٹری، نگہت سلیم، اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۱۹۹۴ء
- ۲۹۔ تپے پھیل کے، نصرت چوہدری، مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار لاہور ۲۰۰۰ء
- ۳۰۔ پذیرائی، ملک مقبول احمد، مقبول اکیڈمی لاہور، جنوری ۲۰۰۷ء
- ۳۱۔ پنجابی ادب دی کہانی، عبدالغفور قریشی، پنجابی ادبی بورڈ، لاہور ۱۹۸۷ء
- ۳۲۔ پھل کڑانہ باردے، ملک جاوید گھنجر، راوی پبلشرز اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء
- ۳۳۔ تاریخ بھیرہ، ابوشاہین فاروقی، ہفت روزہ تبسم، سرگودھا، دوم ۱۹۹۳ء
- ۳۴۔ تاریخ رفتگاں، جلد دوم، صابر براری، ادارہ فکر نو، کورنگی، کراچی، ۱۹۹۸ء
- ۳۵۔ تاریخ مشائخ نقشبندیہ، پروفیسر صاحبزادہ محمد عبدالرسول لٹمی، زاویہ، دربار مارکیٹ، لاہور ۲۰۰۰ء
- ۳۶۔ تاریخ کو مہتاب کیا، جمال احسانی، دوست پہلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
- ۳۷۔ تحفہ درویش، علامہ احمد حسین رشک ترائی، سرگودھا، سن
- ۳۸۔ تذکارِ بگویہ جلد اول، ڈاکٹر صاحبزادہ انوار احمد بگوی، مرکزی مجلس حزب الانصار پاکستان، بھیرہ، دوم، ۲۰۰۷ء
- ۳۹۔ تذکارِ بگویہ جلد دوم، ڈاکٹر صاحبزادہ انوار احمد بگوی، مرکزی مجلس حزب الانصار پاکستان، بھیرہ، ۲۰۰۹ء
- ۴۰۔ تذکرہ، صاحبزادہ ابرار احمد بگوی، لمعات احمد بگوی، مرکزی مجلس حزب الانصار پاکستان، بھیرہ ۱۳۲۳ھ
- ۴۱۔ تذکرہ علمائے پنجاب، حصہ دوم، اختر راہی، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۱ء
- ۴۲۔ تذکرہ ماہ و سال، مالک رام، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۹۱ء
- ۴۳۔ تذکرہ نعت گویانِ راہِ پندھی / اسلام آباد (قمر عینی، انجم پبلشرز، کمال آباد، راہِ پندھی)، ۲۰۰۳ء
- ۴۴۔ تشدد کی داستان، شیخ محمد افضل پراچہ، افضل سنز بلاک نمبر ۱۱، سرگودھا، ۱۹۷۷ء

- ۳۵۔ تصویرِ وطن، صابر ملک، ملک پہلی کیشنز، خوشاب، سن
- ۳۶۔ تفسیر تبیین القرآن، حصہ اول، شیخ القرآن والتفسیر حضرت علامہ سید محمد حسین نیلوی، ادارہ گلستان اسلام، سرگودھا، ۱۹۹۷ء
- ۳۷۔ تفکراتِ فراق، فراق کنگروی، ترتیب و انتخاب: قیوم رانا، نقش گر راولپنڈی، سن
- ۳۸۔ تقویم تاریخی، عبدالقدوس ہاشمی، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، دوم، ۱۹۸۷ء
- ۳۹۔ تمنا بے تاب، ڈاکٹر رشید امجد، حرف اکادمی پشاور روڈ، راولپنڈی ۲۰۰۱ء
- ۵۰۔ تنقیدی اشکال، غلامی نبی اعوان، اسامہ ٹریڈرز مسجد روڈ، کوئٹہ ۱۹۹۳ء
- ۵۱۔ تنہا چاند، عزیز علوی، ندیم پہلی کیشنز، سرگودھا ۱۹۹۳ء
- ۵۲۔ توشہ، شوکت راز، شوکت راز اکیڈمی پھلروان ۲۰۰۱ء
- ۵۳۔ جانِ رحمت، مرتبہ: اخلاق عاطف، مجلس خدام اسلام، سرگودھا، ۱۹۸۵ء
- ۵۴۔ جدائی، عامر انصاری، عامر اکیڈمی، پھلروان ۲۰۰۰ء
- ۵۵۔ جذباتِ دل، میاں فضل الرحمن بسمل، انجینئر محمود مجیب اصغر، ۲۰۰۲ء
- ۵۶۔ جمالِ بدر، بدر الدین بدر، سرگودھا، ۱۹۷۸ء
- ۵۷۔ جنوبی پنجاب سندھ، بلوچستان میں اولیائے کرام کے قدیمی تاریخی روحانی مقامات، ایم زمان کھوکھر، یاسر اکیڈمی گجرات ۱۹۹۹ء
- ۵۸۔ جنہیں ہم بھول بیٹھے ہیں، پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، بزمِ علم و فن کوٹ فرید، سرگودھا ۲۰۰۳ء
- ۵۹۔ چاہتوں کے گلاب، ظہیر الدین ظہیر، الخیر پہلی کیشنز، سرگودھا ۱۹۹۰ء
- ۶۰۔ چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل، وزیر آغا، کتب نما میکلوڈ روڈ، لاہور ۱۹۹۸ء
- ۶۱۔ حرفِ ملاقات، عمران نقوی، علم و عرفان پبلشرز مال روڈ لاہور ۲۰۰۱ء
- ۶۲۔ خاکِ بیٹا، حنیف ساجد، تابش پہلی کیشنز، سرگودھا ۱۹۹۳ء
- ۶۳۔ خفتگانِ خاکِ گجرات، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلج، سلج پہلی کیشنز، گجرات ۱۹۹۶ء
- ۶۴۔ خفتگانِ خاکِ لاہور، پروفیسر محمد اسلم، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور ۱۹۹۳ء
- ۶۵۔ خوابِ جبریل، علامہ محمد یوسف جبریل، ادارہ افکار جبریل واہ کینٹ، سن
- ۶۶۔ خوابوں کے بے نام جزیرے، اختر امان، یاسر پبلشرز، اسلام آباد ۱۹۸۰ء
- ۶۷۔ خودنوشت، حاجی گل بخشالوی، قلم قافلہ کھاریاں، ۱۹۸۷ء
- ۶۸۔ خورشیدِ بطحا، حنیف ساجد، تابش پہلی کیشنز، سرگودھا ۲۰۰۶ء
- ۶۹۔ خوش کلام، غلام جیلانی اصغر، پرویز بزمی، نقش گر پہلی کیشنز راولپنڈی ۲۰۰۶ء
- ۷۰۔ خیابانِ بدر، بدر الدین بدر، سرگودھا ۱۹۸۵ء
- ۷۱۔ خیابانِ نجات، سید وزیر حسین شیرازی، مکتبہ تمکین بلاک نمبر ۱۹ سرگودھا ۱۹۷۷ء

- ۷۲۔ خیر البشر کے حضور، ممتاز حسن، ادارہ فروغ اردو، لاہور ۱۹۷۵ء
- ۷۳۔ داستان سرگودھا، افضل حسین انصاری، پندرہ روزہ اکبر حافظ آباد ۲۰۰۷ء
- ۷۴۔ داغ بیل، الطاف مشہدی، عوامی کتاب خانہ، سرگودھا ۱۹۵۰ء
- ۷۵۔ دشتِ وفا، احمد ندیم قاسمی، التحریر اردو بازار، لاہور چہارم ۱۹۸۱ء
- ۷۶۔ دیدہ خوش آب، بدر منیر، خزنۂ علم و ادب، اردو بازار لاہور ۲۰۰۳ء
- ۷۷۔ دیکھ دھنک پھیل گئی، وزیر آغا، کاغذی پیر، لاہور ۲۰۰۳ء
- ۷۸۔ دیوانِ خادم، جمعدار ملک خادم حسین خان، لکھنؤ اول ۱۹۴۴ء
- ۷۹۔ دیوانِ خادم، کپتان ملک خادم حسین خان، دارالتجلید اردو بازار لاہور، ایڈیشن دوم ۱۹۵۶ء
- ۸۰۔ دیوانِ عیش، عیش بخاری، کلیارٹاؤن سرگودھا، سن
- ۸۱۔ دیوانِ قیصر، ڈاکٹر محمد شریف قیصر، تازیانہ پبلی کیشنز، گجرات، سن
- ۸۲۔ ردِ عمل، شوکت راز، شوکت راز اکیڈمی، پھلروان سرگودھا ۲۰۰۱ء
- ۸۳۔ رشتے درد کے، عزیز علوی، ندیم پبلی کیشنز، برحمان پورہ، سرگودھا ۱۹۷۴ء
- ۸۴۔ روشنی اے روشنی، کلیب جلالی، ماورا پبلشرز بہاولپور روڈ لاہور ۲۰۰۲ء
- ۸۵۔ زرد آدمی، عامر انصاری، عامر اکیڈمی پھلروان، سن
- ۸۶۔ زینہ صد، نصرت چوہدری، ممتاز نصرت سرگودھا ۱۹۷۷ء
- ۸۷۔ ساقیا، مسعود ساقیا، راولپنڈی ۱۹۷۲ء
- ۸۸۔ سانول سُرنگیت، ثاقب ملک، ماڈرن بک ڈپو، میلوڈی مارکیٹ، اسلام آباد ۲۰۰۶ء
- ۸۹۔ ستارہ سفر، جمال احسانی، شعیب پبلشرز علامہ اقبال روڈ، لاہور، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ء
- ۹۰۔ سخن آثار، نعیم ساگر، صنوریز پبلی کیشنز ملتان ۲۰۰۲ء
- ۹۱۔ سخنورانِ جہلم، قاضی غلام کبیر اراحل، جہلم ۱۹۶۲ء
- ۹۲۔ سخنورانِ سرگودھا، محمود اسیر، ادارہ شائین ادب، سرگودھا ۱۹۸۳ء
- ۹۳۔ سفر ہم سفر، راغب کلیب، مکتبہ ہم زبان، کراچی ۱۹۹۸ء
- ۹۴۔ سلسلہ طیبہ نقشبندیہ مجددیہ، حضرت مولانا محمد شفیع سرگودھوی، خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ مجددیہ کندیاں شریف ۱۴۲۵ھ
- ۹۵۔ سلگتی چاندنی، ثاقب ملک، ماڈرن بک ڈپو میلوڈی مارکیٹ، اسلام آباد ۲۰۰۶ء
- ۹۶۔ ۱۰۰ مشہور ادیب، جلد چہارم، محمد ظفر اقبال، ادارہ شاہین پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۸۵ء
- ۹۷۔ ۱۰۰ مشہور شعراء، جلد ششم، محمد ظفر اقبال، ادارہ شاہین پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۸۵ء
- ۹۸۔ سوچ رت، حاجی گل بخشالوی، ادارہ علم و فن پاکستان، کھاریاں ۱۹۸۳ء

- ۹۹۔ سوزِ جبریل، علامہ محمد یوسف جبریل، ادارہ افکار جبریل واہ کینٹ ۲۰۰۷ء
- ۱۰۰۔ سر حنی مع غزل و کافی، مولوی عبدالمجید، کرم الدین تاجران کتب، لاہور سن
- ۱۰۱۔ شاخ گل، الطاف مشہدی، ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل، لاہور ۱۹۵۳ء
- ۱۰۲۔ شب چراغ، واصف علی واصف، کاشفِ پہلی کیشنز: جوہر ناؤن لاہور، سن
- ۱۰۳۔ شخصیاتِ سرحد، محمد شفیع صابر، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور ۱۹۸۹ء
- ۱۰۴۔ شعرستان (تذکرہ شعرائے پاکستان) نعمان تاثیر و مظہر صدیقی، مکتبہ پرچم، حسن آفندی روڈ، کراچی ۱۹۵۲ء
- ۱۰۵۔ شعریات، محمد نذیر شیرزادہ، اقراء اکیڈمی سرگودھا ۱۹۹۹ء
- ۱۰۶۔ شکیب جلالی، فن اور شخصیت، مرتبہ: ذوالفقار احسن، نقش گر پہلی کیشنز، راولپنڈی ۲۰۰۷ء
- ۱۰۷۔ شہرِ غزل، بزمِ فکر و ادب، منگمری ۱۹۵۹ء
- ۱۰۸۔ صدیق اکبر، عبدالغنی ناز، خورشید بک ڈپو پبل ضلع سرگودھا ۱۹۶۲ء
- ۱۰۹۔ ضلع خوشاب تاریخ ثقافت ادب، امتیاز حسین امتیاز، پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، لاہور ۱۹۹۹ء
- ۱۱۰۔ عاشق تے وریام، افتخار وراج کالروی، مترسائجھ پنجاب، کالرہ دیوان سنگھ، گجرات ۲۰۰۹ء
- ۱۱۱۔ عالمی اردو ادب نمبر ۱۹۹۸ء جلد ۱۶، نند کشور و کرم، دہلی ۱۹۹۹ء
- ۱۱۲۔ عجلت، صلاح الدین ساجد، ساگر پبلشرز، پھلروان ۲۰۰۸ء
- ۱۱۳۔ علامہ رشک ترابی، پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، بزمِ علم و فن کوٹ فرید، سرگودھا، ۲۰۰۳ء
- ۱۱۴۔ علامہ یوسف جبریل، حیات و خدمات، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ضیائے ادب اردو بازار لاہور ۲۰۰۷ء
- ۱۱۵۔ علوی اعوان قبیلہ تعارف، علامہ محمد یوسف جبریل، ادارہ تحقیق الاعوان پنجاب واہ کینٹ ۲۰۰۰ء
- ۱۱۶۔ غزلیات اردو و رباعیات، حافظ فضل کریم گوندل، بھیرہ ضلع سرگودھا ۱۹۷۰ء
- ۱۱۷۔ غیر مسلموں کی نعت گوئی، راجا رشید محمود، ماہنامہ نعت لاہور، نومبر ۱۹۹۵ء
- ۱۱۸۔ فاصلے، مجبوریاں اور انتظار، مرتبہ: طاہر محمود نوید، عباس پہلی کیشنز: بہاولپور ۱۹۹۸ء
- ۱۱۹۔ فشار (کلیات) شوکت راز، شوکت راز اکیڈمی پھلروان، سرگودھا ۲۰۰۳ء
- ۱۲۰۔ فضل القرآن، محمد نواز نسیم (مرحوم)، ادارہ انجمن آستانِ فضل، سرگودھا سن
- ۱۲۱۔ قانون مکافات، مرزا مامول انور، ندیم اکیڈمی سوسائٹی، سرگودھا ۱۹۹۰ء
- ۱۲۲۔ کربِ دوراں، دوست محمد محبت، ادارہ تصانیف جبریل نواب آباد، واہ چھاؤنی ۱۹۹۰ء
- ۱۲۳۔ کلیاتِ شکیب، شکیب جلالی، سنگ میل پہلی کیشنز: لاہور ۲۰۰۳ء
- ۱۲۴۔ کوئیل، مرتبہ: عبدالرحمن رتزا، کوئیل پہلی کیشنز: گجرات ۱۹۸۸ء
- ۱۲۵۔ کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء، احمد پراچہ، مکتبہ مستجاب پراچہ محلہ پراچگان، کوہاٹ ۱۹۸۳ء

- ۱۲۶۔ کیسریاری، احمد ندیم قاسمی، شفیق پہلی کیشنز چوک گڑھی شاہو، لاہور ۱۹۹۹ء، فلیپ
- ۱۲۷۔ گجرات بار، ریاض مفتی، گجرات ۱۹۹۳ء
- ۱۲۸۔ گجرات کی بات، اسحاق آشفته، لالہ موسیٰ ۱۹۹۱ء
- ۱۲۹۔ گجرات کے اردو نعت گو شعراء، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیم، ماہنامہ نعت، لاہور فروری ۱۹۹۸ء
- ۱۳۰۔ گجرات میں اردو شاعری، پروفیسر کلیم احسان بٹ، ٹاؤک پہلی کیشنز جلاپور جنٹل، گجرات ۱۹۹۶ء
- ۱۳۱۔ گل دیدہ ور، پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، بزم علم و فن سرگودھا ۲۰۰۵ء
- ۱۳۲۔ گلزار طیبہ، صاحبزادہ گلزار حسین شاہ صابری، لاہور ۱۹۸۳ء
- ۱۳۳۔ گل گفتار، کرم حیدری، مکتبہ محمود، سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی ۱۹۹۹ء
- ۱۳۴۔ گلہائے رنگ رنگ (انتخاب)، جلد دوم، محمد شمس الحق، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد ۱۹۹۵ء
- ۱۳۵۔ گلہائے عقیدت، ایم احمد بخش ریاض، سرگودھا ۱۹۶۸ء
- ۱۳۶۔ لالہ اردو، مولانا اختر سردی، ہارون الرشید تبسم، دیدہ ورا کیڈمی کوٹ فرید، سرگودھا ۱۹۹۱ء
- ۱۳۷۔ لذت رنگ و بو، الطاف مشہدی، عوامی کتب خانہ، سرگودھا ۱۹۷۷ء
- ۱۳۸۔ لوح محفوظ، جوہر نظامی، مکتبہ تخلیق میلکیکن روڈ، لاہور ۱۹۷۸ء
- ۱۳۹۔ مایہ حیات بو ظفر نور محمد، حکیم حاجی نور محمد، شاہ پور شہر ۱۹۶۷ء
- ۱۴۰۔ محاکے، ڈاکٹر خیال امر وہوی، ماہنامہ سپوتنگ، لاہور فروری ۱۹۹۶ء
- ۱۴۱۔ مشعل آفات، رشک ترابی، الفرید مطبوعات اردو بازار، سرگودھا ۱۳۰۲ھ
- ۱۴۲۔ مقام شوق، راجا محمد یعقوب الحفیظ، شوق پہلی کیشنز، راولپنڈی ۱۹۹۱ء
- ۱۴۳۔ مقتل میں چراغ، حسن اختر جلیل، نیرنگ خیال پہلی کیشنز، راولپنڈی ۱۹۸۶ء
- ۱۴۴۔ مقناطیس الوحدت، حضرت مخدوم سید حیدر شاہ، لاہور ۱۹۰۷ء
- ۱۴۵۔ مہکتی ڈال، خیر الدین انصاری، انصار پہلی کیشنز، جھنگ ۲۰۰۰ء
- ۱۴۶۔ میں اور میں، غلام جیلانی اصغر، آئینہ ادب چوک انارکلی، لاہور ۱۹۸۳ء
- ۱۴۷۔ میری بہترین نظم، مرتبہ: محمد حسن عسکری، کتابستان، الہ آباد، ہندوستان ۱۹۳۲ء
- ۱۴۸۔ میری شرط محبت ہے، سید معرفت ہمدانی، نستعلیق مطبوعات، لاہور ۲۰۰۶ء
- ۱۴۹۔ میری مفلسی مراجرم ہے، شاہد راہی، ایچی پبلشرز بلال گنج، لاہور ۲۰۰۱ء
- ۱۵۰۔ میرے اجنبی میرے آشنا، اعتبار ساجد، ماہنامہ سپوتنگ، لاہور جنوری ۲۰۰۰ء
- ۱۵۱۔ نعت حضور اور سرگودھا کے شعراء، شاہ کرکند ان، ماہنامہ نعت، لاہور، ستمبر ۱۹۹۸ء
- ۱۵۲۔ نعت گویان سرگودھا، شاہ کرکند ان، ادارہ فروغ ادب پاکستان، سرگودھا ۲۰۰۶ء

- ۱۵۳۔ نقوش سرگودھا، عابد خورشید / ذوالفقار احسن، سرگودھا رائٹرز کلب سرگودھا ۲۰۰۲ء
- ۱۵۴۔ نوائے انور، پروفیسر ہارون الرشید تبسم، بزمِ علم و فن پاکستان، سرگودھا ۱۹۹۹ء
- ۱۵۵۔ نوائے شوق، پروفیسر ہارون الرشید تبسم، شوق پبلی کیشنز، سرگودھا ۲۰۰۳ء
- ۱۵۶۔ نور خوارقِ حیدری، سید حافظ حسن علی شاہ، آستانہ عالیہ جی شریف ضلع سرگودھا ۱۳۹۵ء
- ۱۵۷۔ نور سخن، نور احمد میرٹھی، ادارہ فکر نو کورنگی، کراچی ۱۹۸۸ء
- ۱۵۸۔ نیا پرانا لہجہ، ادارہ علم و فن پاکستان، دارالاشاعت ادارہ علم و فن پاکستان، پشاور ۱۹۷۹ء
- ۱۵۹۔ نیم تاریک سڑک، ندیم حیدر بلوچ، جوہر آباد ۲۰۰۰ء
- ۱۶۰۔ وادی سون سکیسر، محمد سرور اعوان، لوک ورثہ، اسلام آباد، سن
- ۱۶۱۔ واصف علی واصف، احوال و آثار، پروفیسر محمد ظہیر بدر، القمر انٹرنیشنل بازار، لاہور ۱۹۹۷ء
- ۱۶۲۔ وفيات مشاہیر پاکستان، پروفیسر محمد اسلم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۹۰ء
- ۱۶۳۔ وفيات ناموران پاکستان، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلج، اردو سائنس بورڈ، لاہور ۲۰۰۶ء
- ۱۶۴۔ وہم رسا، جوہر نظامی، نیرنگ خیال پبلی کیشنز لیاقت روڈ، راولپنڈی ۱۹۸۸ء
- ۱۶۵۔ ہمارے اہل قلم، زاہد حسین انجم، ملک بک ڈپو اردو بازار، لاہور ۱۹۸۸ء
- ۱۶۶۔ ہم قلم، تاج سعید، مکتبہ ارژنگ ظہیر آباد، پشاور ۱۹۷۷ء
- ۱۶۷۔ ہم نے شامیں سجائیں غزل در غزل، گل شیربٹ، الحمد پبلی کیشنز رانا چیمبرز لیک روڈ، لاہور ۱۹۹۷ء
- ۱۶۸۔ ہندو دھرم کی عظمت، جی این ننڈا، لاہور، سن
- ۱۶۹۔ ہندو شعراء کا نعتیہ کلام، حضرت مولانا عبد الجبید سوہدروی، مسلم پبلی کیشنز اردو بازار لاہور، سن
- ۱۷۰۔ یارانِ نو، انجمن ترقی ادب، ماڈل ٹاؤن، لاہور دسمبر ۱۹۶۶ء

غیر مطبوعہ کتب:

۱۷۱۔ گجرات دے پنجابی شاعر، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلج

۱۷۲۔ درودل، سید واحد حسین نشان

مقالے

- ۱۷۳۔ علامہ رشک ترابی کی شخصیت اور شاعری، طارق محمود، مقالہ برائے ایم اے، گورنمنٹ کالج سرگودھا ۱۹۹۸ء
- ۱۷۴۔ سید اقبال محمد صوفی نقوی کی شخصیت اور شاعری، محمد خان، مقالہ برائے ایم اے، گورنمنٹ کالج سرگودھا ۱۹۹۹ء
- ۱۷۵۔ غلام جیلانی اصغر کی اردو نثر نگاری، سلمیٰ چوہدری، مقالہ برائے ایم اے، گورنمنٹ کالج سرگودھا ۲۰۰۱ء
- ۱۷۶۔ اردو ادب کے فروغ میں خوشاب کا حصہ، محسن عباس، مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد ۲۰۰۷ء

مجلات

- ۱۷۷۔ جوہر، گورنمنٹ کالج جوہر آباد ۱۹۶۹ء
- ۱۷۸۔ ایضاً، ۲۰۰۳ء
- ۱۷۹۔ جادہ پیا، گورنمنٹ ایم اے کالج سرگودھا ۲۰۰۱ء
- رسائل، ششماہی
- ۱۸۰۔ کھوج، لاہور، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۶ء
- ۱۸۱۔ لیکھ، لاہور، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء
- ۱۸۲۔ اسالیب، سرگودھا، مئی تا جولائی ۲۰۰۷ء
- ۱۸۳۔ اسالیب، سرگودھا، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء
- ۱۸۴۔ دریچہ انٹرنیشنل پاکستان / چین، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵ء
- ۱۸۵۔ ایضاً، جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء
- ۱۸۶۔ ایضاً، اپریل تا ستمبر ۲۰۰۶ء
- ۱۸۷۔ ایضاً، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء
- ۱۸۸۔ ایضاً، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء
- ۱۸۹۔ سفیر اردو، لیوٹن (برطانیہ) ستمبر ۲۰۰۶ء
- ۱۹۰۔ شبیہ، خوشاب، دسمبر ۱۹۹۲ء
- ۱۹۱۔ ایضاً، جون ۱۹۹۳ء
- ۱۹۲۔ ایضاً، (حضرت غلام نظام الدین نمبر) جنوری ۱۹۹۷ء تا ستمبر ۱۹۹۸ء
- ۱۹۳۔ ایضاً، اکتوبر ۱۹۹۸ء تا مارچ ۱۹۹۹ء
- ۱۹۴۔ ایضاً، اپریل تا ستمبر ۱۹۹۹ء
- ۱۹۵۔ کامران، سرگودھا، اگست ۱۹۵۵ء
- ۱۹۶۔ ایضاً، جنوری تا مارچ ۱۹۶۱ء
- ۱۹۷۔ ایضاً، جلد ۱۲، شماره ۱
- ۱۹۸۔ ایضاً، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء
- ۱۹۹۔ تلمذ دل، بھیرہ، اپریل ۲۰۱۰ء
- ۲۰۰۔ ایضاً، ستمبر ۲۰۱۰ء

ادبی سیریز

۲۰۱۔ صدائے سخن، خوشاب، فروری ۱۹۹۰ء

ماہنامہ

۲۰۲۔ اخبار اردو، اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۰ء

۲۰۳۔ ایضاً، مئی ۲۰۰۲ء

۲۰۴۔ ادب لطیف، لاہور، فروری ۱۹۵۶ء

۲۰۵۔ اردو زبان، سرگودھا، مئی جون ۱۹۸۳ء

۲۰۶۔ ایضاً، مئی جون ۱۹۸۸ء

۲۰۷۔ اسلوب، کراچی، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۳ء

۲۰۸۔ الرشید، لاہور، اپریل ۱۹۹۷ء

۲۰۹۔ اوراق، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۸۶ء

۲۱۰۔ بیسویں صدی، دہلی، اگست ۱۹۶۵ء

۲۱۱۔ پنجابی ادب، لاہور، اپریل ۲۰۱۲ء

۲۱۲۔ دنیائے ادب، کراچی، ستمبر ۲۰۰۲ء

۲۱۳۔ ایضاً، اکتوبر ۲۰۰۳ء

۲۱۴۔ روزن انٹرنیشنل، گجرات، جون ۲۰۰۵ء

۲۱۵۔ زجاج، گجرات، جون، جولائی ۱۹۹۱ء

۲۱۶۔ سپوتنگ، لاہور، فروری ۱۹۹۶ء

۲۱۷۔ سفید چھتری، سرگودھا، نومبر دسمبر ۱۹۹۲ء

۲۱۸۔ سیارہ، لاہور، مارچ اپریل ۲۰۰۲ء

۲۱۹۔ سیپ، کراچی، دسمبر ۱۹۸۹ء

۲۲۰۔ شاعر، بمبئی (ہم عصر اردو ادب نمبر) مئی ۱۹۹۷ء تا دسمبر ۱۹۹۸ء

۲۲۱۔ شام و سحر (نعت نمبر ۲) لاہور، جنوری، فروری ۱۹۸۲ء

۲۲۲۔ شمس الاسلام، بھیرہ، فروری ۱۹۳۹ء

۲۲۳۔ شمع، کراچی، فروری ۱۹۸۷ء

۲۲۴۔ فلمی ستارے، عارفین، سرگودھا، ستمبر ۱۹۹۲ء

- ۲۲۵۔ فنون، لاہور، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۷ء
- ۲۲۶۔ قلم قافلہ، کھاریاں، جون ۱۹۸۳ء
- ۲۲۷۔ ایضاً، اپریل مئی ۱۹۹۱ء
- ۲۲۸۔ کاغذی پیرہین، لاہور، مئی جون ۲۰۰۵ء
- ۲۲۹۔ لہراں، لاہور، جون جولائی ۱۹۹۰ء
- ۲۳۰۔ ایضاً، جون ۱۹۹۹ء
- ۲۳۱۔ ماہ نو، لاہور، اپریل ۱۹۹۷ء
- ۲۳۲۔ ایضاً، جولائی ۲۰۰۵ء
- ۲۳۳۔ نردبان، سرگودھا، اکتوبر نومبر ۱۹۹۲ء
- ۲۳۴۔ ایضاً، جولائی اگست ۱۹۹۹ء
- ۲۳۵۔ نعت، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۳ء
- ۲۳۶۔ ایضاً، مارچ اپریل ۱۹۹۶ء
- ۲۳۷۔ نقاد، کراچی، ستمبر ۱۹۵۳ء
- ۲۳۸۔ نیرنگ خیال، لاہور دسمبر ۱۹۶۰ء
- ۲۳۹۔ ایضاً، راولپنڈی، سالنامہ ۱۹۷۳ء
- ۲۴۰۔ ایضاً، مارچ ۱۹۸۸ء
- پندرہ روزہ**
- ۲۴۱۔ ترجمان، سرگودھا، ۱۵ مئی ۱۹۹۱ء
- ۲۴۲۔ گلِ حنا، سرگودھا، ۱۶ تا ۱۷ جنوری ۲۰۰۲ء
- ہفت روزہ**
- ۲۴۳۔ اخبارِ جہاں، کراچی، ۱۵ تا ۱۹ مارچ ۱۹۹۸ء
- ۲۴۴۔ المقالہ، سرگودھا، ۲۹ اگست ۱۹۳۲ء
- ۲۴۵۔ تازیانہ، گجرات، ۳۱ دسمبر ۱۹۷۳ء
- ۲۴۶۔ ایضاً، ۱۳ مارچ ۲۰۱۱ء
- ۲۴۷۔ کامرانیاں، کنجاہ، ۱۱ تا ۲۰ فروری ۲۰۰۶ء
- ۲۴۸۔ ہلال، راولپنڈی، ۷ مئی ۱۹۶۷ء
- ۲۴۹۔ ایضاً، ۷ اگست ۱۹۷۹ء

روزنامہ

- ۲۵۰۔ امروز، لاہور، یکم جون ۱۹۷۱ء
 ۲۵۱۔ ٹھنڈی آگ، لالہ موسیٰ، ۲۶ جون ۲۰۰۶ء
 ۲۵۲۔ عوامی رائے، سرگودھا، ۹ فروری ۲۰۰۳ء
 ۲۵۳۔ ایضاً ۲۲ جنوری ۲۰۰۶ء
 ۲۵۴۔ مشرق، لاہور، ۳۱ جنوری ۱۹۸۰ء
 ۲۵۵۔ نوائے وقت، راولپنڈی، ۸ فروری ۲۰۰۰ء
 ۲۵۶۔ ایضاً، ۳۰ مئی ۲۰۰۰ء
 ۲۵۷۔ ایضاً، لاہور، ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۶ء

مکاتیب

- ۲۵۸۔ محمد صادق قصوری، برج کلاں (قصور) بنام راقم، ۱۹ مئی ۲۰۰۷ء
 ۲۵۹۔ مقصود وارثی، چک نمبر ۲۴ جنوبی بنام اخلاق عاطف ۱۹۸۳ء
 ۲۶۰۔ حافظ محمد رمضان، نور پور تھل، بنام راقم ۱۳ فروری ۲۰۰۶ء
 ۲۶۱۔ ملک شاہ سوار علی ناصر، خوشاب، بنام راقم، ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء
 ۲۶۲۔ مضطر دھریوی، دھریہ، بنام اخلاق عاطف، ۱۷ جون ۱۹۸۳ء
 ۲۶۳۔ شبلی پانی پتی، سرگودھا، بنام راقم، ۱۲ فروری ۲۰۰۶ء
 ۲۶۴۔ خلیل بدایونی، سرگودھا، بنام راقم، ۲۳ اگست ۲۰۰۷ء
 ۲۶۵۔ قمر حجازی، اوکاڑا، بنام راقم، ۲۳ اگست ۲۰۰۷ء
 ۲۶۶۔ پروفیسر محمد منور، لاہور، بنام اخلاق عاطف، ۱۶ ستمبر ۱۹۸۳ء
 ۲۶۷۔ سید محمد حسن واسطی، سرگودھا، بنام راقم، ۱۸ مارچ ۲۰۰۶ء
 ۲۶۸۔ نواب علی مخمور، بھلروان، بنام اخلاق عاطف ۱۶ مئی ۱۹۸۳ء
 ۲۶۹۔ ثاقب ملک، ہردوسوھی، بنام راقم، ۱۳ فروری ۲۰۰۵ء
 ۲۷۰۔ عاشق حسین عاشق، راولپنڈی، بنام راقم، ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء
 ۲۷۱۔ ندیم حیدر بلوچ، جوہر آباد، بنام راقم، ۱۵ فروری ۲۰۰۵ء
 ۲۷۲۔ حنیف ساجد، بھلروان، بنام راقم، ۱۱ اپریل ۲۰۰۳ء
 ۲۷۳۔ عقیفہ بتول، ساہیوال، بنام راقم، ۱۸ ستمبر ۲۰۰۵ء

ملاقاتیں

- ۲۷۴۔ اخلاق عاطف، سرگودھا، ۱۳ مارچ ۲۰۰۸ء
- ۲۷۵۔ محمد صفدر خان، سرگودھا، ۲۳ فروری ۲۰۰۶ء/ ۱۵ اپریل ۲۰۰۵ء
- ۲۷۶۔ عبدالرشید (پہل) سرگودھا، ۵ جنوری ۲۰۰۳ء
- ۲۷۷۔ بھائی ظفر، ساہیوال، ۲۹ جولائی ۲۰۱۲ء
- ۲۷۸۔ محمد اشفاق ونی، ساہیوال، ۲۹ جولائی ۲۰۱۲ء
- ۲۷۹۔ عبدالقیوم رانا، سرگودھا، ۵ جولائی ۲۰۰۸ء
- ۲۸۰۔ سید صوفی نقوی، بھلووال، ۱۳ جنوری ۲۰۰۲ء
- ۲۸۱۔ سید محمد حسین رضا نقوی، بھلووال، ۱۷ نومبر ۲۰۰۲ء
- ۲۸۲۔ افضل عباس شیرازی، سرگودھا، ۲۷ اگست ۱۹۸۵ء
- ۲۸۳۔ نصرت چوہدری، سرگودھا، ۱۵ جنوری ۲۰۰۶ء
- ۲۸۴۔ خالد یوسفی، سرگودھا، ۱۳ مارچ ۲۰۰۶ء
- ۲۸۵۔ کیپٹن محمد یونس (ہڈالی) راولپنڈی، ۱۵ نومبر ۲۰۰۰ء
- ۲۸۶۔ محمد نعیم، سرگودھا، ۷ جولائی ۲۰۰۸ء
- ۲۸۷۔ فیاض احمد خان، بھیرہ، ۲۲ اگست ۲۰۱۲ء
- ۲۸۸۔ صوفی فقیر محمد، سرگودھا، یکم نومبر ۲۰۰۳ء
- ۲۸۹۔ شبلی پانی پتی، سرگودھا، ۱۱ جنوری ۲۰۰۶ء
- ۲۹۰۔ عزیز وڑائچ، چک ۹۵ جنوبی، یک مارچ ۲۰۰۳ء
- ۲۹۱۔ سید واحد حسین نشان، سرگودھا، ۲۸ اپریل ۱۹۹۸ء
- ۲۹۲۔ سید حسن واسطی، سرگودھا، ۲۹ جنوری ۲۰۰۷ء
- ۲۹۳۔ ظفر گل، چک ۱۱۰ ایم ایل، ۲۸ جولائی ۲۰۰۳ء
- ۲۹۴۔ شرکت راز، بھکر وان، ۱۹ جولائی ۲۰۰۳ء
- ۲۹۵۔ ذوالفقار احسن، سرگودھا، ۱ فروری ۲۰۰۶ء
- ۲۹۶۔ یوسف خالد، سرگودھا، ۲۳ فروری ۲۰۰۸ء
- ۲۹۷۔ پیر عمران صابر صابری، سرگودھا، ۲۵ جنوری ۲۰۰۶ء
- ۲۹۸۔ قاضی خضر جمال، خوشاب، ۷ جون ۲۰۰۷ء
- ۲۹۹۔ سلیم حسن مرزا، سرگودھا، ۳ جنوری ۲۰۰۸ء

- ۳۰۰۔ شفیع ضامن، راولپنڈی، ۲۳ اپریل ۲۰۰۰ء
 ۳۰۱۔ پروانہ شاہ پوری، سرگودھا، ۱۷ اپریل ۱۹۹۸ء
 ۳۰۲۔ ایضاً، ۲۷ دسمبر ۲۰۰۵ء
 ۳۰۳۔ ورد بزمی (راولپنڈی) سرگودھا، ۲۰ دسمبر ۲۰۰۸ء
 ۳۰۴۔ ندیم حیدر بلوچ، جوہر آباد، ۲۵ دسمبر ۲۰۰۳ء
 ۳۰۵۔ مقصود راہی، سرگودھا، ۱۳ جون ۱۹۹۸ء
 ۳۰۶۔ بیوہ عبدالستار آثم، سرگودھا، ۲۸ جنوری ۲۰۰۶ء
 ۳۰۷۔ یوسف خورشید، چاودہ، ۲۷ ستمبر ۲۰۰۵ء
 ۳۰۸۔ سید معرفت ہمدانی، سرگودھا، ۱۱ فروری ۲۰۰۳ء
 ۳۰۹۔ عامر انصاری، بھلروان، ۶ اگست ۲۰۰۳ء
 ۳۱۰۔ پیساغر چشتی، خوشاب، ۱۷ جولائی ۲۰۰۳ء

ذاتی ڈائری

۳۱۱۔ فراق کنگروی

۳۱۲۔ مرزا مامول انور

۳۱۳۔ عبدالرشید اشک

۳۱۴۔ عزیز انبالوی
 قبروں کے کتبے

۳۱۵۔ محمد حسین شوق

۳۱۶۔ غلام نبی میرناسک

۳۱۷۔ بشیر اجن ادیب

۳۱۸۔ تاجدار دہلوی

سیلی فونک رابطہ

- ۳۱۹۔ پروفیسر مظفر حسن منصور، جوہر آباد، ۳۰ مارچ ۲۰۰۸ء
 ۳۲۰۔ پروفیسر ڈاکٹر عامریال، اسلام آباد، ۱۷ اپریل ۲۰۰۸ء
 ۳۲۱۔ ملک محمد حسین، جوہر آباد، ۱۶ فروری ۲۰۰۸ء
 ۳۲۲۔ طفیل ثاقب، سرگودھا، ۱۹ اپریل ۲۰۰۸ء

اشاریہ (شخصیات)

احمد علی شاہ: سید: ۲۲)
احمد ندیم قاسمی: ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴	آرنلڈ: ۱۳۶
۲۸۳، ۲۵۷، ۲۱۰	آزاد گلانی: ۲۰۲
احمد نواز، ملک: ۳۰۳	آفتاب مفتی، نصر اللہ خان: ۳۰۷
احمد ہمیش: ۹۹	آل احمد علیگ: ۱۳
احمد یار نعیمی، مولانا مفتی: ۱۲۶	آنس معین: ۳۳۳
اختر امان، اختر اللہ ملک: ۳۲۶، ۳۲۵	ابرار حسین زبیری: ۱۸۸
اختر حسین: ۲۲۷	ابوشاہین فاروقی: ۱۳۹، ۲۸
اختر حسین رنگین: ۱۳۰	اجمل نیازی: ۳۲۳
اختر راہی، ڈاکٹر سفیر: ۵۱، ۲۱	احسان امر و ہوی: ۳۲۹
اختر شاہ پوری: ۱۳	احسن زیدی: ۲۰۳
اختر واصفی، عبدالحق: ۱۱، ۵۶، ۵۷، ۲۱۰	احمد اقبال ٹوانہ: ۹۲
اختر سرحدی: ۶۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴	احمد الدین بگوی، حافظ: ۲۱
۲۳۲، ۲۱۰	احمد پراچہ: ۱۳۲
اخلاق عاطف: ۱۹، ۳۶، ۷۲، ۱۸۸	احمد جاوید: ۳۳۳
ادا جعفری: ۲۱۰	احمد حسن واسطی، حافظ سعید: ۲۲۱
ارشاد عظمت: ۲۷۳، ۲۷۴	احمد خان، حضرت مولانا ابوالسعد: ۵۱
ارشاد محمود: ۱۲۳	احمد دین کیلوی: ۵۱
ارمان نجمی: ۲۰۳	احمد سرفراز اعوان: ۱۳۳

اسحاق آشفته: ۲۸۷	اقبال منظر: ۱۹۳، ۱۹۴
اسحاق قریشی: ۳۴۲	اکبر حمیدی: ۲۰۳
اسد، علامہ: ۱۶۱	اکبر شاہ شیرازی، سید: ۸۳
اسد اعوان: ۳۶۸	اکرام اللہ شرر: ۲۱۰
اسد اللہ خان غالب: ۱۲۵، ۱۲۸، ۲۶۷	اللہ بخش تونسوی، حضرت خواجہ شاہ: ۲۲
اسد اللہ خان مفتی: ۳۰۷	اللہ دیا خان: ۳۴۰
اسلم قرخی، ڈاکٹر: ۱۵۲	اللہ راضی رہبر: ۹۴
اشیر داس بسک: ۱۴	الطاف پرواز: ۹۹
اصغر جالندھری: ۱۴	الطاف حسین حالی، مولانا: ۱۸۰
اصغر علی شاہ احسن، سید: ۲۶۴	الطاف مشہدی، الطاف حسین: ۱۲۳، ۱۳۳، ۱۳۴
اصغر علی نظامی: ۱۱۷	۲۹۵، ۲۷۶، ۲۰۱، ۱۳۶، ۱۳۵
اصغر جاوید، عبدالغفور: ۱۶، ۲۱۰، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷	امام دین، چودھری: ۶۸
اعجاز کرنا لوی، اعجاز حسین: ۶۵، ۶۶، ۶۷	امام دین، شیخ: ۲۰۹
افشاں ملک، ڈاکٹر: ۱۵۲	امام علی شاہ، حضرت پیر: ۲۲
افضال حسین: ۱۸۲	امانت انوار: ۲۵۲
افضال ناز گنگوہی: ۱۲۴	امتیاز کلثوم: ۲۸۵
افضل عباس: ۲۰۳	امراؤ مرزا فیروز پوری: ۱۹۷
افضل گوہر: ۲۵۹، ۳۵۷	امیر چھٹروی، پیر مولانا سید: ۱۴۵
اقبال احمد، خواجہ صوفی: ۱۷۹	امیر مینائی: ۹۴
اقبال آفاقی: ۲۰۳	انوار احمد بگویی، ڈاکٹر: ۵۹

بشن سنگھ بیکل، سردار: ۱۳، ۸۹، ۹۰

بشیر احمد، مفتی: ۲۸۷

بشیر احمد بشیر: ۱۹۶، ۱۹۷

بشیر احمد تارڑ، چودھری: ۶۳، ۲۱۰

بشیر موجد: ۱۵۲

بلال اُمی، غلام دستگیر: ۳۵۱

بلھے شاہ: ۱۳۵

بھاشانی، مولانا: ۱۹۷

بیدل پانی پتی: ۲۱۰

بے نظیر بھٹو: ۲۹۶

پ

پال ایرک نارن: ۲۰۳

پروانہ شاہ پوری، محمد حیات: ۳۱۹، ۳۲۰

پرویز بزمی: ۱۷۱

پوپ جان پال: ۱۶۱

ت

تاجدار دہلوی: ۲۵۰، ۲۷۱، ۲۷۲

تاج قائم خانی: ۱۷۳

تسخیر احمد، ڈاکٹر: ۳۰

تصدق حسین، ڈاکٹر: ۱۶۵، ۲۵۳

انور حیدری، سید منور حسین: ۲۲۹

انور سدید: ۱۲۳، ۱۷۱، ۲۰۳، ۲۰۴

انور گوندی: ۶۸، ۲۰۹، ۲۰۱

اورنگ زیب، سردار: ۱۳۲

اے ایچ انیس (امیر حسین): ۳۵۲

ایم بی خلیق: ۱۱، ۱۳، ۲۵، ۲۶

این میری شمل: ۱۶۱

ایوا ایم ایلینڈر: ۲۰۲

ایوب جوہر: ۳۳۰

ایوب خان، فیلڈ مارشل: ۱۵۹

ب

بدرالدین بدر: ۱۰۵، ۱۰۶

بدر منیر: ۱۸۶، ۲۳۹، ۲۹۳، ۳۲۶، ۳۷۴

برٹریڈرسل: ۱۶۱

برج گوپی ناتھ بیکل، بابو: ۸۹، ۹۰

برج موہن کینفی دتاتریہ دہلوی، علامہ پنڈت:

۱۳۳، ۱۹۷

برنورومی: ۲۰۳

بسکل صابری: ۲۱۰

بشارت احمد نیر، مفتی: ۲۸۷

جمیل اطہر: ۲۱۰	تنویر نقوی: ۱۱۰
جمیل ملک: ۱۵۲	تنویر ہاشمی، محمد اجمیل: ۳۳۶، ۳۳۵
جوہر نظامی، عبدالغفور: ۶، ۷، ۹۲، ۹۹، ۱۰۰، ۲۱۰،	توقیر ضیا: ۱۱۰
۲۹۳، ۲۸۹	ث
جھنڈو خان: ۷۳	ثاقب ملک، حبیب نواز: ۳۰۴، ۳۰۳
جی ایچ کر جلی: ۱۱۰	ثروت طارق حبیب: ۲۵۱، ۳۲
جی ایم اکمل (غلام مرسلین): ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵	ج
جی معین الدین: ۴۲	جامی (مولانا عبدالرحمن): ۱۸۶، ۳۲۴
جیون شاہ شیرازی، سید: ۸۳	جانی پیا: ۱۴
جے رتن: ۲۰۲	جاوید اختر، ڈاکٹر سید: ۳۲۱
جیمین کرین: ۱۶۱	جاوید اقبال، ڈاکٹر: ۲۳۳
ج	جاوید انور: ۳۲۶
چراغ علی قریشی، حکیم: ۲۸۷	جاوید سوز، ڈاکٹر: ۲۳۷، ۲۳۸
ح	جاوید گھنچیر، ملک: ۳۰
حاتم علی حاتم: ۱۲۱، ۱۲۲	جعفر بلوچ: ۲۶۱
حاتم علی رانجھا: ۱۲۱	جعفر طاہر، سید: ۲۱۰، ۲۸۳
حافظ (شیرازی): ۱۳۸، ۱۸۶	جگر مراد آبادی: ۶۵، ۲۱۰
حافظ لدھیانوی: ۲۱۰	جلیل حشمی: ۱۴۰
حب حسن اثر بدایوانی: ۱۸۲	جمال احسانی (محمد جمال عثمانی): ۳۳۸، ۳۳۹
حبیب اللہ خان ٹوانہ: ۹۱، ۹۲	جمال الدین، صاحبزادہ: ۳۱۳

خالد اختر افغانی: ۲۹۳	حسرت جعفری، محبوب حسین: ۳۳۴
خاور لدھیانوی: ۲۱۰	حسن اختر جلیل: ۲۹۰، ۲۸۹
خدا سوز: ۲۱۰	حسن خان: ۳۲
خضر جمال، قاضی: ۲۹۳	حسن رضوی: ۳۲۳
خضر حیات ٹوانہ: ۳۴	حسن علی شاہ گیلانی، سید حافظ: ۲۳
خلیق: ۱۳	حسن محمد، چوہری: ۱۲۱
خلیق لا ابالی: ۲۵، ۱۳	حسن نظامی، خواجہ: ۹۹
خلیل بدایونی: ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳	حشمت آراجاب: ۲۱۰
خلیل چکوالی: ۲۱۲	حضور الرحمان بدایونی: ۱۸۱
خلیل رامپوری: ۲۵۶	حفصہ طور بہار: ۲۱۰
خنجر بریلوی: ۱۳	حفیظ جالندھری: ۲۱۰
خورشید احمد خان: ۱۱، ۱۰	حقیر آستانی، کیشور چندر سین: ۷۹
خورشید راٹھور: ۲۱۰	حمید احمد خان: ۱۸۰
خورشید رضوی، ڈاکٹر: ۱۲۳، ۱۵۶، ۲۱۰	حمید گل: ۱۱۰
خورشید عالم گوہر قلم: ۳۶۳، ۳۶۵	حنیف رامے: ۲۴۰
خوشحال خان خٹک: ۱۴۰	حنیف ساجد: ۳۳۱، ۳۳۰
خیال امر وہوی، ڈاکٹر: ۱۹۱	حیدر علی شاہ گیلانی، سید حافظ: ۱۱، ۲۲، ۲۳
خیر الدین انصاری: ۲۲۳	۲۴
د	حیدر قریشی: ۲۰۳، ۲۰۴
دارو والا، پروفیسر: ۱۹۷	خ
دہ، پروفیسر: ۱۹۷	خادم حسین، ملک: ۱۰۹، ۱۱۰

راجا شاہ پوری: ۱۰	دلارا سنگھ: ۱۴
راجن ادیب، خواجہ محمد بشیر: ۲۳۱، ۲۳۰	دلاور حسین زیدی، سید: ۱۹۴
راجندر سنگھ ورما: ۲۰۲	دلپذیر، مولوی محمد امین: ۳۰، ۲۹۹، ۲۸، ۱۲، ۱۱
راز زیدی شاہ پوری: ۱۵	دل خوشابی، شریمان لوکنا تھ جی، ۱۱، ۱۱، ۱۱
راز سنتو کھ سری: ۲۰۲	دل محمد، پروفیسر: ۱۹۷
راغب شکیب: ۳۲۹، ۲۰۳	دوران بادشاہ، حضرت: ۱۲۶
رام بھیجا سیٹھ، پروفیسر: ۱۹۷	دوست محمد: ۳۳۷
رام چندر جی: ۲۷۵	دوست محمد راؤ: ۳۰۹
رانی ابھرت: ۱۰	دوست محمد محبت: ۱۸۷، ۱۸۶
رب بخش کلیار: ۱۴	دین محمد خان: ۱۳
رحمن بابا: ۱۲۰	ڈ
رحیم بخش، فشی: ۴۷	ڈانے پاپاسیٹرانٹو: ۲۰۲
رشک ترابی، احمد حسین: ۱۳۳، ۲۱۰، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۷	ذ
۲۸۰، ۲۷۷، ۲۷۶، ۲۷۵، ۲۷۱	ذکی الحسنین، سید: ۳۳۷، ۳۳۶
رشک صدیقی: ۲۵۶	ذوالفقار احسن: ۲۸۵
رشید اختر ندوی: ۳۲۱	ذوالقرنین حیدر: ۳۳۴
رشید امجد، ڈاکٹر: ۳۰۰	ذوق: ۱۴۵
رشید قیصرانی: ۲۱۰	ر
رشید محمود، راجا: ۶۶، ۹۰، ۳۲۳	رابعہ نہاں: ۲۱۰
رشید نثار: ۲۰۴	راجا رسالو: ۱۹۰

- رشیدہ سلیم سمیں: ۲۱۰
- ستیا پال آنند: ۲۰۲
- رفعت سلطان ، صاحبزادہ: ۲۱۰، ۲۲۳، سجاد باقر رضوی، سید: ۳۲۳
- ۲۲۳
- سجاد نقوی: ۲۰۳
- رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: ۱۷، ۱۹
- سراج دین، میر: ۱۲۳
- رفیق بھیروی: ۱۳
- سرخرو خان، حکیم: ۳۰۵
- رفیع سندیلوی: ۲۰۳
- سردار علی شیرازی، سید: ۸۳
- رند خوشابی، باوا محمد عمر: ۱۱، ۴۹، ۵۰
- سرور مجاز: ۲۱۰
- روشن دین، چودھری: ۲۵۶
- سرون ناتھ آفتاب، حکیم: ۱۲
- ریاض احمد شاد، پروفیسر: ۲۸، ۲۹۵، ۱۹۱، سریندر موہن دتاتریہ: ۱۹۷
- ۳۲۹
- سعدی شیرازی: ۱۷۶
- ریاض جالندھری، احمد بخش: ۶۱، ۶۲، ۶۳
- سعید صابری: ۱۳
- سلطان احمد: ۱۹۷
- ز
- سلطان احمد بخش صاحبزادہ: ۲۲۳
- زاہد حسین انجمن: ۱۹۰، ۲۳۱، ۲۹۵، ۳۲۸
- سلطان احمد چودھری: ۱۹۱
- زاہد منیر عامر، ڈاکٹر: ۱۷۱
- سلطان احمد سالک: ۸۷
- زوسوینا: ۲۰۲، ۲۰۳
- سلطان باہو، حضرت: ۲۲۳
- س
- سلطان بچہ: ۱۱
- ساحر لدھیانوی: ۲۹۶
- سلطان رشک: ۳۳۰
- ساگر چشتی، محمد اسلم: ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵
- سلطان علی تنگیانہ: ۱۰۰
- ساقی الحسنی، پروفیسر ظہیر الحق: ۲۶۱، ۲۶۲
- سلطان محمود، مولوی: ۳۲۳
- سائل دہلوی، نواب سراج الدین: ۱۱۳
- سلطان محمود قادری، قاضی: ۱۳۸
- ستاں بی بی: ۵۳

شاہ نواز نقوی، سید: ۷۶	سلطان محمود نامی: ۱۱
شبلی پانی پتی، خواجہ اویس احمد: ۱۸۰، ۱۷۹	سلمی بی بی: ۳۳
شبیر خان: ۸۱	سلیم اختر، ڈاکٹر: ۱۷
شبیر شاہد: ۳۳۳، ۳۳۲	سلیمان نوری، حضرت سخی: ۱۱، ۱۰
شریف کنجاہی: ۲۱۰، ۱۳۹	سلیم بھٹی، ابوالخیال محمد فیروز الدین: ۱۳۲، ۱۳۱
شعیب احمد، ڈاکٹر: ۳۶۳	سلیم حسن مرزا: ۲۹۹، ۲۹۸
شفقت ضامن: ۳۰۵، ۳۰۲، ۳۰۱، ۳۳۰	سمن سلطان، صاحبزادہ: ۲۲۳
شک نظام: ۲۰۲	سیدن شاہ، پیر سید: ۲۸۰
شکلیب جلالی: ۲۸۵، ۲۸۴، ۲۸۳، ۲۸۲، ۲۵۶، ۹۹	سیف زبیری: حامد حسین: ۱۸۸
۳۳۳، ۲۹۳	سیف زلفی: ۲۸۳
شکیل الرحمان: ۱۵۲	سیماب اکبر آبادی: ۲۱۰
شمس شیرازی، حضرت شاہ: ۱۰	سیمانت پرکاش: ۲۰۲
شمیم بھیروی: ۱۳۰، ۱۳۹، ۱۳۸	ش
شوکت راز: ۳۷۰، ۳۱۰، ۳۰۹	شارب انصاری: ۲۱۰
شوکت علی خان، مولانا: ۱۱۳	شازیہ عمر: ۲۰۳
شوکت محمود اعوان: ۱۶۱	شاہد حسین شاہ، عبدالواسع: ۱۵۸، ۱۵۷
شوکت محمود کنڈان، پروفیسر: ۳۲	شاہد کنڈان: ۳۶۸، ۳۲۳، ۳۲
شہباز نقوی: ۱۹۱	شاہد نظامی: ۲۱۰
شہزاد احمد: ۲۸۳، ۹۹	شاہد راہی: ۳۷۲، ۳۷۱
شیدا انبالوی، فشی عبدالرزاق: ۳۷، ۳۶	شاہ سلطان، حاجی: ۲۲۷

- شیر افضل جعفری: ۲۱۰
شیر امیر شاہ، سید: ۴۹
شیر محمد: ۵۳
شیر محمد اسیر: ۱۳۶، ۱۳۵
شیر محمد چشتی قادری: ۱۱۹
- ضیاء الدین سیالوی، خواجہ: ۱۱۶
- ط
- طارق حبیب: ۲۰۳، ۳۱۱، ۳۱۲
طارق گجر: ۱۹۰
طارق محمود: ۲۷۷، ۲۷۵
طارق مفتی: ۱۱۲، ۳۰۷
طالب جالندھری: ۲۱۰
طاہر شاہ، باوا: ۳۶۰
طفیل ثاقب: ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸
- ظ
- ظفر الدین: ۹۴
ظفر علی خان، مولانا: ۲۱۵
ظفر گل: ۲۲۷
ظہور احمد حافظ سید: ۲۶۱
ظہور احمد بگوی، مولانا: ۵۹، ۶۰، ۱۰۳
ظہور حسین عثمانی: ۳۳۸
ظہور عالم ظہور: ۱۲، ۳۳۰
ظہور نظر: ۲۱۰
ظہیر الدین ظہیر: ۲۶۶، ۲۶۷
- ص
- صابر گیلانی: ۱۳۴
صابر ملک: ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹
صادق سہنی: ۱۶۷، ۱۶۸
صدر الدین آزرودہ، مولانا مفتی: ۲۱
صغیر حسین رضوی، سید: ۲۸۲
صفر بخاری: ۲۴۹
صلاح الدین احمد، مولانا: ۱۹۹، ۲۰۱
صلاح الدین ساجد: ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۸۰
صنوبر مصور: ۲۱۰
صوفی نقوی، سید اقبال محمد: ۷۶، ۷۷
- ض
- ضامن علی حیدری: ۲۱۰، ۲۶۸، ۲۶۹
ضمیر جعفری، سید: ۱۰۰، ۳۲۶
ضیا ساجد: ۱۵۲

عبدالرزاق شاہ، حکیم سید: ۵۲	ع
عبدالرسول بکھروی، حکیم: ۱۱، ۲۶، ۱۲۰	عابد خورشید: ۱۷۱، ۲۰۳، ۲۰۴
عبدالرسول للہی، پروفیسر صاحبزادہ: ۲۶	عابد علی عابد، سید: ۲۱۰
عبدالرشید اشک میر: ۱۲۳، ۱۲۴، ۲۱۰، ۲۶۹	عارف حسن: ۱۱۰
عبدالرشید نائی: ۷۰	عاشق حسین شاہ، پیر حاجی: ۲۸۰
عبدالستار آثم: ۳۵۳، ۳۵۴	عاشق حسین عاشق: ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰
عبدالشکور ترمذی، قاری: ۳۵۲	عاصی کرناالی: ۲۶۲
عبدالعزیز بگوی، مولانا: ۳۵، ۵۹	عاصی واصفی: ۵۷
عبدالعزیز خالد: ۱۷۶	عالم گیر خان بلوچ، سردار: ۳۲۱
عبدالعزیز دہلوی، شاہ: ۴۳	عامر انصاری، شجاع الدین: ۳۷۰
عبدالعزیز شاہ ہمدانی، سید: ۳۶۶	عبادت بریلوی: ۱۸۰
عبدالغفور حاتم: ۱۳	عبدالحق: ۱۲۶
عبدالغفور قریشی: ۲۸	عبدالحکیم، حضرت مولانا: ۲۱
عبدالغنی: ۳۵۵	عبدالحمید، پروفیسر رانا: ۳۳
عبدالغنی جوہر: ۱۷۸، ۲۱۰	عبدالحمید سوہدروی، مولانا: ۸۹
عبدالغنی ناز: ۶۹، ۷۰	عبدالحمید عدم: ۲۱۰
عبدالقادر جیلانی نغدانی، حضرت شیخ: ۲۲	عبدالخالق، حکیم: ۱۴۲
عبدالقیوم رانا، پروفیسر: ۷۴	عبدالرحمن، چغتائی: ۲۰۱
عبدالمجید، مولوی: ۱۱، ۳۸، ۴۰	عبدالرحمان، میاں: ۹۷

عبدالمجید سالک: ۱۳۹، ۱۳۴	علی حسین شاہ: ۱۳۳
عبدالمجید سیفی: ۳۸	علی گوہر، راجا: ۸۱، ۸۲، ۲۱۰
عثمان خان: ۴۲	علی محمد: ۲۶۴
عرفان رضوی: ۳۲۹	عمر حیات ٹوانہ، ملک: ۱۰۹
عزت بخاری: ۱۷۴	عمر دراز ساجد: ۳۶۱، ۳۶۲
عزیز احمد قاضی: ۱۰۸، ۱۰۹	عمر مست قلندر، باوا خواجہ: ۴۹
عزیز اختر: ۱۴۲	عنایت اللہ: ۲۳۷
عزیز انبالوی: ۲۱۲	عیش بخاری: ۱۴۷
عزیز علوی: ۲۳۵، ۲۳۶	غ
عصمت علیگ: ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۱	غافر شہزاد: ۱۵۲
عطا اللہ جنون، مولانا: ۱۹۷	غلام جیلانی اصغر، پروفیسر: ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۲۱۰
عطا اللہ شاہ بخاری، سید: ۱۰۴، ۱۲۳	غلام جیلانی باصر: ۱۰۲
عطا بدایونی، عطا الرحمن: ۱۸۲	غلام حسین: ۹۹
عطا بلوچ، عطا محمد خان: ۷۲	غلام حسین اظہر، ڈاکٹر: ۲۰۳
عطا محمد: ۱۶۷	غلام حسین عادل: ۲۱۰
عطا محمد قاضی: ۱۰۸	غلام حسین قیصر: ۶۲، ۲۱۰، ۳۰۶
عطا محمد، رسالدار: ۳۱۷	غلام حیدر: ۲۱
علاؤ الدین صابر کلپروی، مخدوم حضرت: ۲۸۰	غلام رسول مہر: ۲۶۵
علی انور، ملک: ۹۲	غلام سدید الدین، حضرت: ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳
علی حسین شیفتہ: ۳۴۲، ۳۴۳	غلام سرور نعیمی، حکیم: ۱۲۶

فتح بی بی: ۴۹	غلام قادر چشتی بھیروی (عبدالقادر): ۲۱، ۱۱
فتح محمد: ۳۰۰	غلام قادر گرامی: ۸۷
فخر الدین سیالوی، حضرت خواجہ: ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸	غلام محمد: ۳۵۱
فراق کنگروی، طفیل محمد خان: ۷۳، ۷۴	غلام محمد، شہزادہ: ۵۷
فرزند علی، سید: ۲۲۶	غلام محمد، مولوی: ۳۹
فرید گنج شکر، حضرت بابا: ۹	غلام محمد بگوی: مولانا: ۳۹
فضل احمد چودھری: ۱۹۰	غلام محمد جلیپانوی، مولوی: ۱۱۹
فضل الرحمن بگل، میاں: ۹۷، ۹۸	غلام محمد شاہ، سید: ۴۹
فضل الہی، چودھری: ۷۲	غلام محی الدین: ۲۱
فضل الہی قریشی بھیروی، مولوی: ۵۳	غلام محی الدین، مولوی حکیم: ۳۵
فضل حسین فضل، پیر: ۲۱۰	غلام محی الدین قصوری، حضرت خواجہ: ۲۷
فضل کریم گوندل، حافظ: ۱۱، ۵۳، ۵۴	غلام معین الدین نظامی: ۳۱۲، ۳۶۴
فقیر محمد، صوتی: ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۸۲	غلام نبی: ۱۵۸
ف م ماجد: ۳۲۲	غلام نبی اعوان: ۱۰۱
فیاض احمد خان: ۱۳۲	غلام نبی الہی، حضرت حافظ: ۲۶، ۲۷
فیاض احمد فیضی: ۲۶۲	غلام نظام الدین معظمی، حضرت: ۳۱۱، ۳۱۳
فیض لدھیانوی: ۲۱۰	غوث محمد، ملک: ۳۲
ق	ف
قائد اعظم: ۳۲، ۳۵، ۵۸، ۱۸۲، ۱۸۸، ۲۱۵	فاضل شاہ پوری: ۱۳
قطب شاہ، حضرت: ۲۵۰	فانی مراد آبادی: ۹۰

گل محمد، سید: ۲۱۹	قمر اجتالوی: ۹۷
ل	قمر الدین سیالوی، حضرت خواجہ: ۳۱۳، ۱۱۷
لطیف احمد انیس، خان بہادر خواجہ: ۱۸۰، ۱۷۹	قمر جازی: ۱۹۶
م	قمر عینی: ۳۲۹، ۳۲۸
مامول انور، مرزا: ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۲۱۰، ۲۹۸	قمر لدھیانوی: ۲۱۰
مبارز خان، ملک: ۹۲	قیصر بارہوی: ۲۶۷
مبارک علی شاہ، حضرت سید: ۳۷۴	ک
مجیب الرحمان، قاضی: ۱۸۳	کالے خان: ۶۹
مجید افضل پراچہ: ۲۳۳، ۲۳۵	کالے خان: ۳۵۴
مجید امجد: ۲۶۹، ۲۰۰	کثیر ساجد: ۱۹
محدثہ خاتون: ۲۸۲	کرشن کپور، سری: ۱۹۷
محسن احسان: ۲۱۰	کرم الہی: ۳۰
محسن عباس: ۳۰۱، ۲۹۳	کرم حیدری: ۱۳۶
محمدر لکھنوی: ۵۰	کریم بخش، حافظ: ۱۱۷
محمد اسلم، پروفیسر: ۲۱	کفایت اللہ، مولانا مفتی: ۲۱۹
محمد افضل بکھروی: ۱۴	کنول فیروز: ۲۱۰
محمد افضل شاہ بخاری: ۱۴	کنہیالال: ۱۴۶
محمد افضل ملک: ۳۱۸، ۳۱۷	کے ایم عارف: ۳۱۷
محمد اقبال، علامہ ڈاکٹر: ۷۹، ۱۰۹، ۱۱۴، ۱۴۰، ۱۴۵	گ
۲۱۵، ۱۸۸، ۱۸۴، ۱۷۲	گلزار حسین شاہ صابر، صاحبزادہ: ۲۸۱، ۲۸۰

- محمد حسین جامی: ۳۲۲، ۳۲۵
محمد حسین شوق: ۶۷، ۶۸، ۲۱۰
محمد حسین قریشی، حافظ: ۲۱۹
محمد حسین نیلوی: ۱۶، ۲۱۹، ۲۲۲
محمد حنیف، خواجہ: ۲۱۰
محمد خان جونجو: ۳۷۴
محمد خان، ملک: ۱۵۹
محمد دین، حافظ: ۳۱۹
محمد ذاکر بگوی، مولانا: ۳۵، ۳۶، ۶۰
محمد رمضان، حاجی حافظ خطیب: ۸۸
محمد زبیر نسیم، مولانا: ۱۲، ۱۳۲
محمد سرور خان اعوان: ۲۲
محمد سعید: ۲۳۷
محمد سعید المعروف ڈورا حکیم: ۵۲
محمد سعید زین پوری، مولانا: ۱۱، ۳۵، ۳۶، ۳۸
محمد سعید مرزا: ۲۸۱، ۲۹۲
محمد شاہ جہلمی، مولانا سید: ۲۱۹
محمد شریف قیصر، ڈاکٹر: ۱۱، ۱۱۲، ۳۰۷
محمد شفیع، خواجہ: ۱۱۷
محمد شفیع، سر: ۲۲
- محمد اقبال جاوید، پروفیسر: ۲۵
محمد اقبال قریشی: ۱۷، ۱۹
محمد اکرم بھٹی، میاں: ۲۳۳
محمد الدین سفر: ۱۳
محمد الدین، شیخ: ۱۶۹
محمد اللہ یار: ۳۵۲
محمد امین، قاضی: ۵۱
محمد امین، مولوی: ۱۱، ۳۲، ۳۳، ۳۵۱
محمد امین گوندل: ۵۳
محمد نواز، میاں: ۲۱۰
محمد بخش: ۱۵۰
محمد بخش، حافظ: ۱۸۶
محمد برکت علی لدھیانوی، ابوانیس صوفی: ۲۷۶
محمد بلال: ۱۹
محمد جہانگیر خان جوئیہ: ۳۲۲
محمد حامد تونسوی، حضرت خواجہ: ۱۱۷
محمد حسن عسکری: ۱۵۰
محمد حسن واسطی، سید: ۲۲۱
محمد حسین: ۲۷۵
محمد حسین احمد آبادی، مولوی: ۲۹

محمد نذیر: ۳۶۰	محمد شفیع، مولانا مفتی: ۵۷، ۵۱، ۱۱
محمد نذیر حسین، مولانا: ۴۱	محمد شفیع صابر: ۱۴۳
محمد نذیر شیرزادہ: ۲۳۷، ۲۳۶	محمد صادق، ڈاکٹر: ۱۴
محمد نعیم اختر: ۱۹	محمد صالح، مولانا: ۵۲
محمد نواز نسیم: ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴	محمد صدیق: ۲۱۲
محمد نوشہ گنج: ۱۰	محمد صدیقی سیٹھی، خواجہ: ۱۳۸
محمد یار خلیق: ۲۵، ۱۳	محمد صدیق مرزا: ۲۹۱
محمد یحییٰ، مولانا: ۶۷	محمد صفدر خان: ۳۰۶، ۳۰۵، ۷۰
محمد یحییٰ خان، جنرل: ۳۲۶	محمد طفیل: ۱۵۲
محمد یعقوب حفیظ، راجہ: ۱۴۲	محمد طفیل، پروفیسر: ۳۳۶
محمد یوسف سدیدی: ۳۱۳، ۳۱۲	محمد ظفر اقبال: ۲۹۵
محمود اسیر: ۱۹، ۷۳، ۸۱، ۱۳۰، ۱۶۸، ۱۷۸، ۱۸۴	محمد ظہیر بدر: ۲۵۲، ۳۲
۲۷۱، ۲۳۵، ۱۸۹	محمد عارف، ملک: ۲۵۱
محمود سرحدی، مرزا: ۱۴۰، ۲۱۰	محمد عبداللہ، صاحبزادہ حافظ: ۱۲
محمود غزنوی، سلطان: ۱۰	محمد فاضل، مفتی: ۱۱۲
محمود مجیب اصغر: ۹۸	محمد فاضل نقوی: ۲۸۳
محمودہ سوز: ۲۱۰	محمد کندلان: ۲۵۰
محمی الدین قادری، سید: ۱۳۳	محمد معظم الدین، حضرت خواجہ: ۳۱۳، ۳۱۲
مرزا علی جوش: ۱۴	محمد منور مرزا: ۲۱۷، ۲۱۵، ۲۱۳
مسعود زاہدی، سید: ۲۴۱	محمد منیر احمد سلیم، ڈاکٹر: ۱۹، ۵۷، ۲۱۷، ۲۶۴

ملازم حسین اصغر: ۱۳	مسعود ہاشمی: ۲۰۶
ممتاز احمد کابلوی: ۲۳۰	مشاق احمد: ۳۷۳، ۳۷۴
ممتاز بیگم ممتاز: ۱۳	مشاق احمد آبادی: ۲۱۰
ممتاز حسن: ۹۰	مشفق خواجہ: ۲۰۴
ممتاز محمد خان، ملک: ۹۱، ۹۲	مصطفیٰ صادق: ۲۱۰
ممتاز مفتی: ۱۹۷	مضطر دھریوی، کریم بخش: ۱۰۰، ۱۵۶، ۲۱۰
مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر: ۲۰۳	مظفر اے غفار: ۲۰۲
منشاپانی پتی: ۲۵۶	مظفر حسن منصور: ۲۱۰
منصورہ احمد: ۱۵۲	مظفر وارثی: ۲۱۰
منظور احمد منظور: ۲۱۰	مظہر جعفری: ۳۱۵
منظور احمد منظور، ڈاکٹر: ۱۲، ۳۰	مظہر گیلانی: ۱۳۳
منور سلطانہ لکھنوی: ۲۱۰	معراج الدین معراج: ۱۵
منی بیگم: ۹۷	معرفت ہمدانی، سید ادریس احمد شاہ: ۳۶۶، منی بیگم: ۹۷
منیر ایاز: ۳۶۰	۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹
مولا بخش کشتہ: ۲۶، ۳۰	معروف چشتی قاردی، حضرت مخدوم شاہ: ۱۰
مولا بخش گوندل: ۳۶۳	معین الدین اجمیری، مولانا: ۱۱۷
مولا بخش واصف، مولوی: ۶۳	معین الدین چشتی اجمیری، حضرت خواجہ: ۱۱۹
مولارام، چوہدری: ۷۴	معین الدین عقیل، ڈاکٹر: ۱۷
مہدی مدنی، سید: ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸	مقبول حسن مرزا: ۱۱۳
مہر علی شاہ گولڑوی، حضرت پیر: ۱۸۶	مقصود احمد راہی: ۳۵۵، ۳۵۶
میاں محمد جان: ۸۷	مقصود وارثی: ۱۱، ۵۵

- میاں محمد نقوی: ۲۸۳
میر تقی میر: ۳۲۵
- ن
- نصیر ملک: ۲۰۲
نظام الدین اولیاء، حضرت خواجہ: ۲۵۲
نعیم ساگر: ۳۲۰
نفس خلیلی: ۱۷۰
نگہت پروین رعنا: ۲۱۰
نذکشور و کرم: ۳۲۸، ۲۹۵، ۱۵۲
نواب علی مخمور: ۲۵۹
نوازش گیلانی: ۲۶
نور احمد میرٹھی: ۹۰
نور الدین، مولوی: ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۱۱
نور محمد، ابو ظفر حکیم حاجی: ۱۲۰، ۱۱۹
نور محمد، مولانا حاجی: ۴۱
نور محمد جرال: ۱۱۷
نیاز فتح پوری: ۱۳۹، ۱۳۴
و
واحد حسین نشان، سید: ۱۹۵، ۱۹۳
وارث علی شاہ، حاجی: ۶۲
واصف علی واصف: ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۲، ۲۵۱، ۲۵۰، ۳۲
وحشت کلکتوی: ۶۶
وزیر آغا: ۲۰۵، ۲۰۴، ۲۰۳، ۲۰۲، ۱۹۹، ۱۷۰، ۱۰۰
۲۳۰، ۲۳۵، ۲۱۰، ۲۰۶
- ناسک امرتسری، غلام نبی میر: ۱۰۵، ۱۰۳
ناصر رانا، ڈاکٹر: ۲۰
ناصر عباس نیر: ۲۰۳
ناہید قاسمی، ڈاکٹر: ۱۵۲
نبی احمد ضیا: ۱۳
نتھن شیخ: ۲۵۹
نجم السحر، محترمہ: ۲۱۰
نجم منصور: ۱۷۱
نجمہ یاسین یوسف: ۱۸۲
ندیم حیدر بلوچ: ۳۳۲، ۳۳۱
ندیم حسین شاہ، سید: ۳۲۶
نذیر احمد چودھری: ۱۹۱، ۱۹۰
نذیر اے قمر: ۳۶۷
نذیر علی شاہ، سید: ۲۸۳
نسیم الدین انصاری: ۳۷۰، ۳۵۷
نسیم سید: ۲۱۰
نصرت چوہدری: ۲۵۸، ۲۵۷، ۲۵۶، ۷۵
نصرت فتح علی خان: ۲۷۶
نصیر الدین بگوی، مولانا: ۶۰، ۳۰، ۲۷

ہاشم الدین مرزا: ۲۱۴

وزیر شیرازی، سید: ۸۳، ۱۰۷

ی

وزیر محمد: ۲۶۶

یوسف آزاد، حافظ: ۸۳، ۹۳، ۹۵، ۹۷، ۲۱۰، ۳۵۵

وزیر محمد: ۳۲۸

یوسف جبریل، علامہ: ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۸۶

وسعت علی خان: ۱۹۹

۲۵۳، ۱۸۶

وسیم حیدر شاہ، خان بہادر: ۱۵۰

یوسف خالد: ۲۷۱

ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت شاہ: ۴۴

یوسف خورشید: ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵

ولی محمد انھی شریف: ۲۱۹

یوسف شیدائی: ۳۴۲

بارون الرشید تبسم، پروفیسر، ڈاکٹر: ۱۹، ۵۶، ۲۰۳، ۲۲۹، یونس حسین جھجھروی: ۸۵

۳۵۶، ۳۴۴، ۲۹۱، ۲۷۷، ۵۷۵، ۲۴۷، ۲۴۲، ۲۴۰، ۲۳۱

☆☆☆



Sargodha ka Dabistan-e-Shairi
Vol-I

سرگودھا کا دبستانِ شاعری
(جلد اول)

Shakir Kandan

